انہونی
محی الدین نواب

انہونی

یہ جہان فانی ہونی اور انہونی سچائیوں پر قائم ہے۔
انسان جو سوچتا ہے، وہ نہیں ہوتا اور جو بات وہم گمان میں بھی نہیں ہوتی، وہ پلک جھپکتے ہو جاتی ہے۔ ایک ایسے نجومی کی کہانی جو ہمیشہ دوسرون کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھتا رہا تھا، جب اس نے اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں تو.....
گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے بیچ دوڑتی الجھتی کہانی۔

ہال روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ قیمتی فانوسوں اور نت نئے ڈیزائن کی لائٹوں میں کتنے ہی کھلکھلاتے چہرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ رنگ برنگے لباسوں کی قوس و قزح ماحول کو رنگین اور خوش نما بنا رہی تھی۔ کچھ مرد حضرات دو دو' چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے۔ آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے اور خاندان کے چند بزرگ صوفوں پر بیٹھے گفتگو کے ساتھ کچھ کھا پی رہے تھے لیکن وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے پروا قالین پر پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے پاس ہی پُرانا سا بریف کیس رکھا تھا۔ جس پر علم نجوم اور زائچے بنانے سے متعلق چند کتابیں تھیں۔ وہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں کو ہاتھ کی لکیر کا فقیر بناتا تھا۔ اتنے اچھے انداز میں بولتا تھا کہ گاہک کو اپنی زندگی دور تک سبز باغ دکھائی دیتی تھی۔

ایک ملازم اس کے پاس آیا' جھک کر اپنا منہ اس کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی میں بولنے لگا۔ "چھوٹے صاحب کہہ رہے ہیں۔ فقیروں کی طرح نیچے کیوں بیٹھے ہو۔ یہاں سے اُٹھ کر کسی صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

اس نے سر اُٹھا کر پوچھا۔ "کیا زمین پر بیٹھنا جرم ہے؟"

"چھوٹے صاحب کی توہین ہو رہی ہے۔ آخر تم ان کے مہمان ہو۔"

اس نے سامنے کی جانب دیکھا۔ دور بیرونی دروازے کے پاس چھوٹے صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ اسے ایک ٹک گھور رہے تھے۔ جیسے کچا چبانے کا ارادہ ہو۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ملازم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کی ہتھیلی کو غور سے دیکھنے لگا۔ ملازم نے کن انکھیوں سے چھوٹے صاحب کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ .... یہ تم کیا کر رہے ہو؟ چھوٹے صاحب اِدھر ہی دیکھ رہے ہیں۔"

اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تُو بہت ذہین ہے۔ عقل مندی تیرے اندر کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ تیری لکیریں بتاتی ہیں تُو تعلیم یافتہ بھی ہے۔"

ملازم نے چونک کر دیکھا کیونکہ وہاں یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی کہ وہ گریجویٹ ہے ورنہ شاید یہ ملازمت بھی نہیں ملتی۔

نجومی نے اپنی باتیں جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کر، تیری آزمائش کا دور آج رات بارہ بجے ختم ہو جائے گا۔ سال کے بدلتے ہی تیری قسمت بھی بدل جائے گی۔ تُو ملازم سوئے گا ضرور مگر اٹھے گا تو یہ ملازمت نہیں رہے گی۔"

"تت .... تم جھوٹ بولتے ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ ملازمت بڑی مشکلوں سے یہاں کے ڈرائیور کی سفارش پر ملی ہے۔ بھلا اتنی جلدی ...."

"گھبرا نہیں، تجھے اس ملازمت سے کوئی نہیں نکالے گا بلکہ تُو خود ہی چھوڑ دے گا۔"

اس کے چہرے پر ایک دم سے تازگی آگئی۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اس سے اچھی ملازمت مل جائے گی۔"

پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ارے ہاں! یاد آیا، ابھی گھنٹا بھر پہلے سیٹھ اکمل کہہ رہے تھے، میں بہت پھرتیلا ہوں۔ بجلی کی سی تیزی سے کام کرتا ہوں۔ اگر میں ان کے پاس آجاؤں تو وہ مجھے دو ہزار روپے تنخواہ دیں گے۔ یہاں سے پورے پانچ سو روپے زیادہ۔"

نجومی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تُو نے کبھی اپنا ہاتھ کسی دست شناس کو نہیں دکھایا ورنہ ایسی باتیں نہ کرتا۔ میرا علم کہہ رہا ہے کہ تُو رات کو غریب سوئے گا مگر صبح جاگے گا تو امیر ہو چکا ہو گا۔ تُو لاکھوں کا مالک بن چکا ہو گا پھر بھلا ملازمت کی کیا ضرورت ہو گی؟"

ملازم غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہ ہاتھ کی لکیریں نہیں بول رہیں بلکہ وہ اس کے حالات پہلے سے جانتا ہے کہ جب اس کے والد کی وفات ہوئی اس وقت وہ گاؤں سے دور ہاسٹل میں رہ کر میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ جن دنوں وہ گھر سے دور تھا انہی دنوں اس کے چاچا نے گاؤں کے پٹواری سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ اس کی تمام زمینیں اور مکان اپنے نام کروا لیے تھے۔ وہ ماں اور ایک جوان بہن کے ساتھ بے آسرا ہو گیا تھا پھر انہیں لے کر شہر آگیا تھا۔ یہاں ملازمت کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں، بڑی مشکلوں کے بعد ایک برتن فیکٹری میں روزانہ بیس روپے پر ملازم ہو گیا۔ ان پیسوں سے گزارہ ناممکن تھا اس لئے اس ملازمت کے ساتھ کوئی دوسری اچھی سی مناسب ملازمت بھی ڈھونڈنے لگا اور اس تلاش میں دو برس گزر گئے تھے پھر ایک دن اس کوٹھی کے ڈرائیور سے سلام دعا ہوئی اور دھیرے دھیرے اس سلام دعا نے سفارش کی صورت اختیار کر لی اور اس ڈرائیور نے اسے اپنے ہی صاحب کے پاس

ملازمت دلوا دی تھی۔

وہ نجومی کی آواز پر چونک گیا۔ "کیا سوچنے لگا ہے؟ بس اتنا سمجھ لے، تیری راہ کا کانٹا صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی نکل جائے گا۔"

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کیا چاچا! آج رات مر جائے گا؟"

نجومی کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔ جو اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔

ملازم کے اندر عجیب سی خوشی کی لہر سرایت کر گئی جس نے اس کے لہجے میں بھی مٹھاس بھر دی۔ وہ فوراً تم سے آپ پر آگیا۔ "حضور! آپ تو بہت پہنچے ہوئے لگتے ہیں۔ اندر باہر، ماضی اور مستقبل سب جانتے ہیں۔ اب تو مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ نیچے بیٹھیں۔ برائے مہربانی آپ صوفے پر تشریف رکھیں۔ ورنہ صاحب بھی غصہ ہوں گے کہ میں نے آپ کو........."

نجومی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں تیرے صاحب کا مہمان ہوں۔ ان سے جا کر کہہ دے کہ غلام نہیں ہوں۔ جس طرح دوسرے مہمان اپنی مرضی سے بیٹھے اور کھڑے ہیں، میں بھی اپنی مرضی سے یہاں بیٹھوں گا۔ اگر انہیں پسند نہیں ہے تو یہاں سے اسی وقت چلا جاؤں گا۔"

اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا سیٹھ سلطان افضل اسے کسی صورت وہاں سے جانے نہیں دے گا۔ وہ اسے جس مقصد کے لیے لایا ہے اسے پورا کرنا ضروری تھا۔

وہ اپنے آپ ہی مسکرانے لگا کیونکہ اس کی نگاہوں کے سامنے سیٹھ سلطان کی لکیریں بول رہی تھیں۔ وہ عاشق مزاج ہونے کے ساتھ شکی مزاجی بھی تھا جس محبوبہ پر اس کا دل مچلنے لگا تھا وہ اس کی اونچی سوسائٹی سے بہت نیچے تھی لیکن بہت ہی حسین اور شوخ و چنچل تھی۔ پہلی ہی نظر میں سامنے والے کو زخمی کر دیتی تھی اور زخم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ سیٹھ سلطان کے لیے مہنگی پڑ رہی تھی۔ ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ شادی کی شرط پیش کرتی تھی لیکن اسے شبہ تھا کہ وہ وفادار نہیں رہے گی۔ وہ دوسروں سے بھی ملتی ہے اور ہنستی بولتی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ سب کو ٹھینگا نہ دکھاتی ہو، کسی ٹھینگے والے کے بس میں ہو۔

مردوں کی عجیب فطرت ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی عورت کی قربت میں جانے سے پہلے یہ نہیں سوچتا کہ وہ پہلے بھی کئی عورتوں کی تنہائی میں جا چکا ہے لیکن جہاں کسی عورت کے آنے کی بات ہوتی ہے چھان بین شروع کر دیتا ہے۔ سیٹھ سلطان یہ بات اس حسینہ سے

نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ بدک سکتی تھی، اسے ٹھکرا کر کسی اور رئیس زادے کے پاس جاسکتی تھی۔ اس لیے وہ نجومی سے مدد لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکیروں سے اس کے کردار کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

نجومی نے بیرونی دروازے کی جانب دیکھا جو ملازم اس کے پاس سے اُٹھ کر گیا تھا۔ وہ سلطان سے بات کر کے واپس آرہا تھا۔ اس نے قریب آکر بڑے احترام سے جھک کر کہا۔ "حضور! چھوٹے صاحب آپ کو باہر لان میں بلا رہے ہیں۔ آپ جا کر ان کی باتیں سن لیں۔ جب تک میں یہاں آپ کے بیٹھنے کا بہترین انتظام کر دیتا ہوں۔"

پھر ملازم نے اسے کھڑے ہونے کے لیے احتراماً اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔

جب وہ باغیچے میں پہنچا، سیٹھ سلطان افضل پہلے سے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں بڑا سا سگار تھا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی گہرا کش لے کر منہ کا دھواں فضا میں بکھیر دیا اور گرج دار لہجے میں کہا۔ "آؤ محترم احمد شاہ صاحب کیا قیمتی چیزوں کے بیچ پہنچتے ہی تمہارا دماغ ساتویں آسمان پر اُڑنے لگتا ہے؟ کیا پٹی پڑھا رہے تھے اس دو ٹکے کے ملازم کو........."

احمد شاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کسی کو دو ٹکے یا لاکھوں کا کہیں۔ کون شاہ ہے اور کون فقیر اگر یہ انسان کو معلوم ہو جائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔ آپ جس ملازم کو دو ٹکے کا کہہ رہے ہیں، وہ کل صبح تک لاکھوں کا مالک ہو گا۔"

سیٹھ سلطان نے گھور کر دیکھا۔ احمد شاہ ایک قدم آگے بڑھ کر ذرا سا جھک کر بولا۔ "میں نے ابھی ابھی اس کا ہاتھ دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے، آپ میرے علم سے انکار نہیں کر سکتے، جو کہتا ہوں وہ ہوتا ہے۔ یاد ہے پچھلے مہینے سے آپ جس گھوڑے پر رقم لگا رہے ہیں، وہ جیت رہا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ پھر رُک گیا۔ سلطان کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر سے غصے کی شکنیں مٹنے لگی تھیں۔ جیسے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف شکنیں دور کر رہا ہو۔ احمد شاہ نے مسکراتے ہوئے مزید کہا۔ "سلطان صاحب! یقیناً آپ کو یہ بات بھی یاد ہو گی کہ اس سال آپ مٹی میں ہاتھ ڈالیں گے تو وہ سونا بن جائے گی اور جس سونے میں کھوٹ ہو گا وہ آپ کے ہاتھ نہیں.........."

"اچھا اچھا۔ اپنے بارے میں زیادہ باور نہ کراؤ اگر تمہاری صلاحیتوں اور تمہارے علم کا قائل نہ ہوتا تو اس وقت تم یہاں نظر نہیں آرہے ہوتے اور نہ ہی اپنے سے زیادہ

اونچی باتیں کرتے۔"

احمد شاہ نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اب وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ نے مجھے یہاں.......... میرا مطلب ہے تنہائی میں بلایا ہے۔"

اس نے سگار کا ایک کش لیا پھر کہا۔ "تمہیں خاص کر جس کا ہاتھ دیکھنے کے لئے بلایا ہے اس کی پہچان بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے صبح سے دیکھا نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ کس لباس میں قیامت ڈھانے اچانک آجائے گی لیکن اس کی واضح پہچان دائیں رخسار پر سیاہ تل ہے۔ جسے وہ میک اپ کے وقت مزید گہرا سیاہ کر لیتی ہے اور دور سے ہی پہچانی جاتی ہے۔"

"جی بہتر اور کچھ؟"

"تم صرف اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنا۔ کچھ پوچھے تو نہ بتانا۔ زور دے تو بات گول مول کر دینا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ اس بات کا فن مجھے آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا راز اس پر نہیں آپ پر کھلے گا۔"

"میں رات تمام مہمانوں کو رخصت کر کے آؤں گا۔ دیر ہو جائے تو سونا مت مجھے جاگتی آنکھوں اور جاگتے ذہن سے اس کی ایک ایک خوبی اور خامی بتانا۔ اس کا سچ اور جھوٹ دودھ اور پانی کی طرح الگ الگ عیاں کر دینا اور باقی کی رقم بھی اسی وقت لے لینا۔"

"اس کا مطلب ہے اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا سسٹم اپنائیں گے۔"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر کچھ سوچ کر جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار روپے پکڑاتے ہوئے بولا۔ "اب اندر آجاؤ۔ میں اپنی بہن کو ہاتھ دکھانے کے لیے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ جس کی آج منگنی ہے۔ اس کے ساتھ میری چند کزن بھی ہیں اور وہ بھی ہے، یعنی ساحرہ۔"

"ساحرہ۔" احمد شاہ نے نام دُہرایا پھر مسکراتا ہوا پلٹ گیا۔ اندر کی جانب چل پڑا۔

وہ واپس اندر آیا تو بڑے سے قالین کے ایک سرے پر اس کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ فوم کے ایک چھوٹے سے گدے پر سفید چادر بچھا کر دو گاؤ تکیے رکھ دیئے گئے تھے۔ جیسے وہ دست شناس نہ ہو بلکہ کوئی پہنچا ہوا پیر ہو یا اس جگہ بیٹھ کر کوئی درس دینے والا ہو۔

ملازم نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آیئے حضور! تشریف رکھیے۔"

اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا پھر بیٹھ گیا۔ ملازم نے جلدی سے ایک گاؤ تکیہ اس کے دائیں ہاتھ کے پاس کر دیا تاکہ وہ کہنی ٹیک کر آرام سے بیٹھ سکے۔

احمد شاہ نے اپنا بریف کیس کھول کر ایک رف پیڈ اور چند کتابیں نکال کر رکھ لیں جو لکیریں دیکھنے اور زائچہ بنانے میں اس کی مددگار تھیں۔

ہال کے اندر ہی سے ایک زینہ بالائی منزل کی طرف جارہا تھا۔ نجومی احمد شاہ کی نظریں بھی زینے سے ہوتی ہوئی بالائی منزل پر پہنچ گئیں۔ سامنے ہی ایک دروازہ تھا۔ وہ کھل گیا اس کی چوکھٹ سے تین چار لڑکیاں باہر آئیں پھر ایک خاتون کے ساتھ سفید لباس میں ملبوس ایک حسین چہرہ نمودار ہوا۔ وہ دیکھنے میں کسی پری سے کم نہیں تھی۔ احمد شاہ کی زبان پر بے ساختہ سبحان اللہ کے کلمات آ گئے۔

ایک بار سبحان اللہ کلمہ ادا کرنے کے بعد احمد شاہ کی زبان پر دوسری بار وہی کلمہ آ گیا کیونکہ اس کے بعد نظر آنے والا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ حسین اور پُرکشش تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر سیاہ تل نے اُسے مزید حسین بنا دیا تھا۔ سلطان کے کہنے کے مطابق وہ واقعی لاکھوں میں پہچانی جا سکتی تھی۔

وہ سب دھیرے دھیرے نیچے آنے لگیں۔ احمد شاہ بھی خوبرو نوجوان تھا۔ نوجوانی میں خود کو عالم تسلیم کرانا مشکل ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات میں کوئی اسے باکمال نجومی نہیں سمجھتا تھا اس لیے وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کیے رکھتا تھا کیونکہ سنجیدگی سے بلوغت ظاہر ہوتی ہے۔

لڑکیاں ایک بزرگ خاتون کے ساتھ آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ خاتون نے کہا۔ "جناب شاہ صاحب! میرے بیٹے افضل نے آپ کی بڑی تعریفیں کی ہیں.......... آپ سے ملنے کا اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ دراصل میں اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ یوں بھی آج میری بیٹی کی رسم منگنی ہے۔"

احمد شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحبہ! کسی کی بھی زندگی بند مٹھی کی طرح ہوتی ہے۔ میرا ایک اصول ہے کہ میں ہاتھ دکھانے والے سے صاف صاف واضح لفظوں میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس بند مٹھی کو بند ہی رہنے دیں۔ جو قسمت اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے اس طرح زندگی کی تبدیلیوں کو آنے اور جانے دیں۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ یہ انسانی نفسیات سے کھیلنے کا احمد شاہ کا اپنا ایک

انداز تھا۔ وہ جانتا تھا' اس طرح تجسس کی آگ مزید بھڑک جاتی ہے۔ آدمی اپنے بارے میں جاننے کے لیے بضد ہو جاتا ہے۔

اس کی خاموشی کے دوران دونوں بیٹی' ماں میں کھسر پھسر ہوتی رہی پھر خاتون نے کہا۔ "شاہ صاحب! میری بیٹی طاہرہ کے ساتھ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کے مدِ نظر آگاہی حاصل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر اس کا ہاتھ پکڑ لیں۔"

"جی!" احمد شاہ ایک دم سے ایسے چونک گیا جیسے خاتون بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کے لیے دے رہی ہوں پھر وہ بولا۔ "پلیز! آپ ان لڑکیوں کو سامنے صوفے پر بھیج دیں تاکہ میں طاہرہ کے بارے میں جو کچھ بتاؤں وہ آپ کے اور میرے بیچ راز کی طرح رہے۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "شاہ صاحب! ہم بھی آپ کو اپنا ہاتھ دکھانا چاہتے ہیں اس لئے.........."

احمد شاہ نے ایک دم سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ مجھے یہاں بہت سے ہاتھ دیکھنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ میں ہر ایک کو باری باری اپنے پاس بلا کر اس کے بارے میں بتادوں گا۔ بے فکر ہو کر سامنے جا کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ اُٹھ کر ذرا دور صوفوں کی طرف چلی گئیں۔ احمد شاہ نے طاہرہ کی نرم ہتھیلی اپنے ہاتھ میں تھام لی اور ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کسی بھی انسان کا ہاتھ صرف لکیروں سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ ہاتھ کی جلد کی ملائمت یا سختی اور حرارت بھی بہت کچھ ظاہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انگلیوں کی لوچ' ان کی بناوٹ اور ناخنوں کی شکل بھی انسانی کردار کا پتا دیتی ہیں۔ ایک اچھا نجومی ہاتھ کی لکیروں انگلیوں کی پوروں اور ہتھیلی کے اُبھار قمر' اُبھارِ زہرہ مریخ بالا اور زیریں کے بارے میں بھی معلومات رکھتا ہے۔

احمد شاہ نے عدسے کی مدد سے ہلکی لکیروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا پھر کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کی بیٹی کی یقیناً یہ تیسری منگنی ہے۔"

دونوں ماں بیٹی نے چونک کر دیکھا۔ احمد شاہ نے کہا۔ "حیران نہ ہوں' ان کے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ ان کی پہلی منگنی غالباً بچپن میں ہوئی تھی یہی کوئی چھ سات برس کی عمر میں پھر دوسری چند ہی ماہ پہلے۔"

خاتون نے کہا۔ "جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے دوسری منگنی توڑ کر بیٹی کے حق میں بہتر نہیں کیا۔"

احمد شاہ کی یہ بات تیر کی طرح طاہرہ کے دل پر لگی کیونکہ دوسری منگنی وہ بھی ختم

کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خان علی اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔

خاتون نے کہا۔ "دوسرا رشتہ توڑنے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ وہ لڑکا خان علی شراب پیتا تھا' جُوا کھیلتا تھا' اکلوتا تھا اس لئے ماں باپ کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔ مجھے خوف پیدا ہو گیا تھا کہ اگر میں نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی تو وہ اس کے جہیز کو بھی جُوئے اور شراب کی نذر کر دے گا۔"

وہ سوچنے لگا۔ ایک ماں کتنی آسانی سے ایک ہونے والے داماد کی خرابیاں اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج بھانپ گئی۔ جبکہ اس کا اپنا بیٹا اس سے زیادہ گندگی کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔

اُس نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کی بیٹی میں کسی کو بدل دینے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے اگر یہ رشتہ ہو جاتا تو یہ خان علی کو بدل کر رکھ دیتی۔ وہ اسے مہارانی کی طرح ہر وقت سیج پر بٹھا کر رکھتا۔"

اس نے توقف کے بعد کہا۔ "خیر.......... موجودہ آنے والا رشتہ بھی بُرا نہیں ہے۔ ابتدائی دنوں میں کچھ مشکلات ہوں گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی بیٹی زیادہ تر سفر میں رہے گی۔ ملک ملک کی سیر کرتی رہے گی۔"

طاہرہ اور اس کی والدہ ایک بار پھر حیرانی سے احمد شاہ کو دیکھنے لگیں کیونکہ انہوں نے اس پر یہ اظہار نہیں کیا تھا کہ موجودہ رشتہ ایک پائلٹ کا ہے جو کہ برطانوی ائرلائن میں ملازم ہے۔

احمد شاہ نے اس کے علاوہ بھی ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ دونوں کا اس پر عقیدہ پختہ ہو گیا۔ اس کے بعد جتنی لڑکیاں آئیں وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں بالآخر اس کے ہاتھ میں وہ ہاتھ آ ہی گیا جس کے لیے وہ اس قیمتی کوٹھی میں بلایا گیا تھا۔ وہ ہاتھ سلطان افضل کی محبوبہ کا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اس کے لیے ہے کیونکہ ہاتھ پکڑتے ہی اس کے اندر کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ جیسے اس نے بجلی کے تاروں کو پکڑ لیا ہو۔

جب بجلی کا تار آدمی کے ہاتھ میں آتا ہے تو وہ ایک جھٹکے سے اس سے چھوٹنے کی' علیحدہ ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن احمد شاہ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی گرمی سے پگھل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈال دیں اور دور تک ڈوبتا چلا گیا۔

ساحرہ ایک درمیانے طبقے کی لڑکی تھی لیکن ہمیشہ اونچے محلوں کے خواب دیکھتی تھی۔ اس کی سگی ماں اور سوتیلا باپ اس کی طبیعت کے مطابق اسے تربیت دے رہے

تھے۔ اسے اونچی سوسائٹی میں لے جاتے تھے۔ امیرزادوں سے گھل مل کر باتیں کرنے کا موقع فراہم کرتے تھے۔ ان کی یہی خواہش تھی کہ کوئی رئیس اعظم ان کی بیٹی کے حسین پھندے میں پھنس جائے اس طرح ان کا مستقبل بھی سنور جائے لیکن ساحرہ کا دل احمد شاہ کو دیکھتے ہی غیر ارادی طور پر دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس کی مردانہ خوبروئی سے مرعوب ہو گئی تھی مگر دل میں "اونہہ" کہہ کر سوچنے لگی' خوبروئی تو صرف چار دن کی ہے۔ دولت آخری سانس تک چلتی رہتی ہے۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن دولت ختم نہیں ہوتی۔ انسان کی آئندہ نسلیں اسی دولت سے فیض یاب ہوتی رہتی ہیں۔ یہ معمولی سڑک چھاپ نجومی میرے سلطان کے پیروں کی دھول ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ خود ہی اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کی خواہش بھی تھی اس لئے ہاتھ چھڑا کر جا نہیں سکتی تھی۔ دھیمے لہجے میں بولی۔ "آ.......... آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

اس حسین پری نے کیا کہا۔ اسے سنائی نہیں دیا۔ اس کے اندر صرف دل کی آواز گونج رہی تھی جو دھڑک دھڑک کر یہی کہہ رہا تھا۔ "شاہ! یہ تیری ہے۔ مرد وہی ہوتا ہے جو ایک بار کسی کا ہاتھ دل سے پکڑ لے تو پھر زندگی بھر نہ چھوڑے۔ تُو بھی اسے نہ چھوڑنا یہ صرف اور صرف تیری ہے۔"

"میرا نام ساحرہ ہے۔"

احمد شاہ کے دل نے کہا۔ "تم ساحرہ' سائرہ یا طاہرہ کوئی بھی ہو پھر بھی میری ہو۔ میں نے تجربہ کار عاشقوں سے سنا ہے کہ سچا اور پکا عشق اسی طرح ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں روح کی گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے۔ خون کی روانی کے ساتھ رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ آنکھیں محبوب کو دیکھنے کے بعد کسی اور طرف دیکھنا بھول جاتی ہیں۔ محبوب کا ہاتھ' ہاتھوں میں آتے ہی زمین جنت بن جاتی ہے کیا تمہیں ایسا محسوس نہیں ہو رہا؟ کیا تم بھی یہی کچھ..........؟"

اس کے اندر کی آواز محبوبہ کے کانوں تک پہنچی تھی یا نہیں لیکن محبوبہ کی رس گھولتی سریلی آواز نے اسے ضرور چونکا دیا۔ "شاہ جی! کیا میرے ہاتھوں کی لکیریں' میری آنکھوں میں دکھائی دے رہی ہیں؟"

اس نے جھینپ کر کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

کوئی دیکھے نہ دیکھے سلطان افضل دور بیٹھا اسے ضرور گھور رہا تھا کہ نجومی اس کی محبوبہ کا ہاتھ پکڑے اتنی دیر سے کیا دیکھ رہا ہے' کیا پڑھ رہا ہے پھر اسے خیال آیا کہ اس نے ہی تاکید کی تھی کہ اس کی چھوٹی بڑی ایک ایک لکیر کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے

بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی معلوم ہو سکے۔ اس کے اندر کا ایک ایک سچ اس کے سامنے آ سکے۔

احمد شاہ نے ساحرہ کا ہاتھ نہیں دیکھا' اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو مٹھی کی شکل میں بند کرتے ہوئے راز داری سے بولا۔ "ہاتھ کی لکیروں میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو صرف تنہائی میں بتائی جاتی ہیں اگر وہ باتیں تنہائی سے نکل آئیں تو.........."

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ساحرہ کے چہرے سے پریشانی کو بھانپنے لگا۔ وہ کبھی اس کی آنکھوں میں جھانکتی تھی پھر نظریں جھکا لیتی تھی۔ بالآخر اس نے اپنے اندر کے اضطراب کو گویائی دی۔ "یہ تو میں نے سنا ہے کہ لکیریں صرف اچھائیاں نہیں بُرائیاں بھی ظاہر کرتی ہیں۔ کیا بُرائیوں کو پوری وضاحت سے بیان بھی کر دیتی ہیں؟"

اس نے اپنی سنجیدگی کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ جیسے بچے کو ہجے کر کے پڑھایا جاتا ہے اسی طرح بُرائیاں بھی پورے ہجے کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ایسا کرو' میں تمہارے گھر آ کر تمہارا ہاتھ تنہائی میں دیکھوں گا۔ تم اپنا پتا لکھوا دو۔ میں کل کسی وقت آ جاؤں گا۔"

ساحرہ نے چہرے پر سامنے لٹکنے والی لٹوں کو درست کیا۔ اس بہانے سلطان افضل کو بھی دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

احمد شاہ جب کسی کا ہاتھ دیکھتا تو صرف ہتھیلی کی لکیریں اور اُبھار ہی نہیں پڑھتا بلکہ اس کے چہرے کی شکنیں اور تاثرات بھی پڑھتا رہتا تھا۔ اس نے ساحرہ کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ "جسے تم دیکھ رہی ہو وہ تمہارے پیروں کی ڈھول بھی نہیں ہے۔"

کہنے کے فوراً بعد اس نے ساحرہ کے چہرے کو دیکھا' وہ اپنے نفسیاتی حربے کی کامیابی اور ناکامی کو اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر ساحرہ کو سلطان کی دولت کے علاوہ بھی اس سے دلچسپی ہے تو چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو جائیں گے۔ دوسری صورت میں وہ چہرہ مسکرانے لگے گا۔

احمد شاہ کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جیت گیا کیونکہ ساحرہ کی گردن غرور سے تن گئی تھی اور ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ سلطان افضل کی طرف دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کہہ رہی ہو۔ "اونہہ' تم کیا چیز ہو۔ مجھ پر تم سے زیادہ امیر کبیر مر مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔"

احمد شاہ نے اپنی کامیابی کو مستحکم کرنے کے لئے دوسرا تیر چھوڑا۔ "جو تمہیں حسرت

بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے ہمیشہ للچائے رکھنے میں ہی تمہاری بہتری ہے ورنہ.........."

ساحرہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ورنہ کیا؟"

"اس کے ہاتھ کی لکیریں میں دیکھ چکا ہوں۔ جس میں دھوکا اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ تمہیں اس وقت تک لارے لپے میں رکھے گا جب تک تمہارا حسن ماند نہیں پڑ جاتا' پھر تمہیں اپنی زندگی سے ایسے نکال پھینکے گا جیسے دودھ میں سے مکھی نکالی جاتی ہے۔"

"میں یہ جانتی ہوں کہ امیر لوگ اکثر ایسا ہی کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہی میں اس کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ اور بینک بیلنس اپنے نام کروا لوں گی تاکہ بقیہ زندگی عیش و عشرت سے گزار سکوں۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ وہ فریبی ہے اور فریب کرنے والے سچ بولنے اور سچ لکھنے کی غلطی نہیں کرتے۔ وہ بظاہر سب کچھ تمہارے حوالے کر دے گا۔ تمہارے نام لکھ دے گا لیکن جب اصلیت سامنے آئے گی تو تمام دستاویزات جعلی ہوں گی۔ ایک دولت مند کو کبھی بے وقوف نہ سمجھو۔" احمد شاہ کی باتوں میں وزن تھا۔ ساحرہ کے چہرے پر پریشانیاں نمایاں ہو گئیں۔ اس نے کہا۔ "زیادہ اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تک سیٹھ سلطان کی لکیریں بول رہی ہیں۔ ابھی تمہاری لکیروں کو مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ پتا نہیں اس بند مٹھی میں کتنی خوشیاں اور کتنے خوابوں کی تعبیریں ہیں۔ یہ تمہیں کل معلوم ہو گا۔"

اس نے زائچے محفوظ کرنے والی کاپی کھولتے ہوئے کہا۔ "اپنا پتا لکھواؤ۔"

وہ دھیمی آواز میں اپنا پتا بتانے لگی۔ ویسے بتانے سے کیا ہوتا ہے؟ بتانے کے باوجود انسان کا پتا نہیں چلتا کہ وہ اوپر سے کیا ہے اور اندر سے کیا؟

☆======☆======☆

آدھی رات گزرنے والی تھی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا تھا ساحرہ اسے جگا دیتی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر اسے اپنے کمرے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ کئی بار اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دروازے کے باہر کھڑی ہے۔ آہستہ آہستہ دستک دے رہی ہے۔ اس نے دو تین بار دروازہ کھول کر بھی دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آ گیا۔ ٹہلتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگا کہ

وہ اس سے کیسی باتیں کرے؟ اس کے گرد کیسا جال بچھائے کہ وہ صرف اور صرف اسی کی ہو کر رہ جائے۔ وہ چھت پر رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس پر جھولتے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ بزرگ کہتے ہیں مرد اور عورت کے جوڑے آسمانوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دونوں زمین پر آ کر جہاں مرضی رہتے ہوں مگر ملاپ کے وقت قدرت خود بخود تمام دوریاں ختم کر دیتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے اور یہ سب انسان کی قسمت میں پہلے سے ہی لکھا ہوتا ہے۔

قسمت کا خیال آتے ہی دل نے کہا۔ "اللہ سے دعا مانگ وہ دعاؤں کا بہتر سننے والا ہے جو چیز مقدر میں نہیں لکھی ہو وہ بھی لکھ دیتا ہے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ اُٹھایا لیکن فوراً ہی نیچے کر لیا۔ اس طرح اس کے ہاتھ کی لکیریں نظر آ جاتیں۔ جن سے وہ ہمیشہ نظریں چُراتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں مانگتا تھا۔ جو مانگتا ہوتا تھا وہ دل ہی دل میں مانگ لیتا تھا۔ اس طرح چہرے کو دھوتے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ کھانا کھاتے وقت ہاتھ آدھی مٹھی کے طور پر بند رہتا تھا۔ نظریں لکیروں پر نہیں لقموں پر ہوتی تھیں۔ لوگ موت سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی ہتھیلیوں سے کتراتا رہتا تھا۔

وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سڑک کی جانب منڈیر کے پاس آیا' دور تک جانے والی سڑک پر دیکھنے لگا۔ گاڑی کی دو لائٹیں تیز رفتاری سے اس کی طرف آ رہی تھیں۔ اس نے طنزیہ لہجے میں خود کلامی کی۔ "لگتا ہے سیٹھ سلطان کے بچے کو بھی میری طرح بے چینی لگی ہے۔ آدھی رات کو اس کے سوا کوئی اس طرف نہیں آ سکتا۔" وہ گاڑی کے پہنچنے سے پہلے ہی نیچے آ گیا۔ دروازے پر دستک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر اس کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس نے اپنی آواز ایسے بنا لی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ "کون ہے .... کون ہے۔ ابھی .... آیا.........."

پھر دروازہ کھولتے ہوئے اسی لہجے میں بولا۔ "او .... آپ ہیں آیئے .... تشریف لایئے۔ میں آپ کا انتظار کرتے کرتے کب سو گیا' پتا ہی نہیں چلا۔"

سلطان افضل نے کہا۔ "میں نے تمہیں سونے سے منع کیا تھا پھر بھی .... خیر جا کر منہ پر پانی مارو اب بھی نیند کا خمار ہو گا۔ ویسے تم نے ساحرہ کے ہاتھوں میں کیا دیکھا؟"

وہ بیسن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے آپ کے لئے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے چہرے کو دکھاوے کے لئے دھونے لگا پھر تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "وہ عجیب لڑکی ہے۔ اپنا ہاتھ دکھانے کے بجائے مجھے ہاتھ نہ دیکھنے کی تبلیغ کرنے لگی۔ کہتی ہے ہاتھ دیکھنا شرک ہے۔ اس طرح آدمی اللہ کے رازوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا دین' ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے مجھے یہ کام چھوڑ کر کوئی اور کام کرنا چاہئے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ میں خود دیکھ رہا تھا کہ تم کافی دیر تک اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھے رہے تھے۔"

"میں نے ہاتھ پکڑا تھا۔ ہاتھ کی لکیریں نہیں دیکھی تھیں۔"

"میں نے اپنے عالیشان بنگلے میں تمہیں بلایا تھا اور ساحرہ کی خاطر بلایا تھا کہ اس کے کردار کے متعلق کچھ بتا سکو۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب تم نے ساحرہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا تو اس کی مٹھی بندھی ہوئی تھی۔ کیا تمہارے خیال میں وہ اپنی اصلیت چھپا رہی ہے؟"

"دنیا میں دو ہی طرح کے لوگ نجومی کے پاس نہیں آتے۔ ایک وہ جو اپنی محنت اور ذہانت سے اپنی تقدیر بناتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنے عیوب چھپاتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ساحرہ مجھ سے اور آپ سے بہت کچھ چھپا رہی ہے۔"

وہ مایوس ہو کر بولا۔ "مجھے پہلے ہی شبہ تھا' وہ بہت گہری ہے اور میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے کی طرح اس سے شادی کر لوں۔"

"پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تم ایک بار اس کے گھر جاؤ اور اسے یقین دلاؤ کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں میرے ذریعے اسے دولت مند بنانے والی ہیں۔ تم اس کی لکیروں کو سچ پڑھو مگر اس سے جھوٹ بول کر تسلی دو۔"

"آپ کافی فیس دیتے ہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں کل ہی اس سے ملنے جاؤں گا۔"

سیٹھ سلطان افضل نے اسے پانچ سو روپے دیئے۔ پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

☆======☆======☆

نجومی کے ہاتھ میں بوسیدہ بریف کیس نہیں تھا' صرف زائچے محفوظ کرنے والی کاپی تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ اس میں ساحرہ کے گھر کا پتا لکھا تھا اور وہی اسے انگلی پکڑائے محبوب کے دروازے تک پہنچا سکتی تھی۔

دستک پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں دست شناس احمد شاہ ہوں' کیا ساحرہ طفیل اسی فلیٹ میں رہتی ہیں؟"

خاتون کے چہرے پر جیسے تازگی آگئی ہو۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹا' اندر آؤ۔ ساحرہ نے تو کل سے تمہاری تعریفیں کرتے کرتے کان پکا دیئے ہیں۔"

اس نے خاتون کے پیچھے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ماں جی! یہ اس کے اندر کی خوبی ہے جو کہ اسے مجھ میں خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ ورنہ میں تو ٹھہرا ایک فٹ پاتھ کا نجومی۔ پانچ' دس روپے میں راہ گیروں کا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والا۔"

خاتون نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم شاید کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو کیونکہ ساحرہ نے مجھے بتایا کہ اس کی ملاقات تم سے سیٹھ سلطان افضل کی کوٹھی پر ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بڑے بڑے گھرانوں میں ہاتھ دیکھنے کے لئے بلائے جاتے ہو۔"

وہ مسکرانے لگا۔ کرسی پر بیٹھ کر فلیٹ کا سرسری جائزہ لینے لگا۔ وہ فلیٹ دو کمروں اور ایک چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل تھا۔ برآمدہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہو رہا تھا کیونکہ وہاں بیٹھنے کے لئے دو کرسیوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا تخت بھی رکھا ہوا تھا جس پر پھولدار چادر بچھی ہوئی تھی۔

تخت کا ایک سرا دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ دوسرا سرا جہاں ختم ہو رہا تھا وہاں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ جس کے اندر سے پانی گرنے کا شور بتا رہا تھا کہ وہ باتھ روم ہے۔ اندر کوئی غسل کر رہا ہے۔ اس سے آگے ہی ایک اور دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا جس سے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچن تھا۔

خاتون نے کہا۔ "بیٹا! بس یہی ہمارا چھوٹا سا غریب خانہ ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ کتنے افراد ہیں؟"

"میری بیٹی اور میرے شوہر شبیر محمد صاحب۔"

"یہ لوگ کہاں ہیں؟"

خاتون نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر لوگ سے مراد میری بیٹی ساحرہ سے ہے تو وہ غسل کر رہی ہے۔"

وہ پھر مسکرانے لگا' خاتون نے کہا۔ "میری بیٹی' میری سہیلی بھی ہے۔ اس لئے ہم میں کافی حد تک بے تکلفی ہے۔ تم اس کا انتظار کرو۔ جب تک میں چولہے پر رکھی ہانڈی

دیکھ لوں ورنہ سالن جل جائے گا۔"

وہ کرسی سے ذرا سا اُٹھا پھر بیٹھ گیا۔ اسی وقت باتھ روم کا بند دروازہ کھل گیا تھا اور وہ دکھائی دینے لگی تھی جس کی خاطر وہ یہاں آیا تھا۔

اس نے دروازے کی چٹخنی کھولنے کے بعد منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ بڑی بے نیازی سے ہاتھ اُٹھا کر بالوں پر لپیٹے ہوئے تولیے کا جوڑا بنا رہی تھی۔ اس نے سبز سنگ مرمر جیسا لباس پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے بھیگے بدن کے ساتھ چپک گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا۔ اس لئے بھی گھور رہا تھا کہ اس کی نظروں کو پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں تھی تو وہ بھی کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔

ساحرہ نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑو اُٹھائی اور فرش پر پھیلا ہوا پانی سمیٹنے لگی۔ سمیٹ کر موری کے قریب کرنے لگی۔ اس کے جھکنے اور اٹھنے' اِدھر اُدھر خم کھانے کے دوران کئی قیامت خیز موڑ آئے اور وہ ہر موڑ پر خیالی شاعری کرتا رہا۔

وہ جھاڑو واپس موری کے پاس رکھ کر جیسے ہی پلٹی احمد شاہ پر جیسے بجلی سی ٹوٹ پڑی۔ وہ بھی ایک لمحے کو بھول گئی کہ اسے سر کے تولیے کو دوپٹہ بنا لینا چاہئے۔ انہیں احساس اس وقت ہوا جب کچن میں کسی برتن کے گرنے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی قینچی بنا کر دوپٹے کا کام لیا پھر ہکلاتے ہوئے بولی۔ "آ.......... آپ کب آئے؟"

اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے تخت .... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دو .... دوپٹہ وہ رہا۔"

ساحرہ نے جلدی سے دوپٹہ اُٹھا لیا۔ اسی وقت ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ کچن سے باہر آ رہی تھی۔ "اب تُو بیٹھ مت جانا' پہلے گیلری میں کھڑی ہو کر بال خشک کر لے ورنہ سر میں درد ہو جائے گا۔ تیرے آنے تک میں اپنے بیٹے سے باتیں کرتی ہوں۔"

ساحرہ ادائے ناز سے لہراتی ہوئی کمرے سے ہوتی ہوئی گیلری میں چلی گئی۔ خاتون نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا! تم ہاتھ دیکھنے کے علاوہ اور کیا کام کرتے ہو؟"

"ماں جی! بس یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جیسے کسی ادیب کا افسانہ لکھنا اور شاعر کا شاعری کرتے رہنا۔"

"اس کام میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"روز کے اتنے مل جاتے ہیں کہ پانچ' سات آدمی پیٹ بھر کر آرام و سکون سے کھا پی سکتے ہیں اور میرے گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے اس لئے بچت ہی بچت ہے۔"

"کوئی نہیں' تمہارے ماں باپ' بہن بھائی' بیوی بچے کوئی تو ہوں گے؟"

"جب میں پندرہ برس کا تھا تو امی بیماری کی حالت میں وفات پا گئیں۔ ابو نے دوسری شادی کر لی۔ والدہ میرے مزاج سے بالکل مختلف تھیں اس لئے ایک ساتھ گزارہ نہ ہو سکا۔ ابو انہیں لے کر علیحدہ ہو گئے۔ مکان میری امی کا تھا۔ انہوں نے میرے نام کر دیا تھا اس لئے میں اپنے مکان میں ہی رہا۔ جہاں تک بیوی بچوں کا تعلق ہے تو کل تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی تھی۔"

"کل تک سے تمہاری کیا مراد ہے' کیا آج کوئی دیکھ لی ہے؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ساحرہ واپس آ گئی۔ وہ چپ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ خاتون نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تم باتیں کرو' میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

اس نے ذرا شوخی سے کہا۔ "ماں جی! میں اکیلا رہتا ہوں اس لئے کھانے پینے میں تکلف نہیں کرتا۔ جہاں بھوک لگتی ہے اپنی بھوک کا اظہار کر دیتا ہوں۔ میں چائے ضرور پیوں گا مگر کھانے کے بعد۔"

اس کی بے تکلفی خاتون کو اچھی لگی' انہوں نے کہا۔ "یہ ہوئی نہ اپنوں جیسی بات تو پہلے میں روٹیاں پکا لیتی ہوں۔"

خاتون کے جاتے ہی ساحرہ نے کہا۔ "لگتا ہے آپ نے ماں کو بھی شیشے میں اُتار لیا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھی سے کیا مراد ہے' کیا کوئی اور بھی شیشے میں اُتر چکا ہے؟"

وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے کچن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جہاں بیٹھی ہوئی تھی وہاں سے اس کی ماں صاف دکھائی دے رہی تھی' اس لئے اٹھتے ہوئے بولی۔

"ادھر تخت پر آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ آرام سے بیٹھ کر میرا ہاتھ دیکھئے گا اور لکیروں کی زبان سمجھائیے گا۔" اس نے اپنا ہاتھ دکھانے سے پہلے پوچھنا چاہا۔ "آپ.........."

"آپ نہیں تم......... تمہارے منہ سے اچھا لگے گا۔"

"اچھا بھئی! تم نجومی ہو۔ تم نے اپنا ہاتھ بھی تو دیکھا ہو گا کیونکہ میں نے سنا ہے کہ دست شناسی کا سبق پہلے اپنے ہاتھ سے شروع ہوتا ہے۔"

وہ ذرا ہچکچایا پھر بات بناتے ہوئے بولا۔ "ہاں! کیوں نہیں' اپنا ہاتھ ہے۔ نہ دیکھو تب بھی اٹھتے بیٹھتے نظر آتا ہے۔"

ساحرہ نے کہا۔ "تو پھر اپنے متعلق پہلے بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں؟"

احمد شاہ جواب دینے سے پہلے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "یہ حسینہ محبت سے نہیں صرف دولت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سے اسی کے مطلب کی بات کرنی چاہئے۔"

ساحرہ نے اسے چونکا دیا۔ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "سوچ رہا تھا خوشی کی باتیں کیسے بتاؤں۔ کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں؟"

"کیسی خوشی؟"

"یہ سال میرے لئے بہت لکی ہے۔ میرے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں کہ میں جس لڑکی سے شادی کروں گا وہ میری طرح ایک خواب دیکھنے والی اور خوابوں میں دولت سے کھیلنے والی غریب لڑکی ہو گی لیکن میری شریک حیات بننے کے چند ماہ بعد وہ سچ مچ دولت سے کھیلے گی۔ اس کے اور میرے ستارے اتنے ملتے ہیں کہ جب ہم مٹی کو ہاتھ لگائیں گے وہ سونا ہو جایا کرے گی۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہمارے بینک اکاؤنٹ ہوں گے۔ وہ ناشتا کراچی میں کرے گی' لنچ قاہرہ میں اور ڈنر لندن میں کیا کرے گی۔"

احمد شاہ خوب بڑھا چڑھا کر اسے سپنے دکھا رہا تھا۔ وہ بولتا جا رہا تھا اور وہ خوابوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ خلا میں تکتے ہوئے کئی بار اسے سیٹھ سلطان افضل یاد آیا لیکن اس نے اونہہ کہہ کر اسے نفرت سے بھگا دیا۔

جب کوئی شخص بُرا لگنے لگے تو اس کی ایک ایک بُرائی نشر مکرر کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کے دماغی پردے پر سلطان افضل دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک حسین عورت کے ساتھ ہوٹل کیسینو میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بار بار اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اسے اپنی دوستی اور محبت کا یقین دلا رہا تھا۔

اس نے ذہن کو جھٹک کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے احمد شاہ کو دیکھا جس کے ہاتھ کی لکیریں دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کی تجوریاں کھولنے والی تھیں۔

اس کے سوچنے کے دوران ہی احمد شاہ نے پوچھا۔ "تم کہاں کھو گئی ہو؟"

"آں......... کہیں نہیں' میں تو.........."

وہ بولتے بولتے خود ہی رک گئی پھر بولنے لگی۔ "تم نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کا حال بتایا اور خوبیاں ہی خوبیاں بتائیں۔ تم میں بھی تو کوئی خرابی ہو گی؟"

اس نے ایک سرد آہ بھری کہا۔ "ہاں .... انسان خطا کا پتلا ہے لیکن دولت کا پتلا بناؤ تو اس میں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ جب دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دولت ہی دولت ہو تو پھر اس مرد کی بُرائیاں نہیں صرف اچھائیاں دیکھی جاتی ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ دولت انسان کی ہزار بُرائیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ خیر چھوڑو۔ تو پھر اس سال تم شادی کر رہے ہو؟"

"ہاں! میرے ہاتھ کی لکیریں تو یہی کہتی ہیں کہ مجھے ایک ایسی لڑکی ملے گی جو میری برائیوں کا نہیں صرف دولت کا حساب دیکھے گی اور مجھ سے محبت کرتی رہے گی۔"

پھر اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو میری اپنی باتیں ہوئیں' لاؤ' اب اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

اس نے مٹھی بند کر لی اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ احمد شاہ نے پوچھا۔ "کیوں' کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "مرد اتنے خودغرض کیوں ہوتے ہیں۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہیں کوئی ایسی لڑکی ملے جو اس کی بُرائیوں کا حساب نہ کرے۔ کیا لڑکیاں بھی یہ نہیں سوچ سکتیں کہ اس کا ہونے والا شوہر آنکھ بند کر کے اعتماد کرے۔"

احمد شاہ نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اگر میری لکیروں نے بتایا کہ میں کام چور ہوں' نکمی ہوں اور نوٹ گننے میں اتنا وقت لگا دیتی ہوں کہ شوہر کے لباس پر استری کرنا بھول جاتی ہوں تو پھر میرا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ سوچنے والے یہی سوچیں گے کہ میں صرف نوٹوں سے محبت کرتی ہوں۔ جبکہ نوٹ صرف انگلیاں گنتی ہیں لیکن محبت دل سے کی جاتی ہے۔ تم ہاتھ کی لکیریں پڑھتے ہو لیکن اپنے ہونے والے شوہر کے لئے میرے دل میں محبت کی کتنی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں' یہ کبھی نہیں پڑھ سکتے۔"

احمد شاہ نے کہا۔ "میں مانتا ہوں' جس طرح ہر انسان اپنے دل کی بات چھپاتا ہے اسی طرح ہاتھ کی لکیروں کو بھی چھپانا چاہئے۔ تم بھی چھپا رہی ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اگر تم ہاتھ کی لکیروں کو پڑھنا جانتیں تو میں بھی اپنے ہاتھ کی لکیروں کو تم سے چھپاتا۔"

اس نے چند لمحے رک کر ملائمت سے کہا۔ "لکیروں سے ہٹ کر بھی ایک رشتہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے اعتماد کا رشتہ۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ تم نے بہت اچھی بات کہہ دی۔ اصل بات اعتماد ہے۔ اعتماد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

مزید کچھ کہنے سے پہلے ماں کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا! دسترخوان بچھا دے۔ کھانا تیار ہے۔"

وہ ایک دم سے اُٹھنے لگی تو اس کا سلک کا دوپٹہ پھسل کر تخت پر ہی گر گیا۔ گلے کی چین کے ساتھ لٹکنے والا چھوٹا سا سونے کا دل لٹک کر جھولنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ساحرہ اپنا دل نکال کر اس کے آگے پیش کر رہی ہے۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

لڑکی یا لڑکے کی یہ نفسیات ہے کہ وہ چاہے تنہائی میں ایک دوسرے کی قربت میں کتنی ہی بار کیوں نہ آ چکے ہوں لیکن جہاں شادی کی بات آتی ہے ایک دم سے حیا کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ ساحرہ بھی ایک دم سے شرما گئی جلدی سے اپنا دوپٹہ اُٹھا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے ساحرہ کی ماں نے کہا۔ "بیٹا احمد! وہ میری ایک بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ تمہیں کون سی لڑکی پسند آ گئی ہے۔ مجھے بتاؤ' میں خود جا کر تمہارے رشتے کی بات طے کر دوں گی۔ آخر تم نے مجھے ماں جی کہا ہے۔"

احمد شاہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چمچہ پلیٹ میں ہی چھوڑ دیا اور اسی ہاتھ کو ساحرہ کی والدہ کے گھٹنے پر رکھ کر کہا۔ "تو پھر آپ ہی مجھے اپنا بیٹا کیوں نہیں بنا لیتیں۔ میں آپ کی بیٹی........."

اس نے کہتے کہتے رک کر ساحرہ کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ خاتون نے کہا۔ "لگتا ہے شرما گئی ہے' کھانا ادھورا چھوڑ کر چلی گئی۔"

پھر احمد شاہ سے مخاطب ہوئی۔ "احمد بیٹا! جس وقت تم ہمارے دروازے پر آئے تھے اسی وقت میرے دل نے اس بات کی گواہی دے دی تھی کہ تم میری بیٹی کی قسمت بن کر آئے ہو لیکن میں اس رشتے کی ہامی بھرنے سے پہلے اس کے ڈیڈی سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک دو دن کی مہلت چاہئے۔"

"ایک دو دن کیا ماں جی! آپ ایک ہفتہ سوچ لیں لیکن فیصلہ میرے حق میں ہی کیجئے گا۔ یقین رکھئے میں آپ کی بیٹی کو رانی بنا کر راج کراؤں گا۔ یہ جہاں قدم اُٹھائے گی وہاں نوٹ ہوں گے اور جس جگہ قدم رکھے گی وہاں سونے کا فرش ہو گا۔ میں آپ کی بیٹی کو کبھی کسی بات کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"تم بے فکر رہو۔ مجھے سو فیصد یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے لیکن مشورہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ وہ ساحرہ کے سگے والد نہیں ہیں۔ ان کی وفات کے بعد شبیر میری زندگی میں آئے۔ اگر نہیں پوچھا تو انہیں دکھ ہو گا کہ بیٹی کے بارے میں ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟"

"جی جی بالکل' اب تو اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ آپ اطمینان سے مشورہ کریں۔"

ایسا کہتے ہوئے اس نے دیکھا' ساحرہ ایک دروازے کی آڑ میں تھی۔ اس کا لباس جھلک رہا تھا۔ یہ علم نجوم ہے کیا؟ لوگ تو ستاروں کی چال سمجھے بغیر مقدر کی لکیر کھینچ دیتے ہیں۔ جیسے احمد شاہ اپنے نام کی لکیر ساحرہ کے ہاتھ پر کھینچ چکا تھا۔

☆======☆======☆

ساحرہ اور اس کی ماں ایک کمرے میں سوتے تھے جبکہ شبیر محمد دوسرے کمرے میں۔ اس نے اپنی بیگم کے منہ سے ساحرہ کی شادی کی بات سنی تھی اور کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ بار بار بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ برآمدے میں آ کر دوسرے کمرے میں جھانک کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھتا تھا پھر جا کر لیٹ جاتا تھا۔

اس کی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ وہ دل پھینک نوجوان تھے جن سے وہ بیٹی کو سائن بورڈ کے طور پر دکھا کر بہت سی رقمیں لے چکا تھا اور جوئے شراب کی نذر کر چکا تھا۔ اگر انہیں ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی کہ وہ اب تک بیٹی کے نام پر انہیں لوٹتا رہا ہے تو وہ اسے جان سے مار ڈالتے یا بیٹی کی ایسی حالت بنا دیتے کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔

وہ بیوی سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ ابھی اس شادی کو کسی طرح ٹال دے۔

ساحرہ کی ماں نے صرف شوہر کو بتایا تھا۔ بیٹی کے سامنے مشورہ نہیں کیا تھا اس لئے وہ بھی اپنے بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ بیٹی کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکی ہے تو وہ شوہر کے کمرے میں آ گئی۔ شبیر اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ مجھے تم سے.........."

"آپ بار بار اُٹھ کر باہر آ رہے تھے۔ جھانک کر ہمارے کمرے میں دیکھ رہے تھے۔ میں آپ کی بے چینی دیکھ رہی تھی اور آپ کی پریشانی سمجھ رہی تھی۔"

"ساحرہ سو گئی ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ بتایئے کیا اُلجھن ہے۔ آپ نے ساحرہ کی شادی سے متعلق بھی کوئی جواب نہیں دیا۔"

"بیگم تم نے تو مجھے بوکھلا دیا ہے۔ اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ تم اس نجومی سے صاف صاف کہہ دیتیں کہ ابھی ہمارا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ.......... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ لڑکی ماشاء اللہ شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ میں بھلا.........."

"بیگم! شادی بیاہ گڈی گڈے کا کھیل تو ہے نہیں کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر دوں۔ اس کے لئے کچھ انتظامات کرنے ہوں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے احمد شاہ کے گھر میں۔ ہمیں صرف اپنی بیٹی دینی ہے۔ چار آدمیوں کو بلا کر نکاح پڑھوا دینا ہے۔ بس!"

"مگر بیگم .... باراتیوں کا ہاتھ دُھلانے کے لئے بھی کچھ انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔"

"واہ شبیر صاحب واہ۔ اب ہم اتنے بھی گئے گزرے تو نہیں ہیں کہ چار آدمیوں کا کھانا بھی نہ پکوا سکیں۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دروازے پر بیٹی کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ ماں نے کہا۔ "تُو ابھی تک سوئی نہیں' میں تو سمجھی تھی کہ.........."

"امی جس طرح آپ کو اور ڈیڈی کو نیند نہیں آ رہی ہے۔ اسی طرح میں جاگ رہی تھی اور جاگ کر یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے کیونکہ میں جانتی تھی ڈیڈی اتنی جلدی اور آسانی سے اس شادی پر تیار ہونے والے نہیں ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟"

شبیر محمد نے پہلے ساحرہ کو پھر بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہنے دو بیگم۔ اگر یہ نہیں بولے گی تو پھر کون بولے گا۔ کیسے معلوم ہو گا کہ میں اس کا سگا باپ نہیں ہوں۔"

"ڈیڈی! آپ کیا سمجھتے ہیں' میں کچھ نہیں جانتی؟ میں آپ کی ایک ایک حرکت سے واقف ہوں۔"

"ک ک.......... کیا جانتی ہو؟"

"آپ نے جس طرح محلے کے بھولے بھالے اور بدمعاش قسم کے لڑکوں کو مجھ سے

شادی کا یقین دلا کر پیسے بٹورے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

شبیر محمد بوکھلا گیا۔ "تت .... تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"جھوٹ میں نہیں آپ بول رہے ہیں۔ جن جن سے آپ نے میرے نام پر رقم لی ہے وہ کسی نہ کسی بہانے اس دہلیز پر آتے رہتے ہیں۔ مجھے بتاتے رہتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو اب تک میرے حصول کے لئے کتنی رقمیں دی ہیں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

پھر وہ بیگم سے مخاطب ہوا۔ "بیگم! میں نہ کہتا تھا' تمہاری بیٹی نے آج تک مجھے باپ کی حیثیت سے قبول نہیں کیا ہے۔ دیکھ لیا آج کیسے کیسے سنگین الزامات لگا رہی ہے۔ اب میں ایک پل بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میں ابھی اس وقت یہاں سے جا رہا ہوں۔"

ساحرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اونہہ' جانا تو آپ کو پڑے گا ہی ورنہ شادی والے روز محلے کے بپھرے ہوئے نوجوان آپ کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

شوہر بیگم کی لاعلمی میں جو کچھ کرتا رہا تھا بیگم کو محلے کی عورتوں سے پتا چلتا رہتا تھا لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ لوگ اسے اس کے شوہر کی طرف سے بہکا رہے ہیں کیونکہ سب ہی یہ جانتے تھے کہ شبیر اس کا دوسرا شوہر ہے۔ البتہ اس بات سے وہ واقف تھی کہ شبیر اسے اور اس کی بیٹی کو اونچی سوسائٹی میں کیوں لے جاتا ہے۔ اس میں بیٹی کی بھلائی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ساحرہ کو کوئی امیرزادہ پسند کر لے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے لیکن جو بھی ملا صرف چند راتوں کی دلہن بنانے کے لئے۔

بیگم کو خاموش دیکھ کر شبیر نے کہا۔ "ساحرہ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ تم سوتیلی ہو مگر میری سگی بیوی کی سگی بیٹی ہو اس لئے تمہاری فکر ہے۔ وہ تمہیں بھی کسی قابل نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے میری مانو ابھی اس شادی کو ملتوی کر دو پھر مناسب وقت پر دیکھیں گے۔"

ساحرہ کی ماں نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے احمد شاہ کو زبان دے دی ہے۔ شادی ہو گی ضرور ہو گی۔ یہاں نہیں تو کسی دوسرے علاقے یا شہر میں جا کر ہو گی مگر ہو گی۔"

شبیر محمد نے چونک کر دیکھا۔ بیگم نے پھر کہا۔ "شادی کے بعد ساحرہ' احمد شاہ کی بیوی ہو گی۔ اس کی ذمے داری ہو گی' وہ خود ہی اس کی حفاظت کر لے گا۔ فی الحال ہم اس سے یہی کہیں گے کہ ہم شادی حیدر آباد میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں میری ایک سہیلی ہے۔ کوئی مشکل بھی نہیں ہو گی۔"

شبیر نے کہا۔ "اگر اس نجومی کو اعتراض ہوا تو؟"

بیگم نے کہا۔ "اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ وہ اکیلا رہتا ہے۔ یوں بھی میں کہہ دوں گی کہ وہ سہیلی میری بہن ہے۔ اس کی خواہش کے مطابق شادی اس کے گھر ہو گی۔ اڑوس پڑوس میں بھی کوئی پوچھے گا تو ہم یہی کہیں گے کہ اپنی بہن کے گھر جا رہے ہیں۔"

شبیر محمد بے بسی سے بیوی کو دیکھنے لگا۔ کیسی خوبصورتی سے وہ تمام معاملات طے کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

سہاگ کی سیج پر وہ بے خبر سو رہی تھی لیکن احمد شاہ جاگ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی دولت مند کو اپنے علم اور چالاکی سے مات دی تھی اور یہ ایسی خوشی تھی جو اسے کئی راتوں تک جگا سکتی تھی۔

کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چھت کے پنکھے کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ساحرہ نے دائیں سے بائیں کروٹ لی' اس کا بایاں ہاتھ اپنے چہرے کے قریب تکیے پر آ گیا۔ وہ بھی اس کی طرف کروٹ بدل کر اس کے گلاب جیسے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی حنائی ہتھیلی چہرے کے پاس کھلی ہوئی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کی کتاب کھل گئی ہو۔ جن لکیروں کو اس نے چھپایا تھا وہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ وہ ہتھیلی جتنی خوبصورت تھی اس کے چال چلن کی لکیر اتنی ہی میلی تھی۔ وہ لکیر بتا رہی تھی کہ یہ اس کی پہلی سیج نہیں ہے۔ ویسے وہ راہِ راست پر آ سکتی ہے اور وفا بھی کر سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے بے جا آزادی نہ دی جائے اور اسے کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔

اسے دُکھ ہوا کہ سہاگ کی سیج پر باسی پھول پڑا ہے مگر اس میں اتنی کشش تھی کہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا پھر یہ کہ اس نے ایک دولت مند سے بازی جیتی تھی۔ اگرچہ وہ جیت ایک ہار تھی مگر سلطان افضل اور دنیا والوں کے سامنے پھولوں کا ہار تھی جو دو لاکھ روپے حق مہر کے عوض گلے پڑ گئی تھی۔ اگر مردانہ غیرت تقاضہ کرتی تب بھی وہ اسے بدچلن کہہ کر طلاق نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس کی بدچلنی کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ ہاتھ کی لکیر کو یقینی ثبوت کے ساتھ پیش کرتا تو دنیا کی کوئی عدالت بولتی ہوئی بے زبان لکیر کو نہیں مانتی۔ اگر علم نجوم کو قانوناً تسلیم کیا جاتا تو دنیا کے ہر تھانیدار کے لئے علم نجوم کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا جاتا۔ لہٰذا اس نے جو دیکھا اسے راز کی طرح اپنے اندر جذب کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ اس کی نگرانی کرے گا۔ اسے راہِ راست پر رکھے گا

پھر بھی وہ بے لگام ہو گئی تو اسے سبق سکھا دے گا۔

شادی کے چار دنوں کے بعد وہ حیدر آباد سے اپنے کراچی والے گھر آ گیا۔ اس کی رہائش شاہراہِ قائدین سے منسلک خداداد کالونی میں تھی۔ جس وقت وہ ساحرہ کو لے کر وہاں پہنچا' رات کا وقت تھا اس لئے کسی کو پتا نہیں چلا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ اس کی خوبصورت دلہن کو کوئی نہ دیکھے۔ وہ ایسی تھی کہ دیکھنے والوں کے لئے بہکنے کا سامان پیدا کر دیتی لیکن وہ زیادہ عرصے تک یہ بات چھپا کر بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ محلے کی بڑی بوڑھی عورتیں اس کے گھر میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس نے سخت نگرانی کا بندوبست کر لیا۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں والا دروازہ مقفل کر کے چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ کھڑکیاں پُرانے زمانے کی تھیں ان کی مرمت کے بہانے انہیں مکمل طور پر بند کر دیا۔ دروازے کے تمام بڑے چھوٹے سوراخ بھی بند کر دیئے تاکہ اس کی غیر موجودگی میں نہ ہی ساحرہ باہر جھانک سکے اور نہ کوئی جھانک کر اندر اس کی بیوی کو دیکھ سکے۔

حقیقت واقعی بہت تلخ ہوتی ہے۔ اس کا ایک قطرہ بھی دل و دماغ پر ٹپک جائے تو سارا وجود کڑوا ہو جاتا ہے۔ احمد شاہ کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ دوسروں کے ہاتھوں کی لکیروں کا سچ اُگل دینا کتنا آسان ہے اور خود سامنا کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس نے بیوی کی نگرانی میں سوتے میں بھی جاگنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی اس کی نظر پہلے سوئی ہوئی ساحرہ پر جاتی تھی۔

ساحرہ نے بھی کئی بار محسوس کیا کہ جب کبھی اچانک وہ نیند سے بیدار ہوتی ہے تو احمد شاہ جاگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک رات اس نے پیار سے کہا۔ "آپ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آپ ساری ساری رات جاگتے جو رہتے ہیں۔"

وہ اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے بات بناتے ہوئے بولا۔ "ساحرہ۔ مجھے عجیب سا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک پل کے لئے آنکھیں بند کروں گا اور تم کہیں کھو جاؤ گی۔ کوئی تمہیں مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔"

اس نے شوخی سے کہا۔ "اچھا تو اب میں سمجھی کہ جب سے شادی ہوئی ہے' آپ نے گھر سے باہر نکلنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ بس جو خود چل کر دہلیز تک آتا ہے اس کے ہاتھ دیکھ لیتے ہیں۔ اسی لئے تو آمدنی محدود ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح تو ہمارے خوابوں کی تعبیر دور ہو جائے گی۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسے خواب؟ کیسی تعبیر؟"

"ایک بڑی سی کوٹھی' گھومنے پھرنے کے لئے لمبی سی کار' تقریبات میں جانے کے لئے بیش قیمت لباس' سونے اور ہیرے کے زیورات' دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے لئے ڈھیر ساری دولت جس کی پیش گوئی آپ کے ہاتھ کی لکیریں کرتی رہی ہیں۔"

اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں' مجھے یاد ہے۔ یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے لیکن اس کے لئے انتظار کرنا ہو گا۔ ستارے ہماری خاطر چالیں بدل رہے ہیں۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ............"

"ہاں ہاں' مجھے یاد ہے۔ میں نے اسی سال کا کہا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ ستارے اپنے وقت پر مقام بدلتے ہیں۔ یہ ہم نجومیوں کے بس میں نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے انہیں پہلے یا بعد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیں۔"

"ٹھیک ہے' آپ اپنے علم کے مطابق درست کہہ رہے ہیں لیکن تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی لازمی ہے۔"

"درست کہتی ہو' میں کل ہی سے منصوبے بناؤں گا۔"

"میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔ سیٹھ سلطان افضل کی ایک کزن میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ اس کے ساتھ میرا بڑے بڑے گھرانوں میں آنا جانا ہے۔"

احمد شاہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ہے نہیں' تھا۔"

اس نے کہا۔ "ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟ میں پھر سے ان کے ساتھ گھل مل جاؤں گی۔ اس طرح بڑی سوسائٹی کی بیگمات کو اس بات پر اُکساؤں گی کہ وہ اپنے بارے میں آگاہی حاصل کریں۔ اپنے شوہروں کے بارے میں اپنے طور پر معلومات کریں۔ اس طرح ہمارے بینک اکاؤنٹ میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔"

بیوی کا یہ منصوبہ احمد شاہ کی ترقی کے لئے اچھا تھا لیکن اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ساحرہ کا دہلیز پار کرنا اور ان لوگوں کی چار دیواری میں قدم رکھنا ضروری تھا۔ اسی وقت اس کے اندر یہ تجسّس پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھی جائیں۔ وہ لکیریں بتائیں گی کہ بیوی کمائی کا منصوبہ بنا رہی ہے یا اسے اُلّو بنانے کا؟

پھر اس نے حقارت سے سوچا' عورت کیا اُلّو بنائے گی۔ اسے اُلّو بنا کر میں اپنے گھر لے آیا ہوں۔ اس کے منصوبے اس کے لئے مبارک نہیں ہوں گے۔ میں خود ہی کچھ کروں گا۔

ساحرہ نے اسے خاموشی سے سوچتا دیکھ کر کہا۔ "ایک تو آپ نجومی لوگ سوچتے

بہت ہیں۔ میری مانیئے تو اللہ کا نام لے کر شروع کر دیتے ہیں۔"

وہ اسے فوری جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے ٹالتے ہوئے بولا۔ "جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ جو کام سوچ سمجھ کر کیا جائے وہ پائیدار اور منافع بخش ہوتا ہے۔ مجھے ایک دو دن کی مہلت دو۔ میں اپنا زائچہ بنا کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ستارے میرے موافق ہیں یا نہیں؟ اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھا بابا اچھا۔ آپ اچھی طرح اپنی تسلی کر لیں۔"

ساحرہ نے وقتی شکست تسلیم کرتے ہوئے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ احمد شاہ بھی آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ اس نے تاریخ میں کئی ایسے مردوں کے بارے میں پڑھا تھا جن کی کامیابی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ تھا۔ اسے بھی اس بات کا یقین تھا کہ ساحرہ کی مدد حاصل کر کے وہ شہرت اور دولت حاصل کرنے میں اپنے سے بڑے ماہرین نجوم سے آگے نکل سکتا ہے۔ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے مضبوط اور مستحکم تعلیم اور آمدنی کے ذرائع پیدا کر سکتا ہے لیکن بند آنکھوں کی تاریکی میں ساحرہ کی ہتھیلی روشن ہوتی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا تھا۔

ایک انگریز مفکر کا کہنا ہے۔ "جب دولت انسان کے پاس سے جاتی ہے تو کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ جب صحت جاتی ہے تو تھوڑا سا نقصان ضرور ہوتا ہے لیکن جب انسان کی عزت چلی جاتی ہے تو پھر اس کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا۔"

اسے بھی اپنی عزت سب سے زیادہ عزیز تھی جو اس کی اولاد کے لئے بھی ضروری تھی جو ایک نہ ایک دن اس کے نام سے پہچانی جانے والی تھی۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں یہی بات آئی کہ اللہ بڑا ہے۔ تُو اپنی خواہشات کو اور بیوی کے سہانے خوابوں کو ناگ سانپ کی طرح پھن اُٹھانے سے پہلے ہی کچل دے۔ رسوائی بھری بلندیوں کی طرف اُٹھنے والی دیوار کو ریزہ ریزہ کر دے۔ اپنی بیوی کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دے۔ اس حد تک پابندی لگا دے کہ اپنے علاوہ کسی غیر مرد کا سایہ تک اس پر نہ پڑنے پائے۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ ہو جاتا ہے تو اس پر اس کا اختیار نہیں تھا کیونکہ ہاتھ کی لکیریں اس وقت بالکل خاموش ہو جاتی ہیں جب خدائے برتر کے حکم سے انہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی ہونا ہوتا ہے۔

شبیر محمد اور اس کی بیگم ساحرہ کی شادی کے بعد محلے میں جوابدہ تھے۔ ساحرہ کے کئی سوالی ان کے در پر دھرنا مار کر بیٹھ سکتے تھے۔ وہ زیادہ عرصے تک ٹال مٹول نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی زیادہ دن تک یہ بہانہ کارگر ثابت ہو سکتا تھا کہ انہوں نے بیٹی کو خالہ کے

پاس چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے حیدر آباد سے واپس اس گھر میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یوں بھی اس گھر میں کوئی ایسی قیمتی یا اہم چیز نہیں تھی جس کے لئے انہیں وہاں جانا ضروری تھا۔ چنانچہ حیدر آباد سے واپس آ کر انہوں نے شہر کی ایک کچی آبادی میں ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان لے لیا لیکن احمد شاہ کے ہاں ان کا آنا جانا مسلسل رہتا تھا۔ مہینے کے پندرہ دن دونوں میاں بیوی بیٹی داماد کے گھر پر ہی گزارتے تھے۔

شبیر اگرچہ ساحرہ کا باپ تھا لیکن وہ بھی احمد شاہ کو کھٹکتا تھا کیونکہ وہ سگی بیٹی نہیں تھی۔ سوتیلی تھی۔ اپنا خون نہیں تھا۔ اس لئے سوتیلے باپ کی نیت کسی وقت بھی خراب ہو سکتی تھی۔ احمد شاہ نے کئی بار یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ جب اس کا دھیان اس طرف نہیں ہوتا تو وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے سوتیلی بیٹی کو دیکھتا ہے۔ بہرکیف وہ رشتے میں باپ تھا۔ وہ اسے نہ ہی آنے سے روک سکتا تھا اور نہ ہی کسی شک کی بنیاد پر اسے کچھ کہہ سکتا تھا۔ اس لئے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ سب کی لاعلمی میں اپنا مکان کرائے پر دے کر خود کسی گم نام علاقے میں کرائے دار ہو کر رہ جائے تاکہ ساحرہ کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکے۔

ساحرہ نے کئی بار اس اچانک فیصلے کی وجہ پوچھی تو اس نے یہی کہا کہ ستارے کہہ رہے ہیں، جگہ بدلنے سے تقدیر بدل جائے گی اس لئے وہ ایسا کر رہا ہے۔

اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے اپنی ساس کی سہیلی کی طرف سے ایک جعلی خط لکھا کہ وہ سخت بیمار ہے اور اسے فوری بلایا ہے۔ اس طرح ساس اور سسر کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی اپنی کارروائی شروع کر دی۔

نئے گھر میں آنے کے ایک ہفتے بعد ہی ساحرہ نے اسے باپ بننے کی خوشخبری سنائی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ماں کے حیدر آباد سے لوٹتے ہی وہ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ آئے۔ دس پندرہ دن رہ کر واپس آ جائے گی۔

احمد شاہ نے جواب میں کہا۔ "ساحرہ! جب تک تم میرے بچے کی ماں نہیں بن جاتیں، اس وقت تک یہاں سے جانا ناممکن ہے۔ اب ہم دونوں کا نہیں ہمارے بچے کا مقدر بھی جگمگائے گا۔"

"لیکن اس طرح تو میں اکیلی مر جاؤں گی۔ اگر آپ گھر میں نہیں ہوں گے اور مجھے کچھ ہو گیا تو؟"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔"

دوسرے دن صبح ہوتے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ اسے بہت سے کام نمٹاتے ہوئے

مغرب اور عشا کے درمیان اپنے خداداد کالونی والے مکان پر پہنچنا تھا جہاں سے اپنے کرائے دار سے ایڈوانس کی بقایا رقم وصول کرنا تھی۔

وہ دوپہر کے وقت فیڈرل سی ایریا کے ایک فلیٹ میں تھا۔ جہاں اسے خبر ملی کہ لالو کھیت اور ناظم آباد کے علاقے میں کچھ ہنگامہ ہو گیا ہے لیکن پھر پتا چلا کہ حالات معمول پر آ گئے ہیں۔ وہ مغرب تک وہیں بیٹھا رہا جب اندھیرا ہونے پر فلیٹ سے نکل کر سڑک پر آیا تو عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ بسیں اور ویگنیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کی جیب میں اتنے پیسے تھے کہ وہ رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کر خداداد کالونی سے ہوتا ہوا لانڈھی کی گیدڑ کالونی تک جا سکتا تھا لیکن ٹیکسی اور رکشے بھی سڑکوں پر کم تھے۔ وہ رکنے کا اشارہ کرنے کے باوجود تیزی سے گزر جاتے تھے۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ پریشان ہو کر سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھنے لگا۔ اسی وقت دو ہیڈ لائٹیں نظر آئیں۔ وہ اسی کی جانب آ رہی تھیں۔ اس نے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ وہ ٹیکسی تھی۔ ڈرائیور نے پوچھا۔ "کیوں صاحب' کہاں جانا ہے؟"

اس نے کہا۔ "خداداد کالونی سے ہوتا ہوا گیدڑ کالونی لانڈھی جانا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں طارق روڈ تک جا رہا ہوں۔ اگر آپ کہیں تو خداداد کالونی تک چھوڑ سکتا ہوں۔"

احمد شاہ نے آگے کا دروازہ کھولا لیکن بیٹھنے سے پہلے رک گیا۔ اگلی سیٹ پر اور پاؤں کے پاس چند گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ پر بھی لانبے لانبے گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ٹیکسی والے نے کہا۔ "آپ ڈبوں کو ایک پر ایک رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنا لیں۔ یا میں ڈکی کھولتا ہوں یہ آگے والے ڈبے وہاں رکھ دیں۔"

ڈرائیور ڈکی کھولنے گیا۔ احمد شاہ اگلی سیٹ کے ڈبے اُٹھا کر وہاں لے آیا۔ پھر انہیں ڈکی میں رکھنے کے بعد اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سٹیئرنگ سیٹ پر آیا پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

احمد شاہ نے پوچھا۔ "یہ آخر ہو کیا گیا ہے؟ ایک دم سے سناٹا چھا گیا ہے؟"

ٹیکسی والے نے کہا۔ "پتا نہیں' اس شہر کو دشمنوں کی نظر لگ گئی ہے۔ میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ خبریں بھی نہیں سُن سکا۔ اب یہ ڈبے طارق روڈ کے ایک بنگلے پر چھوڑ کر گھر جاؤں گا تو بی بی سی کی نشریات سنوں گا۔ وہی حقائق بتائیں گے ورنہ ہمارے

ریڈیو اور ٹی وی تو اصل بات کبھی بتاتے ہی نہیں ہیں۔"

وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے گرو مندر کی چورنگی کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں انہیں چار پانچ فوجی ٹرک نظر آئے جو دوسری طرف کی سڑک سے تین ہٹی کی جانب جا رہے تھے۔ ڈرائیور کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن اس نے احمد شاہ پر ظاہر نہیں کیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہمارے ہاں ذرا ذرا سی بات پر فوج کو بلا لینا عام سی بات ہو گئی ہے۔"

احمد شاہ نے جواباً کہا۔ "ہاں' ہم لوگ ہیں بھی اسی قابل۔ ہمارے سروں پر ڈنڈا وزنی رہے تو ٹھیک رہتے ہیں جہاں ذرا سی ڈھیل ملی..........."

وہ بولتے بولتے رُک گیا۔ سامنے ہی نمائش چورنگی تھی۔ وہاں ایک فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی والے کی رفتار ایک دم سے سُست ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مارے گئے۔"

احمد شاہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا' کیا لائسنس وغیرہ نہیں ہے؟"

"ہاں اور اب واپس جانے کا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں پولیس چوکی کے سامنے سے گزرنا ہو گا۔"

"آپ ڈرائیوروں کو اپنے مکمل کاغذات رکھنے چاہئیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے' اللہ کا نام لے کر بڑھو۔"

وہ جیسے ہی شاہراہِ قائدین کے موڑ پر آئے ایک فوجی نے ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی والے نے "یا اللہ خیر" کہتے ہوئے گاڑی روک دی۔ ایک پولیس والے نے ڈرائیور کے پاس آ کر پوچھا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟"

"فیڈرل سی ایریا سے لیکن خیر تو ہے؟"

"نیچے اُتر کر ڈکی کھولو۔"

احمد نے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"تمہیں پتا نہیں ہے ملک کا نظام فوج نے سنبھال لیا ہے؟"

"کیا..........؟"

"ہاں' اب نیچے اُترو اور تلاشی دو۔"

وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ پولیس والے تلاشی لینے لگے' اسی وقت دو فوجی بھی قریب آ گئے۔ ایک ڈکی والے کے پاس چلا گیا' دوسرا سیٹ والوں کے پاس پہنچ کر بولا۔ "ان ڈبوں کو کھولو۔"

جب فوج ملک یا شہر کا نظام سنبھالتی ہے تو تمام تھانے فوج کے تابع ہو جاتے ہیں۔ پولیس کے اہلکار بھی وہی کرتے ہیں جو فوجی حکم دیتے ہیں۔

پولیس والوں نے ڈبے کھولے تو حیرانی سے ان کے منہ کھلے رہ گئے۔ چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں دستی بم اور گولیاں تھیں۔ لمبے ڈبوں میں کلاشنکوفیں اور میگزین تھے۔ ان کے برآمد ہوتے ہی احمد شاہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اگرچہ وہ مجرم نہیں تھا لیکن اس ٹیکسی میں سوار تھا اس لئے قانون کی نظروں میں برابر کا حصے دار تھا۔ فوجی آفیسر نے قریب آ کر ٹیکسی والے کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ رسید کیا۔ "بول .... یہ کس کا ہے؟ کہاں سے لا رہا ہے اور کہاں پہنچانا تھا؟"

آفیسر کا ہاتھ ایک فوجی کا ہاتھ تھا۔ جنہیں تربیت کے دوران ہی اتنا مضبوط اور سخت بنا دیا جاتا ہے کہ پتھر کو ماریں تو اس میں بھی دراڑ پڑ جائے پھر ٹیکسی والے کا منہ تو .... گوشت اور چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ ایک تھپڑ میں ہی ہونٹ پھٹ گیا۔ خون چشمے کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگا۔ کناروں سے بہنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خون صاف کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب' مجھے کیا معلوم جب ہم کسی سواری کو بٹھاتے ہیں تو اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ وہ کیا سامان لے جا رہا ہے۔ ہم صرف سواری کو اس کی منزل تک پہنچانے کا کرایہ لیتے ہیں۔"

احمد شاہ نے گھبرا کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا۔ "یہ .... یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ میرا سامان نہیں ہے۔"

ڈرائیور نے کہا۔ "جناب! خدا سے ڈریں۔ یہ ٹیکسی سواری لے جانے کے لئے ہے۔ یہ سامان لاد کر لے جانے والی سوزوکی یا ٹرک نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسا سامان لے جا رہے ہیں تو آپ کو اپنی ٹیکسی میں کبھی نہ بٹھاتا۔"

پھر دونوں کی باری باری پٹائی شروع ہو گئی۔ دونوں میں سے کوئی اس مال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بالآخر ٹیکسی والے کے ذہن میں ایک بات آئی' اس نے کہا۔ "صاحب! اس طرح تو ہم دونوں یہاں مار کھاتے کھاتے مر جائیں گے اور فیصلہ نہیں ہو پائے گا۔ آپ ڈبوں پر ہاتھ کے نشان دیکھ لیں۔ سچ خود بخود سامنے آ جائے گا۔"

دوسرے دن فنگر پرنٹس کی رپورٹ آئی کہ چند ڈبوں پر احمد شاہ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ یہ وہی ڈبے تھے جنہیں وہ اگلی سیٹ سے اُٹھا کر ڈکی میں رکھنے لے گیا تھا۔ اسے فوجی عدالت میں پیش کرنے سے پہلے تین دن تک تھانے میں رکھا گیا تاکہ پولیس والے اپنے طور پر اس سے یہ معلوم کر لیں کہ وہ کس کے لئے کام کرتا ہے۔ اس نے

اسلحہ کہاں سے اُٹھایا تھا اور کس ٹھکانے پر پہنچانا تھا۔ اس سے اس کا ذاتی پتا ٹھکانا بھی پوچھا گیا۔

پولیس والے انکوائری کے لئے اس کے گھر آئے۔ ساحرہ سے مختلف سوالات کئے' وہ حیران پریشان تھی۔ تھانے آ کر احمد شاہ سے بولی۔ "یہ سب کیا ہے۔ یہ پولیس والے مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟"

احمد شاہ نے کہا۔ "میں خود حیران ہوں کہ بے جرم کیسے پھنس گیا ہوں؟"

وہ قریب ہو کر سرگوشی میں بولی۔ "میں نے دولت مند بننے کے خواب دیکھے تھے۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ تعبیر کے لئے تم ہتھیاروں کا دھندا شروع کر دو۔"

وہ چونک کر بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"زیادہ بھولے نہ بنو میں سب سمجھتی ہوں' تم مجھ پر شک کرتے ہو۔ علم نجوم کے ذریعے کمانے کے لئے مجھے اونچی سوسائٹی میں جانے سے روکتے ہو۔ تم نے مجھے اپنی چار دیواری میں قید رکھنے کے لئے یہ دھندا شروع کیا اور شروع کرتے ہی پکڑ لئے گئے۔"

تھانے والے نے گرج کر پوچھا۔ "اے تم دونوں کیا کھسر پھسر کر رہے ہو؟"

ساحرہ نے کہا۔ "حضور! ہماری شادی کو چار ماہ ہوئے ہیں۔ میں اسے ایک ماہر نجومی سمجھتی تھی۔ اب اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس کا یہ بھیانک روپ میرے سامنے آیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ احمد شاہ آہنی سلاخوں کے پیچھے گم صم سا تھا۔ اس کے ذہن میں وہی سوال پیدا ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا کیوں نہیں ہے؟

اگر دیکھ لیتا تو پہلے سے اس مصیبت کا علم ہو جاتا۔ اگر مصیبت سے پہلے ہی آگاہی ہو جاتی تو وہ بچاؤ کی تدبیر کر سکتا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھ سکتا تھا مگر جو مقدر میں لکھا تھا' وہ ہو چکا تھا پھر یہ کہ کوئی لکیر یہ وارننگ نہیں دیتی کہ خبردار! فلاں وقت کسی ٹیکسی میں نہ بیٹھنا۔ یا واضح طور پر یہ نہیں بتاتی کہ کس طرح ہتھیار فروش کہلائے گا۔

لکیریں تو محض اشارہ دیتی ہیں۔ ان اشاروں کو ستاروں کی چال سے اور اپنے حالات کے سیاق و سباق سے ماہرین نجوم سمجھتے ہیں۔ شاید وہ بھی سمجھ لیتا لیکن ایک لکیر دیکھتا تو اور دوسری لکیریں بھی بہت کچھ بولتیں اور وہ سچ سے ڈرتا تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے' بہت سے لوگ سچ بولتے ہیں' نہ سچ سننا چاہتے ہیں۔ ڈرنے والے کے منہ پر سچ بولو تو

وہ بے عزتی اور غصے سے بھڑک کر بولنے والے کو گولی بھی مار سکتا ہے۔

احمد شاہ کے اندر کے خوف نے اسے ایسی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ آخر فو[illegible] عدالت نے اسے ہتھیار فروش اور دہشت گرد ہونے کے الزام میں سزائے قید سنا دی۔

☆======☆======☆

ساحرہ کی والدہ اور سوتیلے باپ نے فلیٹ چھوڑنے کے بعد نئی کراچی نئی آبادی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ ماں کے پاس آ کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے احمد شاہ کے کرتوت سنانے لگی۔

شبیر نے طنزیہ کہا۔ "میں نہ کہتا تھا۔ ایک سڑک چھاپ نجومی سے رشتہ نہ کر' وہ تیری بیٹی کو برباد کر جائے گا۔ دیکھ چند مہینوں میں ہی اس نے اس کا کیا حلیہ بنا دیا ہے۔ ساری خوبصورتی مرجھا کر رہ گئی ہے۔"

پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جا میری بچی۔ میں تیرا سگا باپ تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی' تجھے اس حال میں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آ گیا ہے۔ تُو حوصلہ رکھ' میں اس نجومی کے بچے کو ایسا سبق پڑھاؤں گا کہ زندگی بھر کسی کا ہاتھ دیکھنا اور زائچہ بنانا بھول جائے گا۔"

ساحرہ نے ماں سے الگ ہٹتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی! مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے پھر سوچتی ہوں کہ اس نے میرے اور ہونے والے بچے کے لئے جلد سے جلد دولت مند ہونے کے لئے ایسا کیا تھا۔ وہ ہمارے لئے اچھا کر رہا تھا مگر خود اس کے لئے بُرا ہو گیا ہے۔"

ہونے والے بچے کی بات سن کر شبیر مرجھا سا گیا۔ اب تو دس ماہ تک انتظار کرنا ہو گا۔ اسے اچھا کھلا پلا کر پھر سے تازہ پھول بنانا ہو گا۔ وہ حقارت سے بولا۔ "اس نے تمہارے ساتھ بھلائی نہیں برائی کی ہے۔ مجھ پر الزام تھا کہ تمہارا سودا کر رہا ہوں۔ اس نے تو کوئی لمبی رقم خرچ کیے بغیر تمہارا سارا لہو نچوڑ لیا ہے۔ کیا لمبی سزا پانے والے قیدی سے دو لاکھ روپے حق مہر وصول کر سکتی ہو؟ اگر ذرا بھی عقل ہے تو اس کی چالبازی سمجھو اور اس پر تھوک کر اس سے طلاق لے لو۔"

وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پھر بولی۔ "میں طلاق نہیں لوں گی مگر اس وقت تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گی جب تک وہ جیل سے نکل کر دولت حاصل کرنے کی راہ پر نہیں چلے گا۔ ویسے تو اس نے راہ نکال لی ہے۔ شاید باہر آتے ہی لمبا ہاتھ مارے گا۔"

احمد شاہ کو اپنی عزت سب سے پیاری تھی۔ اس کی خاطر اس نے ساحرہ کی بات نہیں مانی تھی۔ اپنے ضمیر کا سودا کر کے اسے دولت اور شہرت کا چارا نہیں بنایا تھا۔ اپنی ہونے والی اولاد پر کسی قسم کا داغ نہیں لگوانے کی خاطر اس نے کوئی غلط راہ اختیار نہیں کی تھی' اتفاق سے قسمت کے چکر میں آ کر قیدی ہو گیا تھا۔

ملکی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ سیاسی لوگ دھیرے دھیرے ملک سے باہر کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔ جو جیل میں بند تھے انہیں ایک جیل سے دوسری جیل' ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کیا جا رہا تھا۔ احمد شاہ بھی کراچی سے فیصل آباد پھر وہاں سے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں پہنچ گیا اور چھ برس تک وہاں قید رہا۔ بالآخر برسوں بعد واپس سینٹرل جیل کراچی پہنچ گیا۔ اس عرصے میں کئی بار اس کے اندر یہ آواز گونجتی رہی۔

"اے احمد شاہ دیکھ اپنے ہاتھ کی لکیریں۔ بنا اپنا زائچہ تیرے ساتھ انہونی ہونے والی ہے۔ دیکھ تو دیکھتا کیوں نہیں؟"

"کیا کروں گا دیکھ کر' آگے کا حال جو خدا جانتا ہے وہ نجومی نہیں جان سکتا۔ انسان کا کوئی سا بھی علم یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی بیوی کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے وہ بیٹا ہو گا یا بیٹی؟ خدا عالم الغیب ہے صرف وہی جانتا ہے۔"

ایک دن جب وہ پتھر توڑ کر واپس اپنی بیرک میں آیا تو اسے یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک ملاقاتی کافی دیر سے اس کا منتظر ہے۔ پیغام پہنچانے والے سپاہی نے صرف اتنا کہا کہ ایک شخص ہے لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا اس شخص کے ساتھ اس کی ساحرہ بھی ہو گی اور .... اور اس کا بچہ بھی ہو گا۔"

وہ سپاہی کے ساتھ چلتا ہوا ملاقاتی بیرک میں آیا۔ آہنی جالی کے پاس شبیر محمد کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ اکیلے آئے ہیں۔ میری ساحرہ کہاں ہے اور میرا بچہ؟"

"بچہ نہیں بچی ہوئی تھی۔"

پھر اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر آہنی جالی کے اوپری حصے سے اسے اندر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اس بچی کی تصویر ہے۔"

اس نے تصویر پکڑ لی اور بے اختیار اسے چومنے لگا۔ کبھی سینے سے لگانے لگا پھر بولا۔

"ماشاء اللہ کافی بڑی ہو گئی ہے' کیا نام ہے اس کا؟"

"آسیہ!"

"بہت پیارا نام ہے۔ اسکول جاتی ہو گی؟ میرے بارے میں پوچھتی ہو گی؟"

"نہیں۔ میں نے ساحرہ کو سمجھایا ہے کہ اس بچی کو مجرم باپ کی بیٹی ہونے کے احساس کمتری میں مبتلا نہ کیا جائے۔ اس لئے اسکول میں اس کے باپ کا نام رحمت الٰہی لکھایا گیا ہے۔ میں نے تمہارا نام تمہاری بیٹی کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا ہے۔"

"آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"ساحرہ میرے لئے بلینک چیک تھی۔ میں اسے کسی بھی رئیس زادے سے کیش کروا سکتا تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر کے ساتھ اپنے لئے بھی دولت حاصل کر سکتا تھا لیکن نہ جانے تم کہاں سے بیچ میں آن ٹپکے۔ میری ساری منصوبہ بندی متزلزل ہو کر رہ گئی تھی۔"

وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہوا' آہنی جالی کو مسکراتے ہوئے دیکھا پھر بولنے لگا۔ "خیر وہ تو بھلا ہوا اس وقت کا جس نے تمہیں اپنے چکر میں جکڑ کر مجھے چکر سے باہر نکال دیا۔ میں تمہیں اتنا بتانے آیا ہوں کہ پہلے میرے پاس صرف ایک سوتیلی بیٹی تھی اب سوتیلی نواسی بھی ہے جو چند برسوں میں ماشاء اللہ سے جوان ہو جائے گی پھر.........."

ایک دم سے احمد شاہ کا خون کھول گیا۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔ "شبیر! اگر تم نے اپنی بیٹی کے ساتھ میری بیٹی کو بھی اس دلدل میں گھسیٹا تو میں سچ مچ ایک بڑا جرم کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا اور وہ جرم ہو گا تمہارا قتل۔"

شبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو تم جیل میں ہو۔ ابھی سے دھمکیاں دے رہے ہو۔ پہلے اس قید سے تو آزادی حاصل کر لو پھر میرے مقابلے پر آنا۔ اس وقت دیکھ لیں گے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔"

احمد شاہ .... آہنی جال میں پھنسی ہوئی انگلیوں کو جکڑ کر غصے سے دیکھنے لگا جیسے اپنے اندر لگی آگ کا اظہار کر رہا ہو' کاش یہ درمیان میں نہ ہوتی' ابھی پتا چل جاتا کون کتنے پانی میں ہے۔

شبیر نے اس کی بے بسی پر مسکراتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا پھر اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب کر سلگا لی۔ ایک لمبا گہرا کش لے کر دھواں اس کے چہرے کے سامنے بکھیرتے ہوئے بولا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ اب کے آؤں گا تو تمہاری بیٹی بارہ برس کی ہو چکی ہو گی۔ اس کی تصویر تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔"

برسوں بعد پہلی بار کوئی اس سے ملنے آیا تھا اور اسے بے چین کر گیا تھا۔ اس لئے اسے کسی پل سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس کا دماغ کوئی ایسی ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا جس

کے ذریعے وہ سلاخیں توڑ کر باہر چلا جائے۔ کسی طرح اپنی بیٹی کو شبیر کے چنگل سے نکال کر لے آئے لیکن نہ ہی سلاخیں موم کی تھیں اور نہ ہی جیلر اس کا رشتے دار تھا اس لئے وہ ایسا صرف سوچ سکتا، عمل نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جس بیرک میں تھا وہاں چند ہی دنوں پہلے ایک نوجوان قیدی لایا گیا تھا اسے ایک قتل کے کیس میں عمر قید سنا دی گئی تھی۔ وہ اکثر خاموش رہتا تھا۔ کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ احمد شاہ نے بھی اس سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ایک دن جب اسے اپنی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تو اس کے پاس پہنچ گیا۔ شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اس جیل میں جو بھی آیا ہے، قصوروار یا بے قصور ہوتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔ اس کے اندر کوئی لاوا ضرور پک رہا ہوتا ہے مگر کوئی خوش ہے اور کوئی تمہاری طرح خاموش۔ میں نے بھی خاموش رہ کر دیکھ لیا۔ اب مجھے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ سو تمہارے پاس چلا آیا اگر تم بھی اپنی خاموشی کو وحشت تصور کر کے اسے توڑ دو تو ہو سکتا ہے میں تمہارے کوئی کام آ جاؤں۔"

اس خاموش قیدی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے عمر قید سنائی جا چکی ہے۔ میں عدالت میں، پولیس کے سامنے بہت گڑگڑایا کہ میں قاتل نہیں ہوں مگر سارے ثبوت میرے خلاف تھے پھر تم بھلا کیا کام آ سکتے ہو؟ تم کوئی جادوگر تو ہو نہیں جو مجھے چڑیا یا طوطا بنا کر یہاں سے نکال دو گے یا اس شخص کو کتا بنا کر عدالت میں پیش کر دو گے جس نے میری منگیتر کے بھائی کو قتل کیا جس کے حصے کی سزا میں بھگت رہا ہوں۔"

احمد شاہ کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ آ گئی، اس نے کہا۔ "میں نہ ہی جادوگر ہوں اور نہ ہی جن، میں صرف ایک انسان ہوں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اللہ نے بہت سے علوم سے ہمیں نوازا ہے۔ میں ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اور تاریخ پیدائش سے زائچہ نکال کر قسمت کا حال بتا سکتا ہوں۔ عدالت کا فیصلہ حتمی ہے لیکن مقدر لکھنے والے کا فیصلہ اس پر ضرور حاوی ہوتا ہے۔"

قیدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم مجھے نجومی سے زیادہ ادیب لگ رہے ہو جو الفاظ کے الٹ پھیر سے دن میں بھی خواب دکھانے لگتا ہے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار کر کے چاند پر پہنچا دیتا ہے۔ جو خزاں کے موسم میں بھی رنگ برنگے پھول کھلا دیتا ہے۔"

احمد نے کہا۔ "تم مجھے ادیب کہہ رہے ہو جبکہ تمہارے اندر سے بھی ایک شاعر بول رہا ہے۔ لاؤ اپنا ہاتھ میں دیکھوں اس شاعر کے ہاتھ کی لکیریں کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک اس کے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ باریک سے

باریک لکیر کو پوری توجہ اور یکسوئی سے دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نہ کہتا تھا۔ مقدر کے فیصلے ہماری تمہاری عدالتوں میں نہیں لکھے جاتے۔ اللہ دیر سے انصاف کرتا ہے مگر اندھیر نہیں کرتا۔ اس کی خدائی ایسے ایسے کمالات دکھاتی ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہم معجزہ سمجھ کر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔"

اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے..........."

احمد شاہ نے اس کے فقرے کے مکمل ہونے سے پہلے کہا۔ "اس کا مطلب ذرا ٹھہر کر بتاؤں گا پہلے اپنا، اپنی والدہ کا نام، تاریخ پیدائش، دن اور وقت بتاؤ۔"

جو لوگ باقاعدگی سے ہر سال اپنی سالگرہ کا کیک کاٹتے ہیں انہیں ان کی تاریخ پیدائش کے ساتھ وقت اور دن بھی ازبر ہوتا ہے لیکن جو لوگ اس بکھیڑے میں نہیں پڑتے انہیں ذہن پر زور دے کر یاد کرنا پڑتا ہے۔ قیدی نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور ایک ایک چیز کو ذہن کی صندوقچی سے باہر نکالنے لگا۔

وہ جیسے جیسے بتا رہا تھا احمد شاہ اس کے کوائف کوئلے کی مدد سے فرش پر لکھتا جا رہا تھا۔

پھر اس نے کوائف کے ساتھ ہی بڑا سا چوکور زائچہ بنا لیا اور اس میں مختلف قسم کے حصے بنانے لگا۔ یہ زائچہ نکالنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے ڈبے بنانے کے بعد ان میں ستاروں کو لکھا جاتا ہے جن کے مخصوص نشانات ہوتے ہیں، تب کہیں جا کر زائچہ بھی بولنے لگتا ہے۔

دو تین قیدیوں نے احمد شاہ کو دیکھا تو وہ بھی اشتیاق سے نزدیک آ گئے تھے اور بڑے تجسس سے نجومی کے زائچے کو اور کبھی نجومی کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر تک احمد شاہ سر جھکائے یکسوئی کے ساتھ اپنے علم میں ڈوبا رہا پھر سر اٹھا کر بولنے لگا۔ "مبارک ہو اظہر! یہ مہینہ فروری کا ہے تم اگلے ماہ تک رہائی پا کر چلے جاؤ گے۔"

اظہر نے خوش ہو کر کہا۔ "سچ بتاؤ کیا تم مجھے مسلسل خاموشی سے باہر نکالنے کے لئے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

"نہیں، تم سے میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے اس لئے جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہاری قسمت جو مجھے بتا رہی ہے وہی میں بول رہا ہوں اور ایک خوشخبری اور بھی ہے۔ تمہارے زائچے سے تمہارے گھر کی دہلیز بھی دکھ رہی ہے جہاں سے شہنائی کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ تم دولہا بن کر بارات لے کر جانے والے ہو۔" ذرا فاصلے پر ایک

قیدی لیٹا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ آنکھوں پر تھا۔ دانتوں سے ایک تیلی چبا رہا تھا لیکن کان ان کی طرف تھے' اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے طنزیہ کہا۔

"ابے کیوں بے چارے بھولے بھالے جوان کو بہکا رہا ہے۔ اگر تیرا علم اتنا ہی سچ کہتا ہے تو پھر اتنے برسوں سے تُو یہاں کیوں جھک مار رہا ہے؟ نکال لے اپنے لئے بھی رہائی کا راستہ۔"

اس قیدی نے یہ بات طنزیہ کہی تھی لیکن اس کے دماغ میں پتھر کی طرح لگی اور پھانس کی طرح چبھ کر رہ گئی۔ واقعی وہ اس علم کے ذریعے قیدیوں سے محافظوں تک پھر ان کے افسران تک راستہ بنا سکتا تھا۔ ممکن ہے ان افسروں میں کوئی ایسا مل جائے جو اسے اس چار دیواری سے باہر لے جائے۔ اس طرح وہ بیٹی کے جوان ہونے سے پہلے ہی شبیر کے گریبان تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب اس وقت ممکن تھا جب اس کی جیل کے اندر کی گئی پہلی پیش گوئی سچ ثابت ہوتی۔

علم مثبت ہو تو کبھی منفی نہیں ہوتا۔ اس پر سچائی کے ساتھ پوری ایمانداری سے عمل کرنا پڑتا ہے۔ احمد شاہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اس علم کے پیچھے پڑ گیا تھا اور بالآخر کمال حاصل کر لیا تھا۔ جس طرح حکیم لقمان سے جڑی بوٹیاں باتیں کرتی تھیں اسی طرح احمد شاہ سے ہاتھ کی لکیریں بولتی تھیں۔

دس مارچ کی صبح ہوتے ہی وہ ہو گیا جس کی پیش گوئی احمد شاہ نے کی تھی۔ اظہر کے رہائی کے احکامات لے کر خود جیلر آیا تھا۔ سب قیدی اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

جیلر شہباز ظالم نہیں تھا کہ اس کی آہٹ سن کر ہی قیدیوں کی بند آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بیٹھے ہوئے قیدی ہڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بلکہ وہ خوش طبیعت اور زندہ دل قسم کا انسان تھا۔ سزائے موت پانے والے قیدیوں سے بھی ایسی باتیں کرتا تھا کہ وہ موت کا یقین ہونے کے باوجود زندہ دلی سے ہنسنے لگتے تھے۔ وہ کبھی کسی پر بے جا سختی نہیں کرتا تھا۔ کسی کے ملاقاتی ملے بغیر نہیں جاتے تھے۔ جس کے لئے باہر سے جو چیز جیل میں آتی تھی اس تک پوری ایمانداری سے پہنچ جاتی تھی۔ اس کی انہی عادات کی وجہ سے قیدی اسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے تھے۔

اس نے آتے ہی کہا۔ "اظہر! تمہیں مبارک ہو۔"

اس نے حیرانی سے احمد شاہ کو پھر جیلر کو دیکھا۔ "کیسی مبارک باد جناب!"

"پانچ برس سے تم جس قتل کے الزام میں سزا کاٹ رہے تھے۔ اُس قتل کا اصل مجرم پکڑا گیا ہے۔ اس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے جو تمہارے سر تھوپ دیا گیا تھا۔

اس لئے تم آج سے آزاد ہو۔ یہ دیکھو تمہاری رہائی کا پروانہ۔"

اظہر نے پرچے کو نہیں دیکھا' بے اختیار احمد شاہ سے لپٹ گیا۔ خوشی سے رونے اور اسے چومنے لگا۔

جیلر شہباز نے کہا۔ "تم تو احمد کو ایسے چوم رہے ہو جیسے رہائی اس نے دلائی ہے۔ مجرم کو اس نے پکڑا ہو۔"

اظہر نے کہا۔ "جناب! یہ خوش خبری تو آپ نے اب سنائی ہے جبکہ یہ خوشخبری مجھے پچھلے مہینے ہی احمد شاہ نے سنا دی تھی۔"

"کیا مطلب' میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"جناب! یہ کمال کے دست شناس ہیں۔ جو بولتے ہیں' وہ پتھر کی لکیر کی طرح سچ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا اچھا .... اب باہر آؤ۔ تمہارے گھر والے جیل کے باہر تمہارے منتظر ہیں۔ ساتھ میں تمہارے سسرال والے بھی ہیں جنہوں نے تم پر اپنے بیٹے کے قتل کا الزام لگایا تھا۔"

اظہر جب بیرک سے باہر نکلا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے کسی اپنے سے بچھڑ کر جا رہا ہو۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "دوست! اگر کسی کو باہر کچھ کہلوانا ہے تو مجھے حکم کرو۔"

احمد شاہ نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "نہیں۔ اب مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ تمہاری رہائی نے میرے لئے کامیابی کے راستے کھول دیئے ہیں۔ انشاء اللہ میں بہت جلد باہر آ کر تم سے ملاقات کروں گا۔"

یہ دنیا ایسی ہی ہونی انہونی باتوں پر قائم ہے۔ آدمی جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو بات وہم و گمان میں نہیں ہوتی وہ ایک لمحے میں ہو جاتی ہے۔ اپنے پرائے اور کوئی غیر ایک دم سے اپنا اپنا سا لگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اظہر کے جانے سے اُداس ہو گیا۔ ایک کونے میں جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

یوں تو جیل میں دن اور رات' اُجالے اور اندھیرے سب ایک سے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے مقررہ وقت پر گھڑیال کے ذریعے وقت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

احمد شاہ جب سے جیل کی چار دیواری میں آیا تھا نیند کا وقفہ کم ہوتے ہوتے صرف ڈیڑھ یا دو گھنٹے رہ گیا تھا۔ وہ زیادہ تر جاگتا ہی رہتا تھا۔ جب کوئی قیدی مچھر یا کسی کیڑے کے کاٹے سے جاگتا تھا' احمد شاہ کو جاگتا ہوا پاتا تھا۔ جس قیدی نے اظہر کے زائچے والے

دن اس کا مذاق اڑایا تھا اس کی آنکھ اچانک ایک رات کھل گئی۔ اس نے دیکھا' احمد شاہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے آواز دی۔ "کیا تو جاگ رہا ہے؟"

احمد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا کوئی بیٹھے بیٹھے بھی سو سکتا ہے؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ کیوں نہیں' میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو بس یا لوکل ٹرین کا ہینڈل پکڑے پکڑے سو جاتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ آخری شاپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ نیند ہے ہی ایسی چیز' کہتے ہیں سولی پر بھی آ جاتی ہے۔"

"آتی ہو گی مگر میں اس معاملے میں بدقسمت ہوں۔ خیر چھوڑو تم کیوں پوچھ رہے ہو' کیا کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔ جب سے اظہر باہر گیا ہے۔ میرے اندر کا تجسس بھی بڑھ گیا ہے۔ ہر لمحے دل میں یہ خیال دستک دیتا رہتا ہے کہ میں بھی اپنے بارے میں تجھ سے کچھ معلوم کروں' تیرے علم سے پتا لگاؤں کہ میں کب اس جیل سے باہر نکلوں گا؟"

احمد نے کہا۔ "کمالے! ہاتھ دکھانا بہت آسان ہے لیکن اس کی باتیں سننا اور سن کر برداشت کرنا بہت دل گردے کا کام ہے۔"

"یہ بات تُو نے اظہر سے تو نہیں کی تھی پھر مجھ سے کیوں کہہ رہا ہے؟"

"اظہر کی اور تمہاری طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ اگر لکیریں اس کے خلاف بھی بولتیں تو سن کر برداشت کر جاتا جبکہ تم چند سیکنڈ میں مرنے مارنے پر تُل جاتے ہو۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوا پھر سمجھانے والے انداز میں بولنے لگا۔ "میرے دوست! ہاتھ ایک آئینہ ہے۔ جس میں صورت نہیں کردار نظر آتا ہے۔ اس میں صرف آج کا نہیں' گزارے ہوئے اور آنے والے کل کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھوں میں عمر' صحت' حادثات' پیشے' عادات' ہنرمندی' خوبیاں اور خرابیاں سب کچھ ہوتی ہیں۔ جہاں میں تمہاری دس اچھائیاں بتاؤں گا وہاں ایک آدھ خرابی کا ذکر نہ کرنا علم کے ساتھ ناانصافی ہو گی اور میں یہ جانتا ہوں کہ تم سچ کی کڑواہٹ برداشت نہیں کر سکو گے' فوراً مجھ پر حملہ کرو گے۔"

وہ اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ "میں زیادہ نہیں صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں اولاد کی کتنی لکیریں ہیں؟"

احمد شاہ نے اس کا ہاتھ دیکھا پھر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس معاملے میں ہمیشہ

خوش قسمت رہو گے۔ میری طرح پریشان اور بے چین نہیں رہو گے۔"

کمالے نے کہا۔ "میں ٹھہرا ایک ان پڑھ' جاہل مجھ سے ایسی گھما پھرا کر باتیں نہ کرو۔ واضح الفاظ میں بتاؤ کتنی اولاد ہو گی؟"

"کوئی نہیں۔ تم اس نعمت سے محروم رہو گے۔"

وہ ایک دم سے قہقہہ لگانے لگا جو قیدی گہری نیند سو رہے تھے وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی بھی گھبرا کر دوڑے چلے آئے لیکن اس کا قہقہہ تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "چپ کر۔ کیا پاگل ہو گیا ہے؟"

وہ ایک دم سے رک گیا پھر بولا۔ "صاحب! میں کیا کروں۔ اس نجومی کی اولاد نے بات ہی ایسی کی ہے کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ سالا کہتا ہے' میرے ہاتھ میں اولاد کی لکیر ہی نہیں ہے۔ جبکہ میں ایک چوبیس برس کا بیٹا جیل سے باہر اپنی کوٹھی پر چھوڑ کر آیا ہوں۔"

سب قیدی اور پولیس والے گھور کر احمد شاہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' اس نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ کڑواہٹ تُو برداشت نہیں کر سکے گا۔ میرا علم مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور وہ چیخ چیخ کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیری کوئی اولاد نہ ہے اور نہ ہو گی۔ اگر تُو چوبیس برس کے لڑکے کو اپنا بیٹا کہتا ہے تو یہ تیری غلط فہمی ہے' وہ تیرا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ البتہ تیری بیوی کا بیٹا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

کمالے کے پاؤں کی گرمی سر پر آ گئی۔ احمد شاہ نے درپردہ اس کی بیوی کو بدچلن اور اس کے بیٹے کو حرامی کہہ دیا تھا۔ وہ ایک دم سے اس پر جھپٹ پڑا۔ اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے اُٹھا کر پتھریلی دیوار کی طرف اُچھال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے احمد شاہ کا چہرہ سر سے بہنے والے خون سے رنگ گیا۔

احمد شاہ کی نبض ڈوبنے لگی۔ دو چار قیدیوں نے کمالے کو اور دو تین نے احمد کو سنبھالا۔ پولیس والوں نے جلدی سے بیرک کا دروازہ کھولا' اسے نکال کر باہر لائے۔ دیکھا سر بہت زیادہ پھٹ چکا ہے۔ اسے بند کر کے ٹانکے لگانا ضروری ہو گیا تھا۔ اسے فوراً اُٹھا کر باہر لے گئے جہاں ایمبولینس کھڑی تھی۔ اسے فوراً جیل سے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔

احمد شاہ کے سر پر دس ٹانکے لگے تھے۔ اس کے علاوہ دماغ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر نے سخت تاکید کر دی تھی کہ وہ زخم بھرنے کے بعد بھی تقریباً ایک ہفتہ ہسپتال میں ہی رہے گا۔ ورنہ اس کے پاگل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

یہ بات ڈاکٹروں نے احمد سے نہیں کہی تھی لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ شاید وہ ہونے والی ہے بلکہ رونما ہو گئی ہے۔ وہ یہاں سے صحیح سلامت واپس نہیں جا سکتا۔ اب وہ کبھی اپنی بیٹی کو سسر کے چنگل سے آزاد نہیں کرا سکتا۔

جو وہ سوچتا رہا وہ ہوا نہیں۔ وہ ڈاکٹروں کی کوششوں سے صحت یاب ہو گیا لیکن اپنی تسلی کے لئے آخری چیک اپ کی خاطر اسے ایک دن کے لئے اور روک لیا گیا۔

وہ ہسپتال کے بستر پر لیٹا چھت پر چلنے والے پنکھے کو دیکھ رہا تھا جو اس رفتار سے چل رہا تھا کہ اس پر مکھی بڑی آسانی سے بیٹھ رہی تھی پھر اُڑ رہی تھی۔ اس کی زندگی بھی اسی طرح سست رفتار ہو کر رہ گئی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے لیکن سزا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بیٹی روز بہ روز مشکلات میں گھرتی جا رہی تھی اور وہ دن بہ دن کمزور ہو جا رہا تھا۔

دوسرے دن چیک اَپ کے لئے جانے سے پہلے ہی جیلر شہباز اور دو سپاہی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے فائنل رپورٹ کے ساتھ احمد کو جیلر کے حوالے کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”اگر آپ کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتے ہیں تو جائیں۔ میں تنہائی میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر کے باہر نکلتے ہی جیلر کے ساتھ اندر آنے والا سپاہی بھی باہر نکل کر اپنے ساتھی کے پاس کھڑا ہو گیا تاکہ صاحب کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔

جیلر نے احمد شاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے جیل سے یہاں منتقل ہونے کے بعد میں نے بہت سے قیدیوں سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا تمہارا علم سچا تھا۔ اس بات کی تصدیق کمالے نے بھی کی۔ وہ حقیقت تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن تمہارے بتانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ جس لڑکے کو وہ بیٹا سمجھتا تھا' حقیقت میں وہ اس کی بیوی کا گناہ تھا جو چالبازی اور مکاری سے اس کے نام لکھ دیا گیا تھا۔“

احمد شاہ نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”مجھے معلوم تھا۔ دیر سویر آخر وہ میری باتوں کو تسلیم کر ہی لے گا کیونکہ مجھے اپنے علم پر کامل یقین ہے۔“

جیلر شہباز نے کہا۔ ”اور اب میں بھی اپنے طور پر تمہارے علم کو آزمانا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہو گا۔“

احمد شاہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جیلر نے پھر کہا۔ ”ہاں۔ تم نے وہی سنا جو میں نے کہا۔ یعنی آج کے بعد تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں رہو گے بلکہ میرے ساتھ

میری کوٹھی پر رہو گے۔ میں نے کمشنر صاحب سے تمہارے لئے خصوصی اجازت نامہ لے لیا ہے۔ اگر تمہارے علم سے مجھے ناقابلِ یقین حقائق معلوم ہوں گے یا مجھے زبردست قسم کا فائدہ پہنچے گا تو میں تمہاری باقی سزا بھی معاف کرا دوں گا۔ یوں بھی تم جب تک میرے پاس رہو گے خود کو آزاد اور میرا مہمان تصور کرنا۔ میری کوٹھی کے احاطے میں تمہیں ہر قسم کی آسائش و آرام ملے گا۔“

جیلر بول رہا تھا اور احمد شاہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ یہ دنیا' اس میں بسنے والے لوگ آخر کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے بڑی مہارت اور چالبازی سے مجھے مجرم ثابت کر دیا اور جیل کی دیوار کے پیچھے بھیج دیا جبکہ دوسرا اپنی خودغرضی سے اسے قید سے آزادی کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہ آزادی کی نوید واقعی اس کے حق میں بہتر تھی' وہ بڑی آسانی سے بیٹی تک پہنچنے کی راہ ہموار کر سکتا تھا۔ اسے اپنے پاس لا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رکھ سکتا تھا۔ آخر اس کا سگا باپ تھا۔ شبیر محمد کے سازش کرنے سے باپ بیٹی کا رشتہ نہیں بدلے گا۔

”کہاں کھو گئے؟“

جیلر کی آواز پر اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کہیں نہیں۔ بس ایک بات ذہن میں آ گئی تھی۔ آپ مجھ پر اتنا بھروسا کر رہے ہیں اگر میں آپ کی کوٹھی سے بھاگ گیا تو..........؟“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو' میں بے وقوف ہوں۔ جیلر کی حیثیت سے مجھے بیس برس ہو گئے ہیں۔ جب کوئی قیدی پہلی بار میرے روبرو آتا ہے تو میں اسے اسی وقت پہچان جاتا ہوں کہ وہ حقیقتاً جرم کر کے آیا ہے یا پھنسایا گیا ہے۔“

”تو پھر آپ بے قصور کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ہمیں بہرصورت عدالت کے فیصلے کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ البتہ جہاں تک میرے اختیار میں ہوتا ہے میں بے قصور آنے والے کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کرتا ہوں۔ جیسے تمہارے ساتھ اب تک کرتا آیا ہوں۔“

پھر اس نے ٹیبل پر رکھی بزر بجائی۔ ایک سپاہی دروازہ کھول کر اندر آیا۔ ”جی صاحب!“

”جیپ میں ایک نیا جوڑا رکھا ہوا ہے' اسے لے آؤ۔“

وہ تھوڑی سی دیر میں کپڑے لے کر آ گیا۔ جیلر نے احمد شاہ سے کہا۔ ”میں جا کر گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں۔ تم کپڑے بدل کر پولیس والوں کے ساتھ آ جانا۔“

وہ دو سپاہیوں کے درمیان جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور گردن گھما کر چاروں طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے صدیوں بعد دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہو۔ رنگ برنگی عمارتیں، قیمتی شیشے لگے بڑے بڑے شوروم ان کے باہر لگے بڑے بڑے سائن بورڈ، قیمتی چم چم کرتی موٹر گاڑیاں اور ہنستے بولتے لوگ ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ جیل کی کوٹھری میں آنکھیں بند کئے رہائی کے خواب دیکھ رہا ہو۔

جیپ چلتے چلتے رک گئی، آگے ٹریفک جام تھا۔ دوسری طرف کی سڑک رکی ہوئی گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک جانب ٹھہر سی گئیں۔ جس پر اس کی نظریں جمی تھیں وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا کیونکہ اس سے اس کا اندھیرے اور اُجالے کا تعلق تھا۔ وہ اس کی بیٹی آسیہ کی ماں ساحر تھی لیکن اس وقت کسی امیرزادے کے ساتھ تھی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر کھلکھلاتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل میں آیا، وہ اسی وقت جیپ سے کود جائے اور اسے اس بے حیائی سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ اس قیمتی گاڑی کو دونوں کا تابوت بنا دے۔

آدمی کا ہر عمل جذبات کی پیداوار ہوتا ہے۔ جو لوگ کچھ کرنے سے پہلے سوچنے لگتے ہیں وہ کبھی کامیابی سے کچھ نہیں کر پاتے خواہ وہ جرم ہو۔ وہ بھی کرنے اور نہ کرنے کے بیچ اُلجھ کر رہ گیا۔ اس دوران ٹریفک سگنل کی لائٹ تبدیل ہوئی اور اس کی جیپ آگے بڑھ گئی۔ وہ گردن گھما کر دور تک اس گاڑی کو دیکھتا رہا پھر موڑ کاٹتے ہی ہر چیز خواب کی طرح اوجھل ہو گئی۔

☆======☆======☆

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ دو کرسیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر شیڈ والا لیمپ روشن تھا۔ جس کی روشنی میں صرف ان دونوں کے ہاتھ نمایاں تھے۔ باقی وہ لیمپ شیڈ کی وجہ سے سائے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے کی دوسری چیزیں بھی مدھم سی نظر آ رہی تھیں۔

احمد نے بڑی دیر تک جیلر شہباز کے ہاتھوں کی لکیروں کا بغور معائنہ کیا پھر ہاتھ کے قریب رکھی ڈائری کھولی۔ کورے صفحے پر زائچہ بنانے لگا۔ جیلر تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

احمد نے زائچہ مکمل کرنے کے بعد قلم رکھتے ہوئے کہا۔ "جیلر صاحب!........."

مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی شہباز نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "جیلر نہیں۔ شہباز کہو کیونکہ

اس وقت تم میرے اصل نام سے زائچہ بنا رہے ہو۔"

احمد شاہ کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ آ گئی۔ "جی بہتر، تو میں کہہ رہا تھا کہ لکیریں آپ کی موجودہ ملازمت کی نفی کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ بننا کچھ چاہتے تھے اور بن کچھ اور گئے ہیں۔ آپ کا ارادہ ہرگز پولیس میں آنے کا نہیں تھا مگر مجبوری یا کسی اور وجہ سے اس پیشے کو اپنانا پڑا۔"

شہباز نے غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھا۔ "واقعی! تمہارے علم میں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ تم نے اپنی پہلی ہی رائے سے مجھے چونکا دیا ہے۔"

"تو پھر میرا علم یہی کہتا ہے کہ آپ واپس اسی ڈگر پر چل پڑیں۔ چھوڑیں اس سرکاری ملازمت کو۔"

شہباز نے کہا۔ "تم عجیب آدمی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسی ملازمت کی بدولت تم قیدی ہو کر بھی میرے پاس آزادی سے بیٹھے ہو اور کہہ رہے ہو کہ میں یہ ملازمت چھوڑ دوں، اس طرح تو تم.........."

"آپ نے مجھ سے اپنی لکیروں کے بارے میں پوچھا ہے تو میں وہی بتا رہا ہوں۔ میرا علم مجھے اسی سچائی اور بے غرضی کی اجازت دیتا ہے۔ میرا کیا ہو گا، یہ اللہ جانتا ہے۔ اگر مجھے ایسے ہی آزادی سے گزارنا ہے تو پھر آپ کا ملازمت پر ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

شہباز نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "اچھا چھوڑو، جب اتنا سمجھ رہے ہو، بتا رہے ہو تو یہ بھی میری لکیروں نے بتا دیا ہو گا کہ میں کس شعبے میں تھا اور کیا اب مجھے اسی میں واپس جانا چاہئے؟"

"آپ کے دماغ کی لکیر مشتری کے مرکز سے نکلتی ہے اور مشتری کا اُبھار بھی صحت مند ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ کے اندر عزائم پسندی، وقار اور قائدانہ صلاحیت موجود ہے اور یہ تینوں باتیں سیاست کا پتا دیتی ہیں۔ یقیناً ماضی میں آپ سیاست سے وابستہ رہے ہیں۔"

جیلر نے خوشی سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "بالکل درست۔"

"تو پھر آپ اسی طرف لوٹ جائیں۔ چھوڑیں اس ملازمت کو۔ ایک بہت بڑی کامیابی آپ کی منتظر ہے۔ آج آپ جیلر ہیں، کل کئی جیلر آپ کے تابع فرمان ہوں گے۔"

احمد شاہ نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک ماہر ڈاکٹر کی طرف زندگی کے اُتار چڑھاؤ بتانے لگا۔ ان باتوں سے ہوشیار کرنے لگا جو اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ شہباز کو مستقبل میں دور تک دکھانے لگا۔ وہ اسمبلی کا ممبر بن چکا ہے۔ اس کے ارد گرد پارٹی ورکروں کا ہجوم ہے۔ وہ اس کے نام کے نعرے لگا رہے ہیں اور وہ ہاتھ اٹھا کر ان کے نعروں کا جواب دے رہا ہے۔

آدمی کتنا ہی حقیقت پسند ہو' اپنی محنت اور صلاحیتوں پر بھروسا کرنے والا ہو لیکن جہاں مستقبل کی آگاہی کی بات آتی ہے وہاں نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر سوچنے لگتا ہے۔ جیلر شہباز بھی ایک حقیقت پسند تھا۔ احمد شاہ کی صلاحیتوں سے بھی اسے انکار نہیں تھا لیکن وہ اس کے کہنے سے ایک دم سے اپنی زندگی کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اسے احمد شاہ کی علمی سچائی کا مزید ثبوت چاہئے تھا۔ اس کے لئے اس نے سوچا کہ اس کی جیل میں ہزاروں قیدی ہیں۔ بے قصور سے لے کر خطرناک مجرم تک۔ چھ ماہ کی قید سے لے کر پھانسی کی سزا پانے والے تک۔ لہٰذا کیوں نہ ان میں سے کچھ قیدیوں کے ذاتی حالات معلوم کئے جائیں۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر ان میں سے بہت سوں کی فائلیں احمد شاہ کے کمرے میں لا کر رکھ دیں اور کہا۔ "ابھی صوبائی یا قومی الیکشن کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔ تمہارے اور میرے پاس بہت وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس عرصے میں چند قیدیوں کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہے' انہیں کال کوٹھری میں بند کر کے دوسرے قیدیوں سے الگ کر دیا گیا ہے۔"

احمد شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جیلر صاحب! آپ کی لکیر کی ایک خوبی شاید میں بتانا بھول گیا تھا کہ آپ آنکھ بند کر کے کسی کی بات پر اعتماد نہیں کرتے۔ جب تک اپنے طور پر آزما نہ لیں۔ مجھے یقین ہے' آپ قائل ہو جائیں گے۔"

احمد شاہ نے سب سے پہلے ان قیدیوں کی فائل اُٹھائی جنہیں پھانسی کی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ ان کی تعداد دس تھی۔ ان فائلوں میں قیدیوں کے تمام کوائف موجود تھے جن میں تاریخ پیدائش' وقت پیدائش' مقام پیدائش' ماں کا نام وغیرہ اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کے پرنٹ بھی موجود تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات ان پر کام کرتا رہا۔ دوسری صبح چونکا دینے والے انکشافات کے ساتھ جیلر کے سامنے پہنچ گیا۔ "شہباز صاحب! ان دس پھانسی کے مجرموں میں سے صرف چار کو پھانسی لگ سکے گی۔"

"باقی چھ' کیا وہ بچ جائیں گے؟"

"نہیں۔ مجھے ان کی زندگیوں میں بھی اندھیرا ہی دکھائی دے رہا ہے لیکن وہ کس

طرح مریں گے یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں نہیں بتا سکے؟"

"اس لئے کہ حادثہ صرف وہ نہیں ہوتا جسے ہم سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات آدمی ہلکی سی ٹھوکر کھاتا ہے اور گر کر مر جاتا ہے۔ وہ بھی حادثہ ہوتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے ان کی کڑی نگرانی کی جائے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔ اگر میں کہوں کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق میں پھنس کر موت کا باعث بن سکتا ہے تو کیا آپ اس مجرم کو پانی نہیں پلائیں گے؟"

"تو پھر تم ہی بتاؤ انہیں پھانسی کی موت نہیں ملے گی تو وہ کیا جیل کے عملے کی غفلت سے..........."

احمد شاہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "ان کی یہ موت قدرت نے لکھی ہے اور قدرت کے فیصلوں پر ہم انسانوں کا اختیار نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں ہے تو جو ہو سکتا ہے کر کے دیکھ لیں۔"

جیلر شہباز کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اسے شاہ کی باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن اب تک کی سچائی سے آنکھیں بند کر لینا بھی دانائی نہیں تھی۔

دوسری صبح جب وہ ہنگامی طور پر جیل پہنچا تو یہ منحوس خبر اس کی منتظر تھی کہ تین قیدی سانپوں کے ڈسنے سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ سانپ کال کوٹھری تک پہنچے کیسے لیکن جیلر کے دماغ میں صرف احمد شاہ بول رہا تھا۔ "مقدر کے لکھے پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے ماتحت افسروں پر گرج رہا تھا اور سپاہیوں پر برس رہا تھا۔ ان سے پوچھ رہا تھا۔ یہ ناممکن بات کیسے ہو گئی؟ ہم اعلیٰ حکام کو کیا جواب دیں گے کہ کال کوٹھری میں سانپ کیسے پہنچ گئے۔ جبکہ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اطراف میں نہ سپیروں کی بستی ہے' نہ سانپوں کا مسکن ہے۔"

وہ گرجتا ہوا اپنے دفتر میں آیا۔ اس کے ماتحت جیلر نے کہا۔ "جناب! آپ غصے میں ہیں۔ اگر آپ سننا چاہیں تو میں کچھ عرض کروں؟"

"بولو۔ میں سن رہا ہوں۔"

"سر! جب ان تینوں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تو ان کا دشمن زمیندار کہہ رہا تھا کہ اسے یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔ میں اپنے دشمنوں سے خود انتقام لوں گا تو کلیجہ ٹھنڈا ہو

گا۔"

شہباز نے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس زمیندار نے خود انتقام لینے کے لئے وہ سانپ یہاں پہنچائے تھے؟"

"بالکل یہی بات ہے سر! لیکن ہم اس کے خلاف ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔"

"ثبوت کی ایسی کی تیسی۔ وہ میری جیل کی کال کوٹھریوں میں کیسے سانپوں کو پہنچا سکتا ہے؟"

"آپ خوب سمجھتے ہیں سر! جب یہاں کے قیدیوں کے پاس باہر سے چرس اور ہیروئن آ سکتی ہے' ڈرگ مافیا کا کوئی بڑا قیدی یہاں مجرا کرا سکتا ہے تو سانپ کیوں نہیں آ سکتے؟"

جیلر شہباز نے ایک لمبی سانس چھوڑی جیسے سوڈا واٹر گیس اُبال میں آتے ہی بیٹھ گئی ہو۔

جن قیدیوں کے بارے میں پھانسی ہو جانے کی تصدیق احمد شاہ نے کر دی تھی ان کے علاوہ باقی تین رہ گئے تھے۔ ان کے لئے سخت حفاظتی انتظامات کر دیئے گئے۔ انہیں ایسی کوٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں چیونٹی تک کا راستہ نہیں تھا۔

پھانسی سے ٹھیک تین روز پہلے ایک قیدی کو کھاتے ہوئے ٹھسکا لگا۔ اس نے جلدی سے پانی پیا اور ضرورت سے زیادہ ہی گھونٹ بھر لیا۔ پانی ناک کے راستے دماغ کی طرف چڑھ گیا۔ کھانستے کھانستے ایک دم سے اس کی سانس رک گئی پھر ڈاکٹر کے پہنچنے تک وہ موت کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

جب چوتھے قیدی کی موت کی خبر جیلر نے احمد شاہ کو سنائی تو اسے افسوس کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ اس کا علم پہلے سے زیادہ سچ بولنے لگا ہے۔ اس نے کہا۔ "شہباز صاحب! آپ یقیناً پریشانی میں گھر گئے ہوں گے۔ کاش! آپ مجھ سے یہ معلومات حاصل نہ کرتے کیونکہ جو بات انجانے میں ہوتی ہے وہ وقتی طور پر پریشان کرتی ہے اور جو پہلے سے معلوم ہو جاتی ہے وہ لمحہ لمحہ بے چین کرتی رہتی ہے۔"

جیلر نے کہا۔ "باقی جتنی بھی فائلیں ہیں' مجھے واپس کر دو۔ مجھے تمہارے علم پر پورا یقین آ گیا ہے۔ اس نے مجھے کسی حد تک خوف زدہ بھی کر دیا ہے۔ اب جب تک ان قیدیوں کی موت واقع نہیں ہو گی میں اسی طرح بے چین رہوں گا۔ ہر پل ان کا دھیان مجھے پریشان کرتا رہے گا' سوتے میں جگاتا رہے گا۔"

جیلر شہباز کو کسی حد تک سکون ہونے لگا تھا کہ احمد شاہ کی دو قیدیوں کے بارے میں

پیش گوئی غلط ثابت ہو رہی ہے کیونکہ دوسری صبح پھانسی کا وقت مقرر تھا۔ ان میں سے ایک قیدی نے پھانسی سے پہلے شیو کی اجازت مانگی۔ اس کے لئے حجام کو بلایا گیا۔ جیلر سامنے ہی بیٹھ کر اس کی شیو بنوانے لگا تاکہ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے لیکن جیسے ہی حجام کا تیز دھار والا اُسترا قیدی کے نرخرے پر آیا اس نے پوری قوت سے اپنی گردن کو جھٹکا دے کر اُسترے کو وہیں دبا دیا۔ وہ اندر تک اُتر گیا۔ حجام نے گھبرا کر اُسترا کھینچا تو وہ اور بھی کاٹتا چلا گیا۔ جیلر بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے ہی قیدی فرش پر گر کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور چند ہی لمحوں میں ساکت ہو گیا۔ شہباز جیلر سر پکڑ کر دھپ سے کرسی پر گر پڑا۔

یوں خودکشی کرنے والے کے ایک سگے بھائی نے وہاں سے اس کی لاش لے جاتے ہوئے بتایا کہ اس کے دشمن نے قسم کھائی تھی کہ اسے پھانسی کے پھندے میں لٹکا کر رہے گا۔ جب عدالت نے پھانسی کا حکم سنایا تو قیدی نے اپنے دشمن جابر خان سے کہا۔ "مجھ سے شرط لگاؤ' میں پھانسی پر نہیں چڑھوں گا۔ تمہاری خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔"

جابر خان نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم میں مرد کا بچہ ہوں۔ جو کہتا ہوں کر دکھاتا ہوں۔ میں نے تجھے پھانسی کے پھندے سے لٹکانے کی قسم کھائی تھی۔ وہ پوری ہونے والی ہے۔"

"اور اگر پوری نہ ہوئی تو؟"

"تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اپنی ہی گن سے خودکشی کر لوں گا۔"

اس قیدی نے اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ پھانسی کے پھندے سے لٹکنے نہیں گیا۔ اس سے پہلے ہی جان دے دی۔

دوسرے دن پتا چلا کہ جابر خان نے خودکشی کر کے خود کو مرد کا بچہ ثابت کر دیا ہے۔

پانچوں قیدیوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پھانسی دی جانے والی تھی۔ انہیں سیاہ لباس پہنا کر تختۂ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ایک طرف جیلر شہباز اور دوسرے پولیس آفیسرز کھڑے تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹرز کی ایک ٹیم تھی جو پھانسی دینے کے بعد قیدیوں کی موت کی تصدیق کرنے والے تھے۔

پانچوں قیدیوں کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک قیدی پھر دوسرا' تیسرا۔ ایک کے پیچھے ایک قیدی سیڑھیوں سے گزر کر تختۂ دار پر چڑھنے لگے۔ آخری قیدی سے پہلے والا قیدی تیسرے پائیدان پر قدم رکھتے ہی لڑکھڑا

گیا۔ اپنے سے پیچھے والے قیدی پر اس طرح گرا کہ دونوں ہی تقریباً ڈھائی فٹ کی اونچائی سے ایک ساتھ فرش پر آ گئے۔ دور کھڑے ہوئے دو سپاہی دوڑ کر آئے۔ لڑکھڑانے والا قیدی تو خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن جس پر گرا تھا وہ اسی طرح اوندھے منہ پڑا رہا۔ سپاہیوں نے دونوں طرف سے اسے پکڑ کر اُٹھایا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ ایک سپاہی نے آواز دی۔ "صاحب! یہ تو گیا۔"

جیلر شہباز ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر بھی اس کی طرف بھاگے۔ اس کی نبض دیکھی۔ اسٹیتھوسکوپ سے دھڑکنیں سننے کی کوشش کی لیکن خاموشی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ "سوری۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔"

جب شام کو جیلر گھر پہنچا تو خاموش تھا۔ اس نے دو دن کی چھٹی لے لی تھی اور کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہاں تک کہ احمد شاہ سے بھی ملاقات نہیں کی۔ صرف ملازم اس کی گھنٹی پر کمرے میں جاتا تھا۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی دے کر واپس آ جاتا تھا۔

تیسرے دن اس نے احمد شاہ کو اپنے کمرے میں بلوایا پھر کہا۔ "میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ میں اپنے استعفے کی درخواست کمشنر صاحب کو پیش کرنے والا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ میری پیش گوئی کے مطابق چھ قیدی پھانسی سے پہلے ہی مر گئے؟"

"ہاں لیکن وہ مر کر یہ ثابت کر گئے کہ تم بہت ماہر نجومی ہو۔ مجھے صرف تم پر بھروسا ہی نہیں بلکہ میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا بھی چاہتا ہوں جو کہ استعفے کے بعد..........."

شہباز بولتے بولتے رک گیا۔ کچھ باتیں آدمی کو اپنے آپ سے بھی چھپانی پڑتی ہیں' احمد شاہ تو پھر ایک قیدی تھا۔ شہباز نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "کل میں تمہاری سزا معاف کروانے کے لئے بھی کمشنر صاحب سے بات کروں گا۔ آگے تمہاری قسمت!"

اس کے اندر پھر وہی آواز گونجنے لگی۔ "دیکھ احمد شاہ دیکھ' اپنا ہاتھ دیکھ' دیکھ تیری قسمت کیا کہہ رہی ہے۔ اپنا زائچہ بنا کر دیکھ تیرے ساتھ کوئی انہونی ہونے والی ہے' تُو دیکھتا کیوں نہیں ہے؟"

اس نے اندر کی آواز کو کچلتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی کریں گے جیسی میری قسمت ہو گی۔ البتہ آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا۔ مکمل طور پر میرے ذہنی سکون کے لئے' میری ایک پریشانی دور کرنی ہو گی۔"

"کیوں نہیں۔ تم میرے لئے اتنا کچھ کرو گے تو کیا میں تمہارے کام نہیں آؤں گا۔

تمہاری ہر خواہش منہ سے نکلتے ہی پوری کر دی جائے گی۔ بولو' کیا چاہیے؟"

"مجھے میری بیٹی چاہیے۔"

"بیٹی.......... کہاں رہتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"جب تمہیں اس کا پتا ٹھکانا نہیں معلوم تو پھر میں کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں؟"

"آپ جیلر ہیں۔ شہر کے ہر علاقے کے تھانیدار آپ کے واقف کار ہیں۔ آپ آسانی سے پتا لگا سکتے ہیں۔"

"کس کے پاس رہتی ہے؟"

"اپنی ماں اور سوتیلے نانا کے پاس۔"

"نانا کیا کرتا ہے؟"

وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ وہ اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ ایک سوتیلا باپ اپنی بیٹی سے دھندا کراتا ہے اور اپنی نواسی یعنی اس کی بیٹی کو بھی اس راہ پر لانا چاہتا ہے۔

اسے خاموش دیکھ کر جیلر نے کہا۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تمہارا سوتیلا سسر اچھے کردار کا نہیں ہے؟"

"جی' جی ہاں۔"

"تو پھر صرف نام بتا دو۔ چوبیس گھنٹے میں اس کا پتا چل جائے گا۔"

"شبیر محمد۔ جب میں گرفتار ہوا تھا اس وقت وہ نئی کراچی کے علاقے میں رہتا تھا۔ پھر چند برس پہلے مجھ سے ملنے جیل آیا تھا تو اس وقت اس نے بتایا کہ وہ اپنی رہائش بدل چکا ہے۔ اس نے کہیں اور مکان لے لیا ہے۔"

پھر اسے یاد آیا اس وقت شبیر نے اسے بیٹی کی ایک تصویر بھی دی تھی لیکن جن حالات سے وہ گزر کر وہاں تک پہنچا تھا نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کی واضح نشانی بتا سکتا ہوں۔ اس کی آنکھیں بھوری ہیں۔ ہونٹ اور ٹھوڑی کے بیچ سیاہ تل ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ میری ذمے داری ہے۔ اس بات سے بے فکر ہو جاؤ۔ میرے مستقبل پر نظر رکھو۔ یہ معلوم کرو کہ مجھے کس سطح کا الیکشن لڑنا چاہیے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کی سطح بہت اونچی ہے۔ صوبائی یا قومی سطح پر آئیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے علم پر شک نہیں ہے لیکن ایسا اس وقت

سوچا جائے گا جب ہمارے ملک میں جمہوریت کی ہوا چلے گی' فی الحال تو..........."

احمد شاہ نے کہا۔ "میں جہاں تک دیکھ چکا ہوں وہاں تک آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ جس طرح ایک شخص کے جملہ کوائف لے کر زائچہ نکالا جاتا ہے اسی طرح ملکی حالات کے تقاضے دیکھ کر بھی ملک کے مستقبل کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔"

"تو کیا..........؟"

"جی ہاں۔ حالات اچانک ہی کروٹ لینے والے ہیں۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے ذہن کو قومی سطح پر رکھ کر دیکھیں۔ اسمبلی کی سیٹ آپ کے لئے محفوظ ہو چکی ہے۔ اسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔"

جیلر شہباز کے اثر و رسوخ نے بجلی کی سی تیزی سے کام دکھایا۔ چوبیس گھنٹے سے پہلے پہلے ہر علاقے کے تھانے سے فون آنا شروع ہو گئے کہ انہوں نے اپنے اپنے علاقے کے تمام شبیر محمد نامی اشخاص کو پکڑ لیا ہے جو بھی ماضی میں یا حال میں مجرمانہ زندگی سے وابستہ رہا ہے لیکن ہر ایک کا کہنا یہی ہے کہ وہ احمد شاہ نامی شخص کو نہیں جانتے ہیں اور نہ ہی کسی رحمت الٰہی کو جانتے ہیں جو کسی آسیہ کا باپ ہے۔

اس رات احمد شاہ' جیلر کے ساتھ مختلف علاقوں کے تھانے میں گیا۔ ایک ایک شبیر کو دیکھ اور مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ کیونکہ ان میں وہ نہیں تھا جو اس کا سوتیلا سسر اور بیٹی کا سوتیلا نانا تھا۔ اس نے جیلر سے کہا۔ "شہباز صاحب! جس دن میں آپ کے ساتھ ہسپتال سے آ رہا تھا اس دن ایک گاڑی میں مجھے اپنی بیوی دکھائی دی تھی۔"

"تو پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں' میں اسی وقت..........."

"اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میرے اور آپ کے درمیان اتنا اعتماد پیدا ہو گا۔ یوں بھی قیدی تھا' آپ میری بات کو ٹال سکتے تھے۔ اتنی جان پہچان تو ہوتے ہوتے ہوئی ہے۔"

"چلو اب کیا کریں؟"

"مجھے لگتا ہے وہ اسی شہر میں ہے۔ ممکن ہے اس نے خود کو چھپانے کے لئے نام بدل لیا ہو؟"

"ہاں یہ ممکن ہے۔ اب تو اس کا حل یہی ہے کہ تمہارا اور اس کا کسی روز سامنا ہو جائے۔"

جس روز جیلر شہباز کا استعفیٰ منظور ہوا اسی دن ملک میں ہنگامی تبدیلی آ گئی۔ جمہوری حکومت کے لئے سیاسی پارٹیاں میدان میں آ گئیں۔ جو سیاسی لیڈر اور کارکن

ملک سے باہر تھے وہ واپس آنے لگے۔ جیلوں میں قید رہنے والے سیاسی لوگ رہا ہونے لگے۔ سیاسی لوگوں کی لسٹ میں ایسے قیدی بھی شامل تھے جو دہشت گردی کے جرم میں فوجی عدالت سے سزا یافتہ تھے۔ ان میں احمد شاہ کا نام بھی شامل تھا۔

احمد شاہ کے لئے جیسے خوشی کا دن تھا۔ وہ اب آزادی کے ساتھ اپنی بیٹی کو تلاش کر سکتا تھا۔ شبیر محمد کو اس کے ناپاک ارادوں کی سزا دے سکتا تھا لیکن سابق جیلر شہباز نے اسے روک دیا اور کہا۔ "احمد شاہ! یہ ٹھیک ہے کہ تم آزاد ہو گئے ہو۔ اب میرے پابند نہیں رہے۔ تم اپنی مرضی سے کہیں بھی رہ سکتے ہو مگر میری خواہش یہی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور میرے کام آؤ اور میں تمہارے کام آؤں۔ تم سیاست میں میرے معاون بن جاؤ اور میں تمہاری بیٹی کی تلاش میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔ تم جس علاقے میں بھی جاؤ گے وہاں کا تھانیدار تمہاری مدد کے لئے حاضر رہے گا۔"

یہ دنیا انہی اصولوں پر چل رہی ہے۔ ہم کسی کو کچھ دیتے ہیں تو جواب میں وہ ہمیں کچھ دیتا ہے۔ آدمی آدمی کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ احمد شاہ نے کہا۔ "شہباز صاحب! مجھے آپ کی پیشکش قبول ہے۔"

احمد شاہ دن بھر پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا لیکن کہیں سے شبیر کا اور ساحرہ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس نے سیٹھ سلطان کی کزن وغیرہ سے بھی ساحرہ کے بارے میں پوچھا مگر سب لاعلم تھے۔ ایسا لگتا تھا انہیں آسمان نے اُٹھا لیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔

ہفتے مہینوں میں کیسے بدل گئے' اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اس عرصے میں قومی اور صوبائی الیکشن کے بارے میں مختلف بیانات چھپنے لگے۔ اس نے شہباز کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "صاحب! اس وقت کسی بھی سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا آپ کے لئے ٹھیک نہیں کیونکہ آپ کا زائچہ تو کامیابی کی نشاندہی کر رہا ہے لیکن اکثر آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی ہار آپ کی جیت کو بھی لے ڈوبے۔ آپ کامیاب ہونے کے باوجود ہارنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہوں کیونکہ وہ بھی سیٹ اسمبلی ہی میں ہوتی ہے۔ صرف حصہ بدل جاتا ہے۔ آدمی دائیں سے بائیں چلا جاتا ہے۔"

"پھر تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑیں جو پارٹی ظاہری اکثریت میں ہو اس کے ساتھ مل جائیں۔ سیاست کا اصول بھی یہی ہے' ہوا جس رُخ چلے آپ بھی اسی رُخ چل پڑیں۔"

شہباز نے احمد شاہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے کاغذاتِ نامزدگی آزاد

امیدوار کی حیثیت سے جمع کروا دیئے۔

چند دنوں تک انتخابی قانونی کارروائی ہوتی رہی پھر انتخابی نشانات امیدواروں کو دے دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی نعرے اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ انتخابی جلسے جلوس ہونے لگے۔ شہباز بھی انتخابی مہم میں مصروف ہو گیا۔ احمد شاہ نے اس کا بھرپور ساتھ دینے کے ساتھ دشمن کی بھی تلاش جاری رکھی۔ وہ شہباز کے ساتھ جس جلسے میں بھی جاتا تھا مجمع پر خاص نظر رکھتا تھا۔ شاید شبیر اچانک ہی نظر آ جائے یا اس کی شباہت کا کوئی شخص دکھائی دے جائے جس کی تصویر تھانیداروں کو دکھا کر بتایا جا سکے کہ اس سے ملتا جلتا جو بھی شخص دکھائی دے اسے حراست میں لے لیں لیکن ناکامی جیسے اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ اس مقدر میں جو ہاتھ کی لکیروں میں موجود تھا مگر وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ نہیں مل رہی تھی تو بھی ہاتھ کی لکیر یا کاتب تقدیر کا منشا تھا۔ کاتب تقدیر کو منظور ہو گا تو لکیر کو دیکھے بغیر بیٹی مل جائے گی۔

بالآخر انتخابی مہم کا زور ٹوٹ گیا۔ ووٹ پڑنے سے پہلے ہی ہر طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔ شہباز اور احمد شاہ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا فون کے پاس آ گیا۔ ریسیور اٹھا کر دوسری طرف کی آواز سنی پھر احمد شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کا فون ہے' کوئی شبیر........"

احمد کے لئے شبیر نام ہی کافی تھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور لے لیا۔ "بولو تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اتنی بھی جلدی کیا ہے' احمد شاہ! ابھی تمہاری بیٹی کو جوان ہونے میں پورے دو برس باقی ہیں۔"

"بکواس نہیں کرو۔ اپنا پتا بتاؤ۔"

شبیر نے قہقہہ لگایا۔ "ہاہا........ ہا! کیوں شہر کے تھانیداروں سے نہیں پتا چل سکا۔ ظاہر ہے اگر میں شہر میں ہوتا تو پتا چلتا نا۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں' میں اس وقت بھی کسی اور شہر سے بول رہا ہوں۔"

احمد شاہ نے چیختے ہوئے کہا۔ "کمینے' حرام زادے' تیری آواز ہی کافی ہے۔ دیکھ' میں چند ہی منٹوں میں تجھ تک کیسے پہنچتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ جس طرح بلی اپنے بچوں کی آنکھیں کھلنے تک سات گھر گھماتی ہے اسی طرح میں تیری بیٹی کو جوان ہونے تک سات شہروں میں گھماؤں گا۔ ان کا رنگ دکھا کر اس کی طبیعت میں ایسی رنگینی بھر دوں گا کہ ہر رات وہ .... ہاہا........ ہاہا

........ہا۔"

"تو آسمان پر چلا جا یا زمین کے اندر' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"فی الحال تو میں یہ شہر بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس وقت میری سوتیلی نواسی اگلے شہر جانے والی بس کی سیٹ پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں لاری اڈے سے بول رہا ہوں۔ اچھا اب جا رہا ہوں' تم جہنم میں جاؤ۔"

اس نے زور سے ریسیور پٹخ دیا۔ "کمینہ' ذلیل۔ میں قبر تک تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔"

شہباز نے صوفے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "احمد! اپنے ذہن کو پرسکون رکھو۔ عقل سے کام لو۔"

پھر اس نے ٹیلی فون ایکسچینج کا نمبر ڈائل کیا۔ "آپریٹر! میں سابق جیلر شہباز بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی میرے نمبر پر ایک کال آئی تھی۔ ذرا معلوم کرو کس شہر اور کس نمبر سے تھی۔"

چند ہی منٹوں پر آپریٹر نے کہا۔ "سر! یہ کال گوجرانوالہ کے بس اڈے سے کی گئی تھی۔"

شہباز نے فوراً گوجرانوالہ کے لاری اڈے کا نمبر ملایا جو آپریٹر نے دیا تھا۔ "جی صاحب! کیا حکم ہے؟"

اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔ "ذرا جلدی سے اڈے کے ٹائم کیپر سے پوچھو' یہاں سے کس شہر کے لئے ابھی ابھی بس روانہ ہوئی ہے یا ہونے والی ہے؟"

اس نے فوراً معلوم کر کے بتایا پھر شہباز نے ان روٹوں میں آنے والی چوکیوں کو اطلاع کر دی' شبیر اور آسیہ کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے کہا۔ "جو بھی ہیں' انہیں گرفتار کر لو۔"

وہ دونوں دو مختلف محاذوں پر بیک وقت جنگ لڑ رہے تھے۔ جب آدمی کا اپنا مفاد سامنے آتا ہے تو دوسرے کی الجھن بے کار سی لگنے لگتی ہے۔ شہباز خاموشی سے سر پر ہاتھ رکھے سوچنے لگا۔ اس نجومی کے بچے کے دشمن کو بھی آج ہی پریشان کرنا تھا۔ الیکشن کے بعد شبیر کا پتا چلتا تو بہتر ہوتا۔

احمد شاہ سوچ رہا تھا۔ "میں بھی شہباز کی پیشکش کو قبول کر کے اس کا محتاج ہو گیا ہوں۔ اس کے بغیر پولیس والے میرے کام نہیں آئیں گے۔ ابھی شہباز کو چھوڑ کر سیالکوٹ اور گوجرانوالہ جا سکتا تھا۔ ہائے میری بچی۔ پتا نہیں کب اسے دیکھ سکوں گا۔

جب میرے دل کو سکون پہنچے گا۔"

دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ اسی الجھن میں دن نکل آیا۔ قومی انتخابات کے لئے ووٹ پڑنے شروع ہو گئے۔ شہباز کے کان اپنے حلقوں کی رپورٹ سننے کے لئے ٹیلی فون کی طرف لگے ہوئے تھے اور احمد شاہ کو شبیر کے بارے میں اطلاع کا انتظار تھا۔ اس لئے جب بھی فون کی گھنٹی بجتی تھی' دونوں ہی چونک جاتے تھے۔

فون کی گھنٹی پر ملازم نے ریسیور اُٹھایا پھر شہباز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سر ایک چیک پوسٹ سے آپ کے لئے کال ہے۔"

احمد شاہ سمجھ گیا۔ اس فون کا تعلق براہ راست اس سے ہے لیکن شہباز کے نام تھ اس لئے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "سر! ہم نے آپ کی بتائی ہوئی دونوں بسیں دیکھ لی ہیں۔ ان میں کوئی بھی شبیر نامی شخص نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے ساتھ ایسی لڑکی تھی جس کی آنکھیں بھوری اور ٹھوڑی سے اوپر تل تھا۔"

"لگتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے نکل گئے ہیں۔ خیر معاف کرنا تم لوگوں کو تکلیف دی۔"

کوئی بات نہیں ہے سر! یہ ہمارا فرض ہے۔ آپ دس بار کہیں ہم دس بار تعمیل کریں گے۔"

اس نے ریسیور ملازم کی طرف پکڑاتے ہوئے کہا۔ "احمد! میری رائے تو یہ ہے کہ وہ بہت ہی عیار و مکار ہے لیکن میں ایسے مجرموں کو قبر سے بھی نکال لاتا ہوں۔ میں تمہاری بیٹی کو تم سے ضرور ملاؤں گا۔ مجھ پر بھروسا کرو اور میرے مستقبل کی فکر کرتے رہو۔ میری کامیابی تمہاری بھی کامیابی ہو گی۔"

شہباز کا یہ مشورہ اس کے اپنے حق میں بہتر تھا۔ احمد شاہ کے لئے کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ برسوں ملک کے اندر ایک صوبے سے دوسرے صوبے کے شہروں اور دیہاتوں میں چکر لگاتا پھرتا تھا لیکن کامیابی نہ ہوتی۔ محاورتاً دنیا گول ضرور ہے مگر حقیقتاً یہ ایک بھول بھلیاں ہے۔ آدمی چکراتا ہے اور چکرا کر پھر اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے' جہاں سے وہ چلتا ہے جو دوسری راہ میں بھٹک رہے ہیں' وہ کبھی ان سے نہیں مل پاتے۔ چکرا کر گرنے والے سے آگے نکل جاتے ہیں۔

سورج غروب ہوتے ہی ووٹوں کی گنتی شروع ہو گئی۔ شہباز کے پولنگ ایجنٹ ہر بوتھ پر موجود تھے۔ تاکہ ہر ڈبے کی گنتی کے بعد اسے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہیں۔

احمد شاہ تازہ خبروں کے حوالے سے کچھ اور پیش گوئی کے لئے پوری طرح تیار بیٹھا ہوا تھا اور شہباز کبھی بیٹھ رہا تھا' کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ احمد شاہ کے علوم پر کامل یقین ہونے کے باوجود ایک اندیشہ سا تھا۔ خدانخواستہ مقدر نے ہار لکھ دی ہو تو اس کا علم کیا کرے گا لیکن پھر اپنے آپ ہی مقدر والی بات کو کچل دیتا تھا۔ نہیں احمد شاہ کی باتیں سو فیصد درست ہوتی ہیں ورنہ چھ میں سے ایک بھی قیدی پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتا تھا یا کسی بھی معجزے کی وجہ سے بچ سکتا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے ٹہل رہا تھا اور ٹہلتے ٹہلتے سوچ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد احمد شاہ سے کہتا تھا۔ "احمد! جلدی بتاؤ اس وقت تمہارا علم میرے حق میں کیا کہہ رہا ہے؟"

اس نے قلم میز پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ "صاحب! آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو ٹینشن میں مبتلا کر رہے ہیں۔ آپ سکون سے بیٹھ کر چائے پئیں۔ ان شاء اللہ فتح آپ ہی کی ہو گی۔ میرا علم.........."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ملازم نے ریسیور اُٹھایا لیکن اس کے ہیلو کہنے سے پہلے شہباز نے چھین لیا۔ "ہیلو شہباز سپیکنگ!"

"سر! میں رحیم بول رہا ہوں' بوتھ نمبر پانچ سے۔"

"جلدی سے صورتِ حال بتاؤ۔"

"سر! دس ڈبوں میں سے پانچ کی گنتی ہو چکی ہے۔ دس ووٹوں کا فرق ہے۔ آپ جیت رہے ہیں۔"

اس کا چہرہ خوشی سے کِھل گیا۔ "احمد شاہ مبارک ہو۔ میں نمبر پانچ سے جیت رہا ہوں۔"

پھر اس نے ریسیور میں کہا۔ "رحیم! جیسے ہی گنتی مکمل ہو جائے فون کرو۔"

ریسیور رکھتے ہی گھنٹی پھر بجی۔ "ہیلو' میں شہباز بول رہا ہوں۔"

"سر! بوتھ نمبر دو سے کرامت۔ یہاں بہت کم ووٹ پڑے ہیں۔ یوں بھی یہ محلّہ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا ہے۔"

"صاف صاف بتاؤ' جیت ہے یا.........."

"سر! یہاں سے آپ بیس ووٹوں سے ہار چکے ہیں۔"

اس نے ریسیور غصے سے پٹخ دیا۔ احمد شاہ نے کہا۔ "صاحب! کسی مایوس کن خبر سے دل برداشتہ نہ ہوں' جیت آپ ہی کی ہو گی۔"

لیکن اوپر تلے تقریباً چار بوتھوں سے فون آئے وہ سب کے سب ہار کی خبر سنا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بوتھ نمبر پانچ کی جیت بھی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ وہاں سے بھی دوسرا امیدوار جیت گیا۔ شہباز کا دماغ غصے سے بھڑکنے لگا۔ اس نے احمد شاہ پر برستے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ رہ گیا نہ تمہارا سارا علم دھرا کا دھرا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے اس شبیر کے بچے نے تمہارے علم کو بھی مفلوج کر دیا ہے۔ میں' میں........"

"ٹرن .... ٹرن........."

فون کی گھنٹی پر شہباز پھر لپکا لیکن احمد شاہ نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ "آپ بیٹھ جائیں۔ میں سنتا ہوں۔"

"ہیلو۔ میں احمد شاہ۔"

"شاہ جی۔ میں بخش دین بول رہا ہوں۔ یہاں ہر گنتی میں دھاندلی ہو رہی ہے۔ میں نے احتجاج کیا تو مدنی لال کے آدمیوں نے مجھے مارا پیٹا ہے۔ فوراً ایکشن لیں۔ ویسے میں نے کمشنر صاحب کو اطلاع دے دی ہے۔"

"اچھا اچھا' تم فون بند کرو' میں دیکھتا ہوں۔"

شہباز نے وہیں سے چیخنے کے انداز میں کہا۔ "ہوگی پھر کوئی منحوس خبر؟"

احمد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرایا پھر الیکشن کمشنر سے رابطہ قائم کیا۔

"سر! میں شہباز صاحب کی کوٹھی سے احمد شاہ بول رہا ہوں۔"

"جی شاہ صاحب فرمایئے؟"

"سر! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کے پاس حلقہ نمبر ایک سو آٹھ کے بوتھ نمبر گیارہ کی اطلاع تو پہنچ گئی ہوگی۔ سر! یہ تو کھلے عام بدمعاشی اور دھاندلی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں' میں نے اپنی خصوصی ٹیم اُدھر روانہ کر دی ہے جو اپنی نگرانی میں دوبارہ گنتی کروائے گی۔ اگر آپ جیت رہے تھے تو ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

احمد شاہ نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "شہباز صاحب! جیت آپ ہی کی ہے۔ آپ میرے پاس ہی بیٹھیں۔ جو بھی فون ہوگا' میں سنوں گا اور ان شاء اللہ جیت کی خبر بھی میں ہی آپ کو سناؤں گا۔"

کائنات کا ایک ایک ذرہ' ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابع ہے۔ جب تک وہ نہ چاہے درخت کا ایک سوکھا پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ پھر بھلا ہاتھ کی لکیریں اور ستارے اپنی مرضی سے کیسے حرکت کر سکتے ہیں۔ انسان اس کے بارے میں علم حاصل کر

کے کچھ پیش گوئیاں تو کر سکتا ہے لیکن اپنی مرضی کے مطابق کامیابی کو ناکامی اور شکست کو جیت میں نہیں بدل سکتا۔ ایسے وقت کچھ کہنے سے پہلے دعائیہ فقرہ ان شاء اللہ کہہ دینے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور یقینی ناکامی بھی اللہ کے حکم سے کامیابی میں بدل جاتی ہے۔

مایوسی کے بادل چھٹنے لگے۔ چاند کی چاندنی دھیرے دھیرے شہباز کے باغیچے میں اُترنے لگی۔ ایک کے بعد دوسری پھر خوشخبریوں کا تانتا بندھ گیا۔ جن کی وجہ سے شہباز میں زندگی کی روح بھرنی شروع ہوگئی۔ چالیس' پچاس ووٹوں سے شکست کھانے والا کئی ہزار ووٹوں کے فرق سے جیت گیا۔ غیر سرکاری طور پر قومی اسمبلی کا ممبر بنتے ہی اس نے احمد شاہ کو گلے لگا لیا۔ "میں نے جو کچھ کہا' مجھے معاف کر دینا' میرے دوست! میرے بھائی میں سرکاری اعلان ہوتے ہی تمہاری بیٹی کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دوں گا۔"

احمد شاہ نے دل میں کہا۔ "زمین آسمان تو اس وقت ایک کریں گے جب شبیر کی پرچھائیں بھی نظر آئے گی۔ وہ تو ایسے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے جیسے چھلاوا ہو' ابھی یہاں' ابھی وہاں۔ ابھی بس میں ابھی فون پر۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ ملازم نے آواز سننے کے بعد ریسیور احمد شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ فون پر ایک نسوانی آواز تھی۔ "احمد شاہ! تم نے میری ماں کا قتل کیا ہے۔ برسوں پہلے تم نے میرے باپ کو بھی قتل کیا تھا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"تت .... تم کون ہو؟ کہاں سے بول رہی ہو؟"

"میں صرف اور صرف تمہاری موت ہوں۔ موت کا کوئی نام نہیں ہوتا لیکن تمہاری موت کا ایک نام ہے آسیہ .... آسیہ........."

فون بند ہو چکا تھا لیکن وہ اسی طرح کھڑا تھا۔ آسیہ کی گونج کانوں سے گزر کر دل کی گہرائیوں میں اُترتی جا رہی تھی۔

شہباز نے قریب آ کر پوچھا۔ "کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شہباز نے ملازم سے پوچھا۔ "ریسیور تم نے اُٹھایا تھا' کون تھا؟"

"پتا نہیں صاحب! ایک آدمی تھا' اس نے شاہ صاحب سے بات کرنے کا کہا تھا۔"

احمد شاہ نے کہا۔ "یقیناً وہ شبیر تھا لیکن میں نے جو آواز سنی وہ ایک لڑکی کی آواز تھی۔ یقیناً وہ میری بیٹی تھی لیکن دشمن کی زبان بول رہی تھی۔ مجھے ہی میرا قاتل کہہ رہی تھی۔ اپنی ماں کا قاتل کہہ رہی تھی اور خود کو میری ملک الموت کہہ رہی تھی۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہی تھی؟"

"آواز اور لہجہ اپنی ماں ساحرہ کی طرح تھا۔ نام بھی آسیہ بتایا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے اس مکار شخص نے تمہاری ہی بیٹی کو تمہارے خلاف کر دیا ہے تاکہ کبھی سامنا بھی ہو جائے تو وہ تمہیں اپنا باپ تسلیم نہ کرے۔"

شہباز نے کچھ رک کر کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ ساحرہ تمہیں سڑک پر نظر آئی تھی جبکہ تمہاری بیٹی اسے مُردہ قرار دے رہی ہے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ آخر یہ شبیر کھیل کون سا کھیل رہا ہے؟"

"جن بیٹیوں کے باپ بے غیرت ہوتے ہیں ان کے لئے کسی بھی مقدس رشتے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ پھر وہ جس قسم کا بھی کھیل کھیلیں سوائے دولت بٹورنے کے کچھ نہیں ہوتا۔ شہباز صاحب! یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے آج تک اپنے ہاتھ کی لکیریں نہیں دیکھیں اور نہ ہی کبھی زائچہ بنایا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ اسی طرح میں نے اپنی بیوی کا ہاتھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اچانک میرے سامنے آگیا اور اس روز سے میری زندگی کا رُخ بدل کر رہ گیا ہے۔ میں جس طرح چلنا چاہتا ہوں ہوائیں مخالف سمت سے چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ میری بیوی کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کے تابع چلنا تھا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن اب آپ سے کوئی بات چھپی نہیں رہی اس لئے یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وہ ایک بے حیا عورت تھی۔ میں نے اسے ہر طرح بے حیائی سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ شاید میں اسے راہِ راست پر لے آتا لیکن تقدیر مجھے جیل پہنچا کر اسے پھر گمراہی کی طرف لے گئی۔ میری بیٹی کی اطلاع کے مطابق وہ مر چکی ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے' شبیر اسے مرنے سے پہلے ہی کسی رئیس زادے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے اور میری بیٹی کو ساحرہ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ تقریباً پندرہ برس کی ہو چکی ہوگی لیکن وہ اتنی جلدی اسے کسی کے قریب جانے نہیں دے گا۔ بیٹی کی طرح اسے بھی سائن بورڈ کی طرح استعمال کرے گا۔ جب اچھی خاصی رقم بٹور لے گا تب.........."

بولتے بولتے اس کی آواز کانپنے لگی۔ شہباز نے کہا۔ "تم تو اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے ہو۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق پہلے وہ صرف لوگوں کو دکھا دکھا کر پھانسے گا' رقم بٹورے گا تو اس کا مطلب ہے تمہاری بیٹی کافی عرصے تک کسی کے ہتھے نہیں چڑھے گی اور اس وقت تک ہم اس تک ضرور پہنچ جائیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

☆------☆------☆

اخباروں میں جہاں شہباز کی واضح جیت کی خبریں شائع ہوئی تھیں وہاں احمد شاہ کے حوالے سے بھی سرخی لگی تھی۔ "ایک ماہرِ علمِ نجوم نے سابق جیلر کو قومی اسمبلی کا ممبر بنا دیا۔"

یہ خبر شہباز نے اخبار والوں کو خاص طور پر دی تھی تاکہ اس سے احمد شاہ کی شہرت ہو۔ اس کی حیثیت بنے' جو کام وہ اور احمد شاہ مل کر نہ کر سکے' ہو سکتا ہے کوئی اور کر جائے۔

احمد شاہ نے خبر دیکھتے ہوئے کہا۔ "صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ اس طرح تو........."

"میں نے اپنی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ تمہیں سیاست میں شامل کر کے سیاسی بنا دیا ہے تاکہ اس ذریعے سے تم اپنے مقاصد حاصل کر سکو۔ ہو سکتا ہے تمہاری حیثیت کو دیکھتے ہوئے شبیر خود تمہاری بیٹی کو تمہارے پاس لے کر چلا آئے۔"

دوسرے دن کئی لوگوں کے فون احمد شاہ کے نام آنے لگے۔ سب کی یہی خواہش تھی کہ وہ اس کی قسمت کا حال بتائے لیکن احمد شاہ نے طے کر لیا تھا کہ پہلے وہ کچھ دن اپنے پرانے مکان میں جا کر آرام کرے گا پھر شہباز کے پاس چلا آئے گا۔

پرانے مکان کا خیال آتے ہی اسے حیدر آباد والے مکان کا خیال آیا۔ جہاں اس کا نکاح ہوا تھا۔ اس کے اندر عجیب سی امید کی کرن پھوٹ پڑی۔ کہیں ساحرہ کی ماں اور اس کا باپ' آسیہ کے ساتھ وہاں نہ ہوں؟ اس نے خود کلامی کی۔ "اگر نہ بھی ہوئے تو ان کا پتا چل سکتا ہے۔ کیونکہ ساحرہ کی ماں اور وہاں رہنے والی خاتون گہری سہیلیاں تھیں۔"

اس نے شہباز سے ایک رات کے لئے گاڑی لی اور حیدر آباد روانہ ہو گیا۔

اتنے برسوں میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ مکانات کے نقشے بدل چکے تھے۔ کئی نئے مکانات تعمیر ہو چکے تھے لیکن نمبروں کی ترتیب اب بھی وہی تھی' اس لئے وہ باآسانی مطلوبہ دروازے تک پہنچ گیا۔ اس مکان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس وقت اور حالات کی آندھیوں میں رہتے ہوئے پُرانا سا ہو گیا تھا۔

اس کے دل میں عجیب بے قراری سی ہونے لگی جیسے اس دروازے کے پیچھے ساحرہ موجود ہے۔ اس کی بیٹی آسیہ اس کی منتظر ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ساختہ تیز ہو گئیں پھر اس نے دھیرے دھیرے زنجیر کھٹکھٹائی۔

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جیسے دروازے کے پیچھے کسی کا وجود ہی نہ ہو۔ اس نے ذرا زور سے دوبارہ دستک دی۔

چند منٹوں میں دروازہ کھل گیا۔ نگاہوں کے سامنے آنے والی خاتون کو دیکھتے ہی خوشی سے آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

دروازے والی خاتون کی نظریں شاید بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھیں اس لئے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کون ہو تم؟"

"مم .... میں احمد شاہ' آپ کی ساحرہ کا شوہر۔ آپ کی نواسی آسیہ کا باپ!"

خاتون کو جیسے یقین نہیں آیا انہوں نے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ احمد کو تو مرے ہوئے برسوں بیت گئے۔"

"نن .... نہیں ماں جی! میں زندہ ہوں۔ ایک بڑی مصیبت سے نکل کر آج یہاں پہنچا ہوں۔ میری ساحرہ کو بُلائیں وہ مجھے پہچان لے گی۔"

اس نے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔"

وہ پیچھے پیچھے اندر آیا۔ خاتون بولنے لگیں۔ "بیٹا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ شبیر نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ تم ایک ہنگامے میں مارے گئے ہو۔ بم دھماکے میں تمہارے چیتھڑے اُڑ گئے ہیں۔ ساحرہ اس غم سے نڈھال ہو گئی تھی پھر رفتہ رفتہ شبیر صاحب اس کا دل بہلانے باہر لے جانے لگے۔ آسیہ میرے پاس ہی رہتی تھی لیکن حقیقت کب تک چھپ سکتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسے امیر زادوں کے پاس لے جاتا ہے۔ ان کی تنہائیوں میں بھیجتا ہے۔ کچھ بھی ہو میں اس کی طرح سوتیلی نہیں ہوں۔ میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ساحرہ خود ہی اس زندگی کی عادی ہو چکی تھی اس لئے مجھے دھتکار کر سوتیلے باپ کو سب کچھ مان لیا اور ایک رات دونوں مجھے اکیلا چھوڑ کر آسیہ کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ پتا نہیں کہاں کھو گئے۔ مجھے اپنی نواسی کی فکر تھی۔ میں کراچی کے ایک ایک علاقے میں ماری ماری پھرتی رہی مگر ان دونوں کا کوئی پتا نہیں چلا۔ آخر کب تک پاگلوں کی طرح در بدر پھرتی رہتی۔ میری سہیلی کا ایک یہی مکان رہ گیا تھا۔ تب سے یہیں زندگی گزار رہی ہوں۔"

"ماں جی! میں نے ساحرہ کو ایک دن کراچی میں دیکھا تھا مگر اس وقت وہ میری پہنچ سے بہت دور تھی۔ پھر شبیر سے ایک بار ملاقات ہوئی' ایک بار فون پر بات ہوئی لیکن وہ دھمکی دینے کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا تھا' میری بیٹی سے رقم وصول کرے گا کیونکہ میں نے ساحرہ سے شادی کر کے اس سے کمائی کا ذریعہ چھین لیا تھا۔"

"اور آسیہ کا کچھ پتا چلا؟ وہ کیسی ہے' کتنی بڑی ہو گئی ہے؟"

"ماں جی! ابھی ایک دو دن پہلے ہی فون پر اس کی آواز سنی تھی۔ وہ مجھے اپنے باپ

کا اور اپنی ماں کا قاتل کہہ رہی تھی۔"

"ہائے میں مرگئی! تو اس کمینے شبیر نے اسے بھی اس کی ماں کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اسے تیرے خلاف کر دیا ہے۔ بیٹا! کسی طرح اسے کمینے کو ڈھونڈ اور اسے میرے سامنے لا۔ میں اس سے ایک ایک فریب کا حساب لوں گی۔ اس نے میری نیکیوں کا یہ بدلہ دیا ہے۔"

"ماں جی! میں بھی اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مگر مجبوری ہے کہ اس کی کوئی تصویر بھی میرے پاس نہیں ہے........"

"ہے .... ہے' میرے پاس اس کمینے کی تصویر۔ وہ بھی میری فرشتے جیسی بچی کے ساتھ۔ جب آسیہ پانچ برس کی ہوئی تھی تو میں نے دھوم دھام سے اس کی سالگرہ کی تھی۔ اس روز تصاویر اُتری تھیں۔"

وہ دوسرے کمرے میں جا کر پرانے صندوق میں تصویر تلاش کرنے لگی۔ بالآخر ایک پرانا سا البم مل گیا۔ یہ البم اس کی مرحوم سہیلی کا تھا۔ وہ خوشی خوشی لے کر آئی۔ "یہ دیکھ بیٹا' شاید اس البم میں ہو۔"

احمد شاہ جلدی جلدی صفحے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک تصویر شبیر کی مل ہی گئی' اس نے کہا۔ "ماں جی! بس ایک تصویر ہے وہ بھی ایک زاویے سے ہے۔ پورا چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے........"

پھر وہ غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ "بن گیا کام' اس میں اس کا دایاں کان صاف نظر آ رہا ہے جو نیچے سے ذرا سا کٹا ہوا ہے۔"

"ہاں' ہاں یہی تو اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔"

اس نے کہا۔ "ماں جی! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرے ساتھ کراچی چلیں۔ میں بھی اکیلا ہوں اور آپ بھی۔ ہم دونوں ماں بیٹا مل کر رہیں گے اور اپنی بیٹی اور مشترکہ مجرم شبیر کو تلاش کریں گے۔ مجھے امید ہے میں ایک روز اسے ڈھونڈ کر ضرور لاؤں گا۔"

"ان شاء اللہ بیٹا!"

اس نے کراچی پہنچتے ہی اس فوٹوگراف کے ذریعے پہلے نیگٹو بنوائی پھر بہت سی بڑی بڑی تصاویر بنوا کر شہر کے مختلف تھانوں میں بھجوا دیں اور ساتھ میں پچاس ہزار کا انعام بھی رکھ دیا۔ تاکہ لالچ میں دوسرے جرائم پیشہ لوگ بھی اسے تلاش کر کے لے آئیں۔ جن کا تھانے میں آنا جانا رہتا ہے۔

لیکن سب کچھ بیکار ثابت ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا انہیں زمین نگل گئی تھی۔ کیونکہ

اس تلاش میں مزید ایک برس گزر گیا۔

ملکی حالات پھر ایک بار کروٹ لینا شروع ہو گئے تھے۔ برسراقتدار پارٹی دھیرے دھیرے اپنا اعتماد کھونے لگی۔ شہر میں دہشت گردی' لوٹ مار اور اغوا کا بازار گرم ہونے لگا۔ آئے دن کسی نہ کسی علاقے سے گمنام آدمیوں کی لاشیں ملنے لگیں۔ بینک ڈکیتی' راہ زنی' فائرنگ روز کا معمول بن گئی۔ دن میں شائع ہونے والا کوئی اخبار بھی ان خبروں سے مبرا نہیں تھا۔ شہباز اگرچہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے تھا مگر ایک بڑی پارٹی کی حمایت کی وجہ سے وہ بھی پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے احمد شاہ سے کہا۔ "پھر تمہارے علم کا عروج جانچنے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے بتاؤ' ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کس کی حمایت میں سیاسی بیان دینا چاہئے۔ کس کی مخالفت کرنی چاہئے؟"

احمد شاہ نے کہا۔ "شہباز صاحب! ایک آزاد امیدوار کو ڈپلومیسی سے کام لینا چاہئے۔ اس لئے جب بھی کوئی بیان دیں اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جو کسی بھی پارٹی کے خلاف جاتی ہو یا کسی ایک کی بھرپور حمایت ظاہر ہوتی ہو۔"

"پھر بھی تم میرا نئے سرے سے زائچہ بناؤ کہ اب میری قسمت کیا بتا رہی ہے؟"

"ٹھیک ہے' آج نہیں میں کل بتاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری........."

"ارے ہاں' تمہیں ایک تاکید بھی کرنی ہے۔ مجھے کمشنر صاحب نے فون کیا تھا کہ ایک بار پھر سے دہشت گردوں اور سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرنے کے لئے احکامات جاری ہونے والے ہیں۔ میں تمہیں ہوشیار کر دوں۔ کیونکہ تم سیاسی کارکنوں کی لسٹ کے مطابق باہر آئے تھے اور اسی کے تحت تمہیں پھر سے خطرہ ہے۔"

"یہ تو آپ نے بہت بری خبر سنائی ہے۔ اس طرح تو میں پھر........."

"ہاں ممکن ہے لیکن ایک طرح سے تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے اگر تم پھر سے میری رہائش گاہ پر رہنے لگو۔"

"ماں جی کا کیا ہو گا؟"

"تم انہیں بھی لے آؤ۔"

وہ اپنی ساس کو لانے کے لئے گھر پہنچا تو خداداد کالونی کو جانے والے راستے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر ایک ایک مسلح آدمی کھڑا تھا پھر جب وہ اپنے گھر کے دروازے کے پاس پہنچا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ گھر کے باہر کھڑی ہوئی نسان پیٹرول قربان علی تاج کی تھی۔

قربان علی تاج سیاست کی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ اس کے کارکن جنونی تھے۔ اس

لئے وہ ملک میں رہے یا ملک سے باہر اس کے کارکن پوری تندہی سے کام کرتے تھے۔ اس کے کئی ممبران سینٹ کے رُکن بھی تھے۔ اس لئے وہ وقت سے پہلے اسے بتا دیتے تھے کہ کس کے خلاف کیا کچھ ہونے والا ہے۔

قربان علی تاج کے امیدوار ہر دور میں ایک ہی خاندان سے رہے۔ پہلے باپ تھا پھر بیٹے نے انتخاب لڑا' اس کے بعد پوتا آنے لگا۔ چہرے بدل رہے تھے لیکن خاندان وہی تھا۔

جب سے احمد شاہ مشہور ہوا تھا اس کی اپنی ایک حیثیت بن گئی تھی۔ اس لئے گھر بھی اس نے ٹھیک طرح سے سیٹ کر لیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی بولا۔ "ارے قربان صاحب! آپ اور ہمارے غریب خانے پر؟"

"ہاں' جب غریب' بندہ نواز بن جائے تو بندے کو لینے کے لئے خود چل کر آنا پڑتا ہے۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ صرف حکم کریں' میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

قربان علی تاج نے کہا۔ "خدمت تو میں تمہاری کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ باتیں کرنے کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے لیکن میں ایک ضروری فون کرنا چاہوں گا۔"

"کیوں نہیں۔ تم ایک نہیں دس فون کر سکتے ہو مگر جلدی' میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

احمد شاہ وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ شہباز کی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ 'ہیلو' میں احمد شاہ' فون صاحب کو دو۔"

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد شہباز کی آواز اُبھری۔ "خیریت تو ہے' تم تو ماں جی کو لینے گئے تھے پھر فون کرنے کی.........؟"

"یہاں قربان علی تاج صاحب مجھ سے پہلے پہنچے ہوئے ہیں۔"

"کک......... کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بنگلے تک لے جانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ چلے جاؤ ان کے ساتھ بھی تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم ماں جی کی فکر نہ کرو۔ میں ابھی کسی ملازم کو بھیج کر بلوا لیتا ہوں لیکن وہاں سے تم سیدھے میرے پاس آنا۔"

"جی بہتر........ پھر ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ!"

"فی امان اللہ!"

احمد شاہ واپس ڈرائنگ روم میں آنے سے پہلے بالائی منزل کے کمرے میں گیا وہاں اس کی ساس موجود تھی۔ "ماں جی! میں ابھی آیا تھا مگر ایک ضروری کام سے واپس جانا پڑ رہا ہے۔"

"ہاں' وہ نیچے قربان نامی صاحب بھی.........."

"ماں جی وہ سیاست کے بادشاہ ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ ابھی چند منٹوں میں ایک ملازم میرے دوست شہباز کے پاس سے آئے گا۔ آپ اس کے ساتھ شہباز کی کوٹھی پر چلی جایئے گا۔ میں بھی وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا وہیں آؤں گا' اب ہمیں چند دنوں کے لئے وہیں رہنا ہو گا۔"

"لک........ کیوں؟"

"یہ سیاسی باتیں ہیں۔ آپ کی سمجھ سے باہر ہیں۔ میری بہتری اسی میں ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اللہ کے حوالے۔"

وہ بالائی منزل سے اُتر کر نیچے آیا پھر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

چند منٹوں میں گاڑی قربان علی تاج کے محل کے سامنے پہنچ گئی۔ جس کی اونچی اور مضبوط فصیلیں تھیں۔ جس کے چاروں طرف محافظ مورچہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے اشارہ ملتے ہی فائرنگ شروع کر دیں گے۔

گاڑی آہنی گیٹ سے گزر کر ایک جگہ رک گئی۔ ایک دم سے دو تین محافظ گاڑی کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے گاڑی کے تمام دروازے کھول دیئے۔ سب نیچے اُتر آئے۔ قربان علی تاج آگے آگے چلنے لگا اس کے پیچھے احمد شاہ اور محافظ بھی چلتے ہوئے بڑے سے ہال کے سامنے پہنچ گئے۔

قربان علی کے پیچھے صرف احمد شاہ اندر گیا۔ باقی تمام محافظ باہر ہی رک گئے۔ احمد شاہ حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اندر وہ ایک نہیں بلکہ کئی نظر آ رہا تھا۔ دیوار اور چھت پر شیشوں کی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی شیش محل ہو۔

قربان علی نے بڑے سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس ہال میں آدمی کسی زاویے سے بھی چھپ نہیں سکتا۔ اس کی ایک ایک حرکت مجھے دکھائی دیتی ہے۔"

اس نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یوں بھی کسی کی کیا جرأت ہو سکتی ہے کہ آپ کے سامنے آ کر کوئی غلط حرکت کرے یا آپ کو مارنے کے لئے کہیں پستول چھپا

کر لائے اور غافل دیکھ کر.........."

"کافی ذہین ہو' ماحول سے بہت کچھ پتا چلا لیتے ہو۔ سچ پوچھو تو جب پہلی بار میں نے تمہارے متعلق اخبار میں پڑھا تو میرے ذہن میں ایک نہایت ہی بوڑھے شخص کا خاکہ بنا تھا لیکن تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی اور خوشی بھی کہ تم تندرست اور توانا ہو۔ مجھے ہمیشہ ایسے ہی لوگ پسند رہے ہیں۔ جن کے حوصلے اور عزم بھی ان کی طرح توانا اور صحت مند ہوتے ہیں۔ مجھے تمہارے بارے میں مکمل تفصیلات کمشنر صاحب سے مل چکی ہیں کہ تم نے کس طرح جیل سے نکلنے کے لئے اپنی راہ ہموار کی اور اپنے علم سے شہباز کو کامیاب کیا۔"

"یہ سب اللہ کا کرم ہے اور.........."

"احمد شاہ! یوں تو میں عوامی لیڈر ہوں۔ اپنے کسی نمائندے کی جگہ اگر ایک بے جان چیز بھی کھڑی کر دوں تو وہ الیکشن میں جیت جائے گی لیکن جب سے سیاست نودولتیوں کے ہاتھ میں آئی ہے' بیوپار بن کر رہ گئی ہے۔ اپنے ہم پیالہ و ہم نوالہ وفادار ساتھیوں پر سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ پچھلا قومی الیکشن ہارنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میرے ساتھی دھوکا دے گئے عین وقت پر ہارس ٹریڈنگ کی نذر ہو گئے۔ اب تم ہی بتاؤ کسی کے ماتھے پر لکھا تو ہوتا نہیں کہ وہ دھوکا دے جائے گا۔"

احمد شاہ نے کہا۔ "ماتھے پر تو نہیں البتہ ہاتھوں پر ضرور لکھا ہوتا ہے۔"

قربان علی نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ "ماشاء اللہ! بات سے بات پکڑنے میں بھی ماہر ہو۔ لگتا ہے میں نے تمہیں یہاں لا کر کوئی غلطی نہیں کی ہے؟"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوا پھر بولنے لگا۔ "دراصل میرا بھی یہی مقصد تھا کہ میں اپنی پارٹی کے امیدواروں کو ٹکٹ دینے سے پہلے تمہارے علم کے ذریعے پرکھ لوں کہ کون میرا وفادار رہے گا اور کون سا امیدوار جیتے گا۔"

"یہ ایک آسان مگر مشکل راستہ ہے کیونکہ ہر کوئی اتنی آسانی سے اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے کی اجازت نہیں دے گا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ تقریباً میرے تمام ممبران کے پاس اپنا اسلحہ ہے اور اسلحہ دینے سے پہلے قانون کے مطابق ہاتھوں کے نشانات لئے جاتے ہیں' سو میں نشانات وہاں سے نکلوا کر اس کی فوٹو کاپیاں فراہم کر دوں گا۔ رہا زائچے کے لئے مکمل کوائف تو اس کی بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے' آپ مجھے ان کی فائل بنا کر دے دیں' میں ان کے

بارے میں حتمی رپورٹ چند ہی دنوں میں فراہم کر دوں گا۔"

"اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ ابھی اعتماد کا ووٹ لینے میں چند مہینے باقی ہیں۔ قوی امید تو یہی ہے کہ وقت سے پہلے ہی اسمبلی ٹوٹ جائے گی اور عبوری حکومت آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں آرام سے دیکھ لوں گا۔"

"ایک بات تمہیں اور سمجھاتا ہوں' یہ کام بہت ہی رازداری کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تک تم میرا یہ کام کرو تب تک ایک بنگلے میں تنہا رہو۔ رازداری کے علاوہ تمہاری حفاظت بھی ضروری ہے۔ میرے محافظ ہر وقت تمہارے اردگرد پہرے پر مامور رہیں گے۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "جیسے آپ کا حکم۔ میرا کیا ہے' ایک ماں جی ہے' کہیں بھی رہ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے' پھر آج سے ہی تم اپنی ماں جی کے ساتھ میری ڈیفنس والی کوٹھی میں منتقل ہو جاؤ۔"

"جی بہتر.......... اب مجھے آپ شہباز صاحب کی کوٹھی پر پہنچانے کے لئے کہہ دیں۔"

قربان علی تاج نے گھنٹی بجا کر اپنے ایک گارڈ کو بلایا' پھر احمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آج سے یہ گارڈ تمہارا محافظ خاص ہے۔ یہ تمہاری حفاظت کے لئے جتنے گارڈ چاہے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جس گاڑی میں تم جا رہے ہو وہ آج سے تمہارے استعمال میں رہے گی۔ رقم کی بالکل فکر نہ کرنا۔ اشارہ کرنا مطلوبہ چیز حاضر ہو جائے گی۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ جب ایک بار کوٹھی میں داخل ہو جاؤ تو اس کے بعد وہاں سے میرے حکم کے بغیر نہیں نکلنا۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ میں نہیں چاہتا کوئی دشمن تم پر وار کر جائے۔ تم اپنے ہی لئے نہیں میرے لئے بھی بہت قیمتی ہو۔"

احمد اپنے محافظوں کے ساتھ شہباز کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ شہباز نے اسے دیکھتے ہی حیرانی سے کہا۔ "یہ .... یہ سب کیا ہے؟ اتنے سارے گارڈز اور.........."

"مجھے قربان علی تاج نے ایک بڑا پروجیکٹ دیا ہے۔ یہ سب اسی کے طفیل ہے۔ میں ماں جی کو لے کر آج ہی ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں شفٹ ہو رہا ہوں۔"

"پھر میرے کام کا کیا ہو گا۔ تم سے ملاقات کیسے ہو گی؟"

"میں آپ کا کام وہاں بھی کرتا رہوں گا۔ ٹیلی فون پر رابطہ رکھوں گا۔ اگر اشد

ضرورت ہوئی تو آپ میری کوٹھی پر چلے آیئے گا۔ آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔"

"میں بھی تمہارے کام پر لگا رہوں گا۔ تمہاری بیٹی اور دشمن کی تلاش جاری رکھوں گا۔ دعا کرو جلد تمہاری بیٹی کو لے کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔"

"ان شاء اللہ! وہ بڑا کارساز ہے۔ ویسے قربان صاحب سے بھی اس مسئلے پر بات کروں گا' مجھے امید ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں میری مدد کریں گے۔"

"ضرور' ضرور۔ ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جو ان کے لئے کام کرتا ہے وہ اس کے ہر طرح سے کام آتے ہیں۔"

احمد شاہ جس طرح آیا تھا اسی طرح اپنی ساس کو لے کر لوٹ گیا۔

☆======☆======☆

تقریباً آٹھ سو گز کے پلاٹ پر بنی ہوئی کوٹھی میں قدم رکھتے ہی اسے ساحرہ یاد آ گئی۔ وہ اندر ہی اندر بڑبڑانے لگا۔ "ساحرہ افسوس تمہارے پاس صبر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ورنہ آج تم.........."

وہ خود کلامی کرتا ہوا خود ہی رک گیا پھر گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر طنزیہ لہجے میں بولنے لگا۔ "صبر کر بھی لیتیں تو کیا تھا۔ اگر یہ شان و شوکت میرے پاس پہلے سے ہوتی پھر بھی تم بازاری ہی رہتیں کیونکہ اب مجھے اپنے علم پر زیادہ بھروسا ہو گیا ہے' ہم قسمت کی لکیروں کو بھی جھٹلا نہیں سکتے۔ قسمت پر اثرانداز ہونے والے ستاروں کی چالیں کبھی بدل نہیں سکتے۔"

ساس نے اسے چونکا دیا۔ "بیٹا! یہ سب کیا تمہارا ہے؟ تم اتنے بڑے آدمی بن گئے ہو؟"

"نہیں ماں جی! فی الحال یہ ہمارا نہیں ہے لیکن جب بھی ہم یہاں سے جائیں گے کسی ایسی ہی کوٹھی میں جائیں گے جو اپنی ہو گی۔ اسی طرح ہمارے بھی رئیسانہ ٹھاٹھ ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے میرے ستارے میرے حق میں ہیں۔ بس آپ نماز پڑھ کر دعا کیجئے۔"

"بیٹا! میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ ہیں۔ جس طرح یہ سب کچھ ملا ہے اسی طرح اچانک تیری بیٹی بھی مل جائے گی۔ ویسے یہ قربان علی بہت ہی بھلا اور اثر و رسوخ والا لگتا ہے۔ اس سے بھی بول کر دیکھ' ممکن ہے یہی تیرے کام آ جائے۔"

اس نے محبت سے ساس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ حوصلہ رکھیں ماں جی! آج کل میں قربان صاحب سے ملاقات ہو گی تو میں ذکر چھیڑوں گا۔ مجھے بھی بیٹی سے ملنے

کی بے چینی ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی؟ اور کہاں ہو گی؟ شبیر اسے کہاں کہ لئے مارا مارا پھر رہا ہو گا؟"

دو تین دنوں تک وہ آرام کرتا رہا۔ چوتھے روز قربان علی تاج کا سیکرٹری چند فائلیں لے کر آیا۔ جیسے ہی اس نے فائلیں احمد شاہ کے سامنے میز پر رکھیں، سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون بجنے لگا۔

ایک ملازم نے ریسیور اُٹھایا پھر احمد شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سر! قربان علی تاج صاحب لائن پر ہیں۔"

اس نے ریسیور کان سے لگایا۔ "جی قربان صاحب! حکم کریں۔"

"احمد شاہ! یقیناً فائلیں تمہارے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔"

"جی جی.......... ابھی پہنچی ہیں۔"

"یہ تمام ممبران کے کوائف نہیں ہیں۔ جو بھی ہیں انہیں دیکھ لو۔ باقی کی فائلیں میرا سیکرٹری کل پرسوں تک پہنچا دے گا۔ میں نے فون اس لئے کیا ہے کہ میں چند دنوں کے لئے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ وہاں پارٹی ممبران اور کچھ سیاسی لوگوں سے ملاقات کرنا ضروری ہے۔"

"قربان صاحب! مجھے آپ سے ایک ذاتی مسئلے پر بھی بات کرنا ہے۔"

"میں اسلام آباد سے واپس آ کر بات کروں گا۔ فی الحال سیکرٹری جو کچھ سمجھائے گا سمجھ لو۔"

فون بند ہو گیا تو سیکرٹری نے بولنا شروع کر دیا۔ "احمد شاہ! تم بہت خوش قسمت ہو کہ تم پر قربان صاحب کا ہاتھ آ گیا۔ تمہارے لئے میں جو کچھ لے کر آیا ہوں، وہ تم تصور میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔"

"آپ میرے تجسس کو مزید ہوا نہ دیں۔ جلدی سے بتائیں میرے لئے کیا خوشخبری ہے؟"

"یہ کوٹھی جس میں آپ اس وقت موجود ہیں یہ تحفے کے طور پر قربان صاحب نے آپ کو دے دی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ذاتی استعمال کے لئے ایک پجارو بھی دی ہے لیکن اس کا استعمال آپ تمام زائچے نکالنے کے بعد کر سکیں گے کیونکہ اس سے پہلے آپ کو صرف اس گاڑی میں سفر کرنا ہو گا جس پر آپ کا محافظ خاص زمین خان کہے گا۔"

پھر اس نے ایک بند بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "اس میں پانچ لاکھ روپے ہیں۔ یہ آپ کے دیگر اخراجات کے لئے، اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو مجھے فون

پر کہہ دیجئے گا۔ حاضر ہو جائے گی۔ ویسے میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔"

"آخر اتنی ساری عنایتیں..........؟"

"آپ اب معمولی نجومی نہیں رہے بلکہ قربان علی تاج کے مشیر خاص کی حیثیت سے کام کریں گے۔ وہ آپ کے مشوروں کو اہمیت دیں گے اس لئے.........."

اس نے آنکھ بند کر کے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھا لیا۔ دل ہی دل میں اتنا کچھ ایک دم سے ملنے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

احمد شاہ نے اس دن کے بعد سے راتوں کو جاگنا اور دن کو سونا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ وہ ساری ساری رات جاگ کر ان فائلوں میں سے ایک ایک ممبر کے کوائف نکال کر ان پر کام کر رہا تھا۔ وہ روزانہ ایک ممبر کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور تفصیلی رپورٹ تیار کر لیتا تھا۔ پھر دوسرے ممبر کے کوائف لے کر بیٹھ جاتا تھا۔

اس نے سات دنوں میں سات ممبروں کی وفاداریاں پرکھ لی تھیں اور سب کی وفاداریاں مشکوک تھیں۔ یہ بات صرف قربان علی تاج کے لئے ہی نہیں بلکہ اس کے حق میں بھی بہتر نہیں تھی۔ اس طرح اس کا مستقبل بھی متزلزل دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ قربان علی نے شہباز کی کامیابی دیکھتے ہوئے ذہن میں اس کے علم کو اس زاویے سے دیکھا تھا کہ وہ جس کا زائچہ بناتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے، حالانکہ یہ تقدیر پر منحصر ہے۔

پندرہ دن گزر گئے تھے لیکن قربان علی تاج اسلام آباد سے واپس نہیں آیا اور نہ ہی اس نے فون پر اس سے کوئی رابطہ قائم کیا۔ سیکرٹری سے پتا چلا کہ وہ اسلام آباد سے انگلینڈ چلے گئے ہیں۔

انگلینڈ ہمارے ہاں کے سیاست دانوں کے لئے سازگار زمین ہے جو بھی وہاں جاتا ہے۔ ہر مشکل سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ آپس میں سیاسی لوگوں کی زیادہ ملاقاتیں بھی وہیں ہوتی ہیں جہاں وہ اپنے ملک کے عوام کی قسمت بناتے اور بگاڑتے ہیں۔

اس عرصے میں احمد شاہ نے مزید لوگوں کی وفاداریاں معلوم کر لیں۔ ان کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے۔ اسے یہ ٹھاٹ باٹ عارضی دکھائی دینے لگا۔ تحفے میں ملی ہوئی کوٹھی ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگی لیکن یہ ایسا تھا جسے وہ نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

ایک رات اچانک قربان علی تاج کا فون موصول ہوا اس نے ایمرجنسی میں اسے اپنے محل پر بُلا بھیجا۔ جب وہ ہال میں پہنچا تو قربان علی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ "قربان صاحب! آپ کب آئے؟.......... بہت دن لگا دیئے؟"

اس نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچانک مجھے ایک صوبے کے چند ممبران

نے اپنے ہاں بلایا تھا۔"

"لیکن مجھے تو پتا چلا تھا کہ آپ انگلینڈ گئے ہوئے ہیں؟"

"وہاں بھی گیا تھا لیکن چوتھے دن ہی لوٹ آیا تھا۔"

"خیر تھی؟"

"اس خرید و فروخت نے تو پریشان کر دیا ہے جو آزاد ممبران پچھلے الیکشن میں جیتنے کے بعد مخالفین کے ہاتھوں بِک گئے تھے' اب وہ ہماری طرف آنے کے لئے اپنی اپنی بولیاں لگا رہے ہیں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے' خرید لیں۔"

"خریدنے سے پہلے' تم سے مشورہ ضروری تھا۔ ان کی وفاداریوں کو پرکھنا ضروری ہے۔ اس لئے ان کے مکمل کوائف لے کر آیا ہوں۔ ہاتھوں کے نشانات نہیں مل سکے۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ زائچے سے بھی بہت سی سچائیاں سامنے آ جائیں گی۔"

"پہلی فائلوں پر کچھ کام کیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا رزلٹ ہے؟"

وہ جواب دینے سے پہلے سوچنے لگا۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اب تک کی اصل پوزیشن اس پر عیاں نہ کی جائے ورنہ اس کے اپنے مفادات کھٹائی میں پڑ سکتے تھے۔ بننے والی بات بگڑ سکتی تھی۔ اس نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "نتائج اگرچہ آپ کے حق میں نہیں ہیں تو مخالفت میں بھی نہیں جا رہے ہیں۔ ویسے ابھی آدھے سے زیادہ ممبران کی وفاداریاں معلوم کرنے کا کام رہ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے' وہ کام ہوتا رہے گا لیکن ایمرجنسی کے طور پر ان آزاد امیدواروں کے بارے میں معلوم کرو۔ ایک صوبے کی بات ہے۔ اس پار یا اُس پار۔"

"جی بہتر! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

"ارے ہاں! یاد آیا۔ تم کسی ذاتی مسئلے پر بات کرنا چاہتے تھے؟"

"جی ہاں۔"

پھر اس نے شروع سے لے آخر تک اپنی داستانِ تلاش قربان علی تاج کو سنا دی اور آخر میں کہا۔ "اگر آپ نے اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے میرا یہ کام کر دیا۔ میری بیٹی مجھ تک پہنچا دی تو میں آپ کا کام زیادہ توجہ اور یکسوئی سے کر سکوں گا۔"

قربان علی تاج سوچنے کے انداز میں اپنا ہاتھ رخسار پر رکھے کچھ دیر بیٹھا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

اثر و رسوخ اور بے پناہ دولت رکھنے والے لوگ کچھ کریں یا نہ کریں لیکن ان کا ہامی بھر لینا ہی کمزور اور مجبور لوگوں کے لئے ذہنی سکون کا باعث بن جاتا ہے۔

احمد شاہ بھی واپس کوٹھی جانے کے لئے گاڑی میں آ کر بیٹھا تو سر کا بوجھ ہلکا سا محسوس ہونے لگا۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر بیٹھ گیا۔

وہ بیچ والی سیٹ پر تھا۔ پیچھے دو گارڈ تھے۔ آگے ڈرائیور جمن کے ساتھ محافظ خاص زمین خان بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی گاڑی ایک سنسان سڑک پر مڑی' ایک جھٹکے سے رک گئی۔ سامنے ہی ایک پجارو کا پچھلا دروازہ اژدھے کی طرح منہ کھولے ہوئے تھا۔ اس کے دائیں طرف دو مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی کلاشنکوف کی نال ان کی گاڑی کی طرف تھیں۔

زمین خان اور ڈرائیور نے بیک وقت احمد شاہ کے پیچھے بیٹھے گارڈ کو آواز دی۔

"تم دونوں دھیرے سے پچھلا دروازہ کھول کر اُتر جاؤ۔"

پھر احمد شاہ سے کہا۔ "سر! جیسے ہی ہیڈ لائٹ آف کرنے کا حکم دوں' آپ بھی ایک دم سے جھک جایئے گا۔"

اس نے کہا لیکن پیچھے سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں دیکھا تو آنکھیں جیسے سکتے میں رہ گئیں۔ احمد شاہ کے چہرے پر کرب تھا۔ پسینے سے شرابور دیدے اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے اب تب میں باہر آنے والے ہوں اور اس کی دونوں کنپٹیوں پر محافظوں کی کلاشنکوف کی نالیں لگی ہوئی تھیں۔

پیچھے بیٹھے ہوئے ایک محافظ نے کہا۔ "جمن اگر شیشے میں دیکھ ہی لیا ہے تو اب اپنے ہتھیار کھڑکی سے باہر پھینک دو۔ کسی قسم کی ہوشیاری سے تمہارے شاہ جی کی جان جا سکتی ہے اور تمہارے قربان علی تاج صاحب کا بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔"

جمن نے اپنی کلاشنکوف کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "زمین خان! ہمارے علی تاج صاحب سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ انہیں دوسروں کی وفاداریاں پرکھنے سے پہلے اپنے محافظوں کی وفاداریاں معلوم کرنی چاہئے تھیں۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے دوسرے گارڈ نے کہا۔ "اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

سامنے کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دو آدمی بھاگتے ہوئے ان کی گاڑی کے قریب آئے' جلدی سے نیچے پڑی ہوئی کلاشنکوفیں اٹھا لیں اور احمد شاہ کی طرف کا دروازہ

کھولتے ہوئے بولے۔ "شاہ جی! آپ نیچے اُتر آئیں۔ ہم بھی تو آپ کو مہمان بنا کر اپنی قسمت دیکھیں کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ آپ دوسروں کو لاکھوں کروڑوں کا فائدہ پہنچا رہے ہیں' ہمیں آپ کے ذریعے کیا ملتا ہے؟"

احمد شاہ نے کہا۔ "تت .... تم لوگ کون ہو؟ اگر کچھ چاہیئے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں یہیں اتنی رقم دے سکتا ہوں جتنی.........."

محافظ خاص نے کہا۔ "شاہ صاحب! یہ ہماری مخالف پارٹی کے کتے لگتے ہیں۔ انہیں پیسے سے نہیں آپ سے غرض ہے۔ یہ اب آپ کو ہمارے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔"

آنے والے میں سے دوسرے شخص نے کہا۔ "جمن بھائی! اچھا ہی ہے' آپ یہی سمجھتے اور دوسروں کو سمجھاتے رہیں۔ سیاست ہے ہی ایسی چیز۔ اب ہم چلتے ہیں۔ تم اخبارات میں مخالفین کے خلاف بیانات دیتے رہنا کہ انہوں نے اپنے بدمعاشوں کے ذریعے تمہارے شاہ جی کو اغوا کروا لیا ہے۔"

پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے احمد شاہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی سپرہائی وے پر پہنچ گئی تھی۔ تیز رفتاری سے آگے کی جانب بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "شاہ صاحب! آپ ریلیکس ہو جائیں۔ ہم لوگ آپ کے دشمن نہیں ہیں بلکہ خیرخواہ ہیں کہ آپ کی وجہ سے ہمیں بھی شاید بہت بڑا فائدہ پہنچنے والا ہے۔"

"وہ ....وہ کیسے؟"

"ہم لوگوں کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم لوگ جنگل کے جانور ہیں۔ ہوا خوری کے لئے شہر کی طرف جاتے ہیں پھر واپس لوٹ آتے ہیں۔"

"کہیں تم لوگ ڈاکو تو نہیں ہو؟"

"جی ہاں' ہم لوگ پڑھے لکھے ماڈرن ڈاکو ہیں۔ جب ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد ہمیں ملازمتیں نہیں ملیں گی' چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے لئے حکومت سے مدد حاصل نہیں ہوگی تو پھر آپ ہی بتائیں' ہم کیا کریں گے؟ پیٹ کھانے کو مانگتا ہے' تن پہننے کے لئے کپڑا مانگتا ہے۔ سر اپنے اوپر چھت اور تحفظ کے لئے چار دیواری مانگتا ہے۔ ہم بے کاری میں اپنے گھر والوں کو بھلا یہ سب چیزیں کیسے دے سکتے ہیں؟"

"تو اس طرح تم لوگ اپنا مقصد حاصل کر لو گے؟"

"کر لو گے کیا؟ کر رہے ہیں۔ خود جنگل کی زندگی اپنائی ہے لیکن شہر میں رہنے والوں

کے لیے آسائشیں اور روٹی کے لیے رقم فراہم کر رہے ہیں۔ ہمارے گھر والوں کو یہی پتا ہے کہ ہم باہر ممالک میں کام کر رہے ہیں۔"

"مجھ سے تم کیا فائدہ اُٹھاؤ گے۔ کیا قربان علی تاج سے تاوان لو گے یا اس کے مخالفین سے سودے بازی کرو گے؟"

"ہمارا ارادہ تو یہی تھا کہ جو بیس پچیس لاکھ روپے دے گا ہم آپ کو اس کے حوالے کر دیں گے لیکن اب ارادہ بدل گیا ہے۔"

"کک .... کیا مطلب' کیا تم مجھے ....؟"

"نہیں شاہ جی نہیں۔ آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ آپ کے پاس تو ایسا علم ہے کہ آپ کو اغوا کرنے کے بعد بھی عیش و آرام سے رکھنے کی تاکید ہے۔ کاش ہم بھی ایسے ہی کسی علم کے ماہر ہوتے۔"

احمد شاہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ انسان بھی عجیب و غریب چیز ہے جو چیز اس کے بس میں نہیں ہوتی اس کی خواہش کرتا ہے اور جو ہوتی ہے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر پاتا۔ اگر فائدہ اُٹھانے کے لیے قدم بڑھاتا ہے تو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے۔"

گاڑی ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ گھنے درختوں کے درمیان چلنے لگی۔ آگے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "آپ کا تجربہ ممکن ہے ٹھیک ہو لیکن میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ اب دیکھیں نا' میں نے آپ کو سیاسی لوگوں کے لیے اغوا کرنا تھا مگر اسلام آباد سے آتے ہوئے فلائٹ پر ایک دلال سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ خاتون اور پندرہ سولہ برس کی لڑکی بھی تھی۔"

احمد شاہ کے دل کی دھڑکن ایک دم سے تیز ہو گئی اسے ایسا لگا کہ وہ شخص' شبیر' ساحرہ اور آسیہ کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ "اس .... اس شخص کا نام شبیر تو نہیں تھا؟"

اس نے کہا۔ "میں صرف اپنا کام کرتا ہوں۔ لوگوں کے نام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔"

"اچھا صرف اتنا بتا دو اس لڑکی کے ہونٹوں کے نیچے تل تو نہیں تھا؟"

"ہمیں صرف دولت سے غرض ہے کسی کی بہو بیٹیوں سے نہیں۔ اس لیے میں نے نہیں دیکھا۔ یوں بھی وہ بیچ والی والی تین سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی سب سے آخری سیٹ پر تھی۔ میرے قریب وہ شخص تھا۔"

"تم اسلام آباد کیوں گئے تھے؟"

"یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ اتفاق سے مجھے وہاں قربان علی تاج نظر آ گیا۔ کسی جگہ ہ
اس کی موجودگی بے معانی نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے خاص آدمیوں سے معلوم کروایا تو
چلا وہ چند خاص قسم کی فائلیں لے کر اسی روز اسلام آباد پہنچا تھا جو آپ تک پہنچا
تھیں۔ آپ اسی وقت سے میرے لیے اہم ہو گئے پھر جب جہاز میں اس شخص نے مج
سے آپ کے بارے میں ذکر کیا تو میں چونک گیا۔ اس نے کہا۔ "وہ آپ کے مجھے بیس لا
روپے دلوا سکتا ہے۔"

"بیس لاکھ! تو کیا میں اتنا قیمتی ہو چکا ہوں؟"

"شاہ جی۔ آپ کی قیمت کیا ہے شاید آپ بھی نہیں جانتے!"

اسی وقت احمد شاہ کے ہاتھ کی مٹھی بند ہونے لگی۔ اس کے اندر سے وہی آوا
آنے لگی تھی۔ "ہاے احمد شاہ۔ دیکھ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ۔ پڑھ اپنے زائچے
پڑھ۔ کوئی انہونی تیری منتظر ہے۔"

لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔ "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"چند میل بعد ایک کھلا میدان ہے وہاں ایک چھوٹا جہاز ہمارا منتظر ہے۔ میں آپ ک
ان لوگوں کے حوالے کر کے اپنی رقم لے کر چلا جاؤں گا۔"

تقریباً گھنٹے بعد وہ جہاز کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کھیت میں دوا اسپرے کرنے والا جہاز
تھا۔ اس میں صرف دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بریف کیس ڈاکوؤں کے حوالے
کیا اور احمد شاہ کو لے کر پرواز کر گئے۔

جہاز جہاں اُترا اس سے چند سو گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی حویلی تھی۔ حویلی تک
پہنچنے کے لیے نزدیک ہی ایک فور وہیل ڈاٹسن کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی بھی ہتھیاروں
سے لیس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جنہوں نے اسے وہاں تک پہنچایا تھا وہ بھی خالی ہاتھ
تھے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جناب شاہ جی۔ چلیے سائیں آپ کے منتظر
ہیں۔"

اسے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ حویلی پہنچا تو سائیں صادق حسین اس
کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ یہاں پر اسے چند محافظ ہتھیار اُٹھائے ہوئے دکھائی دیے۔
اسے دیکھتے ہی سائیں نے کہا۔ "بھلی کرے آئیو بابا! بہت دیر کر دی۔"

پھر اس نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ "بابا۔ شاہ صاحب کو ان کا کمرا دکھاؤ۔"

پھر احمد شاہ سے کہا۔ "شاہ جی۔ مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ آپ

و جس چیز کی تلاش ہے وہ بھی یہاں موجود ہے۔" اس نے چونک کر دیکھا سائیں نے
ید کہا۔ "بابا۔ یہ آپ کے لیے سرپرائز ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ آزادی سے
ندگی گزاریں، ہمارے علاقے میں آپ پر کوئی ایک انگلی بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ اب آپ جا
ر آرام کریں، پھر ملاقات ہو گی۔"

احمد شاہ وہاں سے نکل کر ملازمہ کے ساتھ اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جو اس کے
لیے تھا۔ وہ اندر پہنچتے ہی حیران رہ گیا۔ واقعی اس کے لیے یہ غیر یقینی بات تھی۔ اس کی
وی ساحرہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اتنے برسوں میں
ونوں وہی تھے مگر چہروں پر گزرے ہوئے وقت کے طمانچے پڑتے گئے تھے۔ احمد شاہ کے
الات بدل گئے تھے اس لیے بہت پہلے بُرے حالات کی مار کھانے کے باوجود اس میں
ازگی تھی۔

ساحرہ کو جس حسن و شباب پر ناز تھا، وہ بالکل مرجھا گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا لگ
ہی تھی۔ اس نے جتنی دولت کمائی تھی، اس سے زیادہ خون عیش کدوں کے بلڈ بینک
یں دیا تھا۔

پندرہ برس کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن وہ اس عرصے میں بوڑھی سی لگ رہی
تھی۔ اس نے ایک اِن ہیلر کو منہ میں رکھ کر زور سے اندر سانس کو کھینچا پھر، اِن ہیلر کو
ند کر کے پرس میں رکھ لیا۔

احمد شاہ نے کہا۔ "تم اپنے ساتھ اِن ہیلر رکھتی ہو۔ اس کا مطلب ہے تمہیں سانس
کی بیماری ہے۔ کبھی یہ دوا نہ ملی تو سانس نہیں لے سکو گی، مر جاؤ گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک گہری سانسیں لیتی رہی پھر بولی۔ "اکیلی نہیں مروں گی، تمہیں
ساتھ لے کر مروں گی۔ اس لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"میری بیٹی کہاں ہے؟"

کہاں کی بیٹی! کیا تم نے مجھ سے شادی کی تھی؟ کیا تمہارے پاس نکاح نامہ ہے؟
میرے پاس ہے کہ میں نے ایک رحمت الٰہی نامی شخص سے شادی کی تھی اور وہی آسیہ کا
اپ ہے۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔ ہمارا نکاح حیدر آباد میں ہوا تھا۔ دنیا کے بیشتر گھرانوں میں
نکاح نامے نہیں ہوتے۔ وہ گم ہو جاتے ہیں یا حادثات کی نذر ہو جاتے ہیں جب میں جیل
گیا تو میرے بدن پر صرف لباس تھا۔ نکاح نامہ گھر میں رہ گیا تھا۔ تم نے اسے یقیناً ضائع کر
دیا ہے۔ اسی لئے اتنی ڈھٹائی سے میری بیٹی کے باپ کا نام بدل رہی ہو۔ آخر یہ رحمت

الٹی کون ہے؟"

"ہے نہیں تھا۔ آسیہ کو معلوم ہے کہ احمد شاہ نجومی نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔"

احمد شاہ غصے سے لرز گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا پھر کہا۔ "جس ماں نے تجھے جنم دیا تُو اسے دھوکا دے کر سوتیلے باپ کے ساتھ بیٹی کو لے کر چلی گئی اور اب بیٹی کی نظروں میں تُو نے مجھے قاتل بنا دیا ہے۔"

اس کے دیدے پھیل گئے وہ بولا۔ "اگر تُو زندہ رہنا چاہتی ہے تو ابھی مجھے بیٹی کے پاس لے چل' میں تجھے زندگی بھی دوں گا اور منہ مانگی دولت بھی مگر اس سے سچ کہہ دے کہ میں اس کا باپ ہوں۔"

وہ اسے جنون میں جھنجوڑ رہا تھا اور بیٹی تک پہنچنے کے لیے اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کر رہا تھا پھر اس نے جواب سننے کے لیے اسے ڈھیل دی تو وہ ڈھیلی پڑ کر فرش پر گر پڑی۔

تب اسے یاد آیا کہ وہ سانس کی مریضہ ہے۔ اس نے فرش پر جھک کر اسے دیکھا تو اس کے پھیلے ہوئے دیدے ساکت ہو گئے تھے۔ اس نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھی تو پتا چلا وہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔

وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ جو سوچا نہیں تھا' وہ ہو گیا۔ بیٹی کو بتایا گیا تھا وہ اس کے باپ کا قاتل ہے۔ یہ جھوٹ سہی مگر وہ اس کی ماں کا قاتل بن گیا تھا۔

اسے ساحرہ کی موت کا افسوس تھا' نہ اپنے گرفتار ہونے کا خوف تھا۔ وہ اتنا اہم ہو گیا تھا کہ ماہر مشیروں اور ماہر نجومیوں کو اپنے ساتھ رکھنے والے سیاست دان اسے کبھی جیل نہ جانے دیتے۔

اس نے سہم کر دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں بیٹی آ کر نہ دیکھ لے۔ اس نے ساحرہ کی پھیلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔ اسے اُٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا پھر اس پر ایک کمبل بھی ڈال دیا تاکہ وہ گہری نیند سوتی ہوئی دکھائی دے۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ باپ کے دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ "بیٹی آئی ہے' میری بیٹی آئی ہے۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر دروازے کو کھولا۔ باہر ایک گن مین کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو سائیں نے بلایا ہے۔"

احمد شاہ نے سر گھما کر پلنگ کی طرف دیکھا پھر باہر آ کر دروازے کو بند کر کے اس کی

کنڈی لگا دی پھر اس گن مین ملازم کے ساتھ حویلی کے اس کمرے میں پہنچا جہاں سائیں اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ بابا آؤ۔ آپ تو علم کا سمندر ہیں۔ گنی مہاراج ہیں۔"

احمد شاہ نے انکساری سے کہا۔ "سائیں! آپ شرمندہ نہ کریں اور حکم کریں۔"

"بابا! حکم کیا' میں نے تو آپ کو اپنا ہاتھ دکھانا ہے اور وہ اسے کیا کہتے ہیں .... ہاں زائچہ بنوانا ہے۔"

احمد شاہ نے دیکھا۔ سینٹرل ٹیبل پر قلم اور کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ ایک بہت بڑے وڈیرے نے اسے اسی مقصد کے لیے اغوا کرنے والے سے خریدا ہے۔ اس نے میز کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ کر سائیں سے اس کا پورا نام' ماں کا نام اور تاریخ پیدائش وغیرہ پوچھی۔ اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے سوالات کیے۔ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا گیا پھر اس نے بڑی دیر تک اس کے دونوں ہاتھوں کی لکیریں دیکھیں۔ اس کے بعد اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر پوچھا۔ "آپ معلوم کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"بابا۔ سیاست کا بڑا شوق ہے مجھے۔ میں بھی تو دیکھوں اسمبلی کیسی ہوتی ہے' اس کی سیٹ پر بیٹھ کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

احمد شاہ نے کہا۔ "آپ کے ستارے کہتے ہیں کہ سیاست کا میدان آپ کے لیے موافق نہیں ہے۔ اس میدان میں آپ نقصان اُٹھائیں گے۔"

سائیں صادق حسین نے ایک زور دار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "کہاں سے علم سیکھ کر آئے ہو بابا! آج کل سیاست صرف دولت سے ہوتی ہے اور جس کے پاس دولت ہوتی ہے' وہ اسمبلی میں بھی پہنچتا ہے اور وزیر بھی بن جاتا ہے۔"

"سائیں! دولت تو ملک کے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے لازمی ہے لیکن سیاست میں حکمت عملی اور مقدر کی سکندری لازمی ہے اور یہ دونوں باتیں آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں نہیں ہیں۔"

سائیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور بولا۔ "یعنی میرے پاس عقل نہیں ہے' میں حکمت عملی نہیں جانتا ہوں؟"

وہ پاؤں پٹخ پٹخ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور کہنے لگا۔ "تُو نجومی ہے یا گھسیارا؟ کہتا ہے میں مقدر کا سکندر نہیں ہوں۔ اگر نہیں ہوں تو میرے پاس کروڑوں روپے اور میلوں تک پھیلی ہوئی زمینیں کہاں سے آ گئی ہیں؟"

وہ احمد شاہ کے قریب آیا پھر بولا۔ ”جانتا ہے کہ حکمت عملی کسے کہتے ہیں؟ اسے کہتے ہیں کہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں اور میں ایک تیر سے کئی شکار کرتا ہوں۔ میں نے ان ڈاکوؤں کو بیس لاکھ صرف تیرے لیے نہیں دیے۔ تیری بیٹی کے لیے بھی دیے ہیں۔“

احمد شاہ نے چونک کر سائیں صادق حسین کو دیکھا۔ سائیں نے کہا۔ ”دیکھتا کیا ہے؟ وہ میرا بستر سجائے گی‘ تو میرے ہاتھ کی لکیریں سنوارے گا مگر کیا خاک سنوارے گا۔ جبکہ حکمت عملی کو خود نہیں سمجھتا ہے۔ اسی ایک تیر سے یعنی بیس لاکھ سے میں نے مخالف پارٹی کے قربان علی تاج کو شکست دی ہے۔ تجھے اس سے چھین کر لے آیا ہوں۔“

وہ ٹہلنے کے انداز میں ذرا دور ہو گیا پھر پلٹ کر کہا۔ ”تو میرے مطلب کا نجومی نہ سہی مگر میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔ پتا نہیں تو جیلر شہباز کی طرح قربان علی کو بھی جیتنے والی کیسی چالیں بتانے والا تھا۔ اب نہیں بتائے گا اور قربان علی تیرا محتاج رہے گا۔ اسے کہتے ہیں سیاست۔ تو میرے کسی کام نہیں آئے گا‘ نہ سہی۔ تیری بیٹی کام آتی رہے گی۔ اسے بھی سیاست کہتے ہیں اور تو اُلو کا پٹھا کہتا ہے کہ مجھے سیاست نہیں آتی ہے۔ میں اس میدان میں نقصان اُٹھاؤں گا۔“

احمد شاہ نے بیٹی کے معاملے میں جنونی ہو کر بیوی کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ سائیں پر بھی حملہ کر سکتا تھا مگر اس نے تحمل سے پوچھا۔ ”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آسیہ میری بیٹی ہے؟“

”شبیر محمد اور ساحرہ نے بتایا ہے۔ کیا وہ تیری بیٹی نہیں ہے؟“

”اگر شبیر‘ اور ساحرہ میرے روبرو کہہ دیں کہ وہ میری بیٹی ہے تو پھر بیٹی ہے ورنہ نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”سائیں! یہی تو سیاست ہے۔ آپ شبیر کو یہاں بلائیں۔“

سائیں صادق حسین نے کہا۔ ”ہمارا سودا طے ہوتے وقت اس نے کہا تھا کہ تم اس کے جانی دشمن ہو۔ اس لیے وہ مجھ سے دو لاکھ لے کر ماں بیٹی کو یہاں چھوڑ کر کراچی چلا گیا ہے۔“

”اسی لیے چلا گیا ہے کہ مجھ سے سامنا ہو گا تو حقیقت کھل جائے گی۔ آپ کی لکیر کہتی ہے کہ آپ سیاست نہیں جانتے۔ یقین نہ ہو تو آسیہ کے اسکول والوں سے دریافت کریں‘ وہاں اس کے باپ کا نام رحمت الٰہی ہے۔“

سائیں ڈھیلا پڑ گیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”سچ کڑوا ہوتا ہے۔ حلق سے نہیں اُترتا ہے پھر بھی میری کوئی اور غلطی بتاؤ۔“

”میں جیلر شہباز اور دو مزید امیداروں کو مشورہ دینے والا تھا کہ وہ قربان علی کی حمایت نہ کریں۔ وہ ان تینوں کے ووٹوں کی اکثریت حاصل کر کے اپنی حکومت بنا لے گا۔ بعد میں ان تینوں کو کوئی وزارت دینے سے انکار کر دے گا مگر آپ نے مجھے اغوا کرا کے غلطی کی ہے۔ ایک تو آپ کے بیس لاکھ گئے۔ دوسرے قربان علی ان کے ووٹوں سے آپ حضرات پر حاوی ہو گا۔“

”تم فون کے ذریعے ان تین امیدواروں کو قربان علی کی حمایت سے روک سکتے ہو؟“

”ایک نجومی اپنی باتوں سے متاثر کرنے کے لیے اگلے کے سامنے بیٹھ کر زائچہ بناتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لکیریں دیکھتا ہے تو سامنے والا متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس کی باتوں سے قائل ہو جاتا ہے۔ میں فون کے ذریعے انہیں قائل کرنا چاہوں گا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ آپ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر انہیں گمراہ کرنے والی باتیں بولنے پر مجبور کر رہے ہیں۔“

”واقعی وہ ایسا سوچ سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں اغوا کر کے بڑی غلطی کی ہے۔ میرا ہاتھ دیکھو اور بتاؤ‘ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”غلطی کا توڑ ہو سکتا ہے اگر آپ نیکی کریں گے۔“

”میں نیکی ضرور کروں گا۔“

”آسیہ کم سن ہے۔ پندرہ برس کی ہے۔ آپ اسے بیٹی بنا لیں۔“

”اسے بیٹی بنانے سے سیاسی غلطی کا توڑ کیسے ہو گا؟“

”ہاتھ کی لکیریں بڑی معنی خیز ہوتی ہیں۔ آپ نہیں سمجھ پائیں گے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تینوں آزاد امیدوار ایک ہفتے کے اندر آپ سے دوستی کرنے آئیں گے۔ میں انہیں کیسے قائل کروں گا۔ یہ کل صبح بتاؤں گا۔“

سائیں نے خوش ہو کر اس کے پاس آ کر شرمندگی سے کہا۔ ”میں نے غصے میں آپ کی بے عزتی کی ہے‘ میں وعدہ کرتا ہوں بلکہ قسم کھا کر کہتا ہوں اگر ایک ہفتے کے اندر ان تینوں کو ہمارا حمایتی بنا دو گے تو میں آسیہ کو میلی نظروں سے نہیں دیکھوں گا اور اسے بیٹی بنا لوں گا۔“

احمد شاہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر مجھے اجازت دیں۔ میں ایک ہفتے کے اندر

آپ سے اپنی علمی صلاحیت منوالوں گا۔"

وہ رخصت ہو کر پھر اسی کمرے میں آیا' جہاں پلنگ پر ساحرہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس ماں کو مرہی جانا چاہیے تھا جو بیٹی کا یہاں سودا کر چکی تھی۔

اب بیٹی کو راہِ راست پر لانے کا مسئلہ تھا جو مشکل نہیں تھا۔ وہ جیلر شہباز کے ذریعے مزید دو کیا چار حمایتی سائیں کے لیے لا سکتا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جا کر غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا' پھر جائے نماز بچھا کر نماز شکرانہ ادا کرنے لگا۔

اس نے عبادت کے دوران جانے ان جانے گناہوں اور چھوٹی بڑی خطاؤں کی معافی مانگی۔ التحیات اور درود شریف پڑھنے کے بعد اس نے سلام پھیرا پھر دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتے وقت آنکھیں بند کرلیں۔ بعض نمازی بلند آواز میں دعا مانگتے ہیں' بعض زیر لب مانگا کرتے ہیں اور بیشتر ایسے ہیں جو دل ہی دل میں اپنے رب کو مخاطب کرتے ہیں۔

اس نے بھی دل ہی دل میں کہا۔ "اے غفور الرحیم! میری بیٹی آسیہ کو صراط مستقیم پر لے آ۔ دشمنوں نے اس کے دل و دماغ میں زہر بھر دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھ کر نفرت کرتی رہے گی۔ مجھے کبھی باپ تسلیم نہیں کرے گی۔ اس لیے میں نے اس معصوم پر ایک باپ کا سایہ رکھنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے۔ میرے مالک! میرے معبود! مجھے اپنے ارادوں میں کامیاب کر۔ میں سائیں صادق حسین کے کام آؤں اور وہ آسیہ کو اپنی بیٹی بنا کر اسے خوش حالی اور نیک نامی دیتا رہے.........."

اس نے دعا مانگتے وقت آنکھیں کھول دیں۔ نظریں سیدھے ہاتھ کی لکیروں پر گئیں۔ وہ کبھی اپنا ہاتھ نہیں دیکھتا تھا' دیکھتے ہی لرز گیا۔ وہ لکیریں کہہ رہی تھیں' موت اس کے بالکل قریب ہے۔ ٹھیک اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔

پیچھے سے ایک سریلی مگر کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ "اے احمد شاہ! چور' بدمعاش اور قاتل بھی نمازیں پڑھتے ہیں۔ شاید خدا انہیں معاف کر دیتا ہو مگر میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف نہیں کروں گی۔ تیری سزا موت ہے صرف موت.........."

ابھی باپ کی دعا مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن گولیوں کی آوازوں کے ساتھ باپ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوتا چلا گیا۔ وہ جائے نماز پر سجدے کے انداز میں جھکا پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اسے اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ اس کی صورت دیکھتا۔ اس سے پہلے ہی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

☆------☆------☆

تلاش محبت

ایک معذور حسینہ کا فسانۂ عبرت۔

وہ اپنی محبت کی تلاش میں نکلی اور ایک درندے کے جال میں پھنس گئی۔

وہ خود عیب دار تھی لیکن اپنی محبت میں عیب برداشت نہ کر سکی۔

آغاز سے انجام تک ہر پل رنگ بدلتی شوخ کہانی۔

وہ دونوں اپنی سفید رنگ کی پک اَپ کے سامنے کھڑی ہوئی کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُن دونوں کے لباس بھی سفید ریشم کے تھے۔ اُن میں ایک نوعمر' شوخ اور حسین تھی۔ دوسری عمر دراز تھی' یعنی جوان نظروں کے لئے کھنڈر تھی۔

شوخ حسینہ نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عجیب تھی۔ میرا مطلب ہے کہ تم جوانی میں بے حد خوبصورت رہی ہو گی۔"

بوڑھی عورت نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر اپنا پرس کھول کر بے بی آئینے میں اپنے میک اَپ کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔

"میں اب بھی جوان ہوں اور خوبصورت ہوں۔ پتہ نہیں تمہاری جیسی نوجوان لڑکیاں اپنے سامنے دوسری عورتوں کو بوڑھی کیوں سمجھتی ہیں۔ خطرناک شہزادہ جب بھی موڈ میں آتا ہے تو میری ہی خوابگاہ کا رُخ کرتا ہے۔"

شہزادے کا نام سنتے ہی نوجوان حسینہ کے لبوں سے شوخ مسکراہٹ اُڑ گئی۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اسے وہ پچھلی راتیں یاد آ گئیں' جو ننگے بے رحم شہزادے کی آغوش میں گزری تھیں۔ وہ نفرت سے بولی۔

"میرے سامنے اس خبیث کا نام نہ لو۔"

بوڑھی عورت نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں مونا! اس کا نام آتے ہی جوانی کی شوخیاں کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟ وہ تو صحیح معنوں میں مرد ہے۔"

"اونہہ!" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "بڑا آیا مرد۔ مرد تو اسے کہتے ہیں' جو عورت کی نزاکت اور اس کے بدن کی لطافت کو سمجھتا ہے۔ عورت کی سیج پر آ کر شاعر کی طرح اسے چھوتا ہے اور سپاہی کی طرح لڑتا ہے مگر وہ خبیث تو درندے کی طرح چبا ڈالتا ہے۔"

اس کی بات سن کر بوڑھی عورت قہقہہ لگانے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مونا کی نوجوانی' نادانی اور پُرشباب بدن کا مذاق اڑا رہی ہے۔

"میڈم نوری!" مونا نے اس پر چوٹ کی۔ "تمہاری باتوں سے بھی ظاہر ہے کہ وہ

نازک بدن کی لطافتوں کو نہیں سمجھتا ہے' اسی لئے تمہاری جیسی بوڑھی عورت کی خوابگاہ میں بھی پہنچ جاتا ہے۔"

میڈم نوری تلملا کر بولی۔ "بکواس مت کرو۔ آج میں شہزادے سے ضرور شکایت کروں گی کہ تم اسے خبیث کہتی ہو۔"

یہ دھمکی سنتے ہی مونا زرد پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے میڈم نوری کا بازو تھام کر التجا کی۔ "مجھے معاف کر دو' میں تو مذاق کر رہی تھی۔ اگر تم شکایت کرو گی تو وہ سزا دینے کے لئے آج رات پھر میرے پاس چلا آئے گا اور پہلے سے زیادہ درندہ بن جائے گا۔ وعدہ کرو میڈم کہ تم شکایت نہیں کرو گی۔"

وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔ "تم بھی وعدہ کرو کہ میرا مذاق نہیں اڑاؤ گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں نے تو صرف مذاق کیا تھا ورنہ تم بوڑھی نہیں ہو۔ اگر عمر کا حساب کیا جائے تو تم مجھ سے دو چار گھنٹے بڑی ہو۔"

وہ خوش ہو کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "ہم عورتوں کو ایک دوسری پر طنز نہیں کرنا چاہئے۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی شہزادے سے نفرت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک خطرناک فائٹر ہے۔ اس نے مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ حاصل کیا ہے مگر آج کل عورتیں بھی مارشل آرٹ میں نام پیدا کر رہی ہیں۔"

مونا نے کہا۔ "ہاں' اس سلسلے میں' میں نے مرجانہ کا نام سنا ہے۔ شہزادہ خود ہی ایک دن کہہ رہا تھا کہ وہ خطرناک بلا ہے اور ایسی پھرتیلی ہے کہ لڑتے وقت بجلی کی طرح اِدھر سے اُدھر لپکتی ہے۔"

میڈم نوری نے ایک سگریٹ سلگا کر کش لگانے کے بعد کہا۔

"یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اسی دلیر مرجانہ کو پھانسنے کے لئے یہاں جال بچھانے آئی ہیں۔"

"مجبوری ہے۔ یہ باس کا حکم ہے۔ ہم عورت ہو کر ایک عورت کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہیں۔"

وہ کہتے کہتے یک لخت خاموش ہو گئی کیونکہ اچانک ہی قریب کی چٹان سے ایک شخص کود کر اُن کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ چھ فٹ کا قد آور جوان تھا۔ اس کے جبڑے سخت اور آنکھیں چیتے کی طرح چمکیلی تھیں۔ موٹا کھردرا لباس پہننے کے باوجود اس کا کسرتی بدن حسین نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا لیکن اس کی کمر سے بندھا ہوا سیاہ بیلٹ بتا رہا تھا کہ وہ درندہ' خبیث' مارشل آرٹ کا شہزادہ ہے۔

اسے دیکھتے ہی مونا سہم کر ایک طرف ہو گئی۔ شہزادے نے وحشی درندے کی طرح دانت نکال کر اسے یوں دیکھا جیسے تصور میں اسے چبا رہا ہو۔ پھر اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہماری متوقع کار دس منٹ میں یہاں پہنچنے والی ہے۔ تم دونوں تیار ہو؟"

"ہم بالکل تیار ہیں۔" میڈم نوری نے کہا۔ "جناب! کیا اس آنے والی کار میں مرجانہ ہو گی؟"

شہزادے نے ناگواری سے جواب دیا۔ "وہ حرافہ ایسی تر نوالہ نہیں ہے کہ تم دونوں اسے حلق سے اتار لو گی۔ ابھی صرف اس کے لئے جال بچھایا جا رہا ہے۔ اس آنے والی کار میں اس کا ایک عاشق سرفراز احمد خان ہے۔ اب تم دونوں ابتدائی کام شروع کر دو۔ میں اس سامنے والی چٹان کے پیچھے چھپا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ سامنے ایک چٹان کے پیچھے جانے لگا۔ مونا پک اپ کی ڈگی کے پاس آ گئی۔ اسے کھول کر اس نے گاڑی کا پہیہ کھولنے کا سامان نکالا۔ پھر ایک پہیئے کے نیچے جیک لگا کر ہینڈل گھماتی ہوئی بولی۔

"یہ شہزادہ نہیں' حرامزادہ ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اسے کچا چبا جاؤں۔"

میڈم نوری نے کہا۔ "عورت کی گالیوں سے مرد نہیں مرتے' انہیں مارنے کے لئے ان کی طرح شہ زور بننا پڑتا ہے' جیسے مرجانہ بن گئی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ ایک دن یہ مرجانہ کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو........." مونا دل کی گہرائیوں سے بولی۔

وہاں سے ایک ہزار فٹ کی دوری پر ایک مرسڈیز کار نظر آ رہی تھی۔ اس کار کی پچھلی سیٹ پر بارڈر پولیس کا ایک انسپکٹر سرفراز احمد خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بظاہر کار کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا لیکن چشم تصور میں مرجانہ کا شبابی بدن انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جمناسٹک کے کرتب دکھانے والی عورت کا جسم کتنا پُرکشش ہوتا ہے' اس کا علم مرجانہ کو دیکھ کر ہوتا تھا مگر وہ جتنی حسین تھی' اتنی ہی سنگین بھی تھی۔ کوئی اس کے بدن کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے مطلب کی بندی تھی۔ جس رات وہ جعلی ادویات کو سرحد پار بھیجتی تھی اس رات' وہ انسپکٹر سرفراز کو اپنی جوانی کے کچھ رنگین لمحات رشوت کے طور پر دیتی تھی۔ سرفراز اور مرجانہ کے درمیان کاروباری لین دین تھا۔ سرفراز اس کی جوانی کی سوغات لیتا تھا اور غیر قانونی طور سے اس کی جعلی ادویات کو سرحد پار بھیجنے کی اجازت دیتا تھا۔

اس وقت بھی وہ خیال ہی خیال میں مرجانہ کے سیمابی بدن کو اپنی آغوش میں سجا رہا
۔ اتنے میں کار کی رفتار سست ہو گئی۔ ڈرائیور نے کہا۔

"جناب! وہ دیکھئے۔ وہاں دو خواتین اپنی گاڑی کا پہیہ بدل رہی ہیں۔ اگر آپ
زت دیں تو میں ان کی مدد کروں؟"

انسپکٹر سرفراز نے دور کھڑی ہوئی پک اپ کو' مونا اور میڈم نوری کو ناگواری سے
ھا۔ وہ جلد از جلد مرجانہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ راستے کی وہ رکاوٹ اسے ناگوار گزر
ی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ ڈیوٹی کے دوران میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔"

گاڑی تیزی سے آگے بڑھی لیکن پک اپ کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے یوں
ی کہ سرفراز اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرا گیا۔ پھر اس نے جلدی سے سنبھل کر جھلاتے
ئے کہا۔

"اِڈیٹ۔ نان سنس' کیا اس طرح بریک لگائی جاتی........."

وہ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ ڈرائیور اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ وہ پچھلی سیٹ کے
وازے کے سامنے ریوالور تانے کہہ رہا تھا۔

"جناب! یہاں اتر جایئے۔ یہ آپ کی زندگی کا آخری اسٹیشن ہے۔ اگر آپ نے
ک بننے کی کوشش کی تو یہاں سے موت کا سفر شروع ہو جائے گا۔"

سرفراز اپنے غدار ملازم کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اتنی آسانی سے ایک
م کے ہاتھوں مرنا کسی طرح پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے کار کے اندر سے دیکھا وہ
وں عورتیں ڈرائیور کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور ان میں سے ایک بوڑھی
ت ڈرائیور سے کچھ کہہ رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سرفراز کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے
جھٹکے سے دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔ ڈرائیور لڑکھڑا گیا' اس کے ہاتھ سے
الور چھوٹ کر گر پڑا لیکن میڈم نوری نے فوراً اس گرتے ہوئے ریوالور کو اٹھا لیا۔
وقت تک سرفراز اچھل کر کار سے باہر آ گیا تھا۔ میڈم نوری نے للکار کر کہا۔

"بس' اب کوئی حرکت نہ کرنا' ورنہ ایک چھٹانک سیسہ تمہارے بدن میں اُتر جائے
"۔

اتنی دیر میں ڈرائیور سنبھل چکا تھا' اس نے پیچھے سے آ کر سرفراز کو اپنی مضبوط
وں میں جکڑ لیا۔ میڈم نوری نے کہا۔

"مونا سرنج لاؤ۔"

مونا تیزی سے پلٹ کر پک اپ کی طرف گئی اور وہاں سے ایک دوا بھری ہوئی سرنج لے آئی پھر اس نے کپڑے کے اوپر ہی سے سرفراز کے بازو میں اس کی سوئی کو پیوست کر دیا۔ دوا کا بدن میں داخل ہونا تھا کہ سرفراز ڈرائیور کے بازوؤں میں جھول گیا۔

اتنے میں شہزادہ چٹانوں کے عقب سے نکل آیا۔ اس نے ڈرائیور کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"شاباش! تم نے اپنے مالک سے بے وفائی کی ہے لیکن تم میرے کام آئے ہو۔ میں تمہیں بڑا انعام دوں گا۔ میڈم نوری اسے دس ہزار روپے دے دو۔"

اس کے حکم کے مطابق میڈم نوری اپنا پرس کھولنے لگی۔ ڈرائیور انعام لینے کے لئے اس کی طرف پلٹ گیا۔ اسی وقت شہزادے نے کراٹے کا کھڑا ہاتھ اس کی گدی پر جڑ دیا۔ وہ مارشل آرٹ کا شہزادہ تھا۔ اس نے ایک ہی ہاتھ میں اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ مونا نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں۔ دوبارہ جب اس نے آنکھ کھولی تو شہزادہ ڈرائیور کی لاش کو مرسڈیز کی اگلی سیٹ پر بٹھا چکا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بیبیو' دور کھڑی رہ کر تماشا دیکھو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا پہاڑی کے آخری سرے کی طرف لے گیا' اس آخری سرے کے بعد گہری پستی تھی اور اس پستی میں دریائے توران بہتا تھا۔

مونا اور میڈم نے دیکھا۔ کار تیز رفتاری سے پہاڑ کی بلندی پر بھاگتی چلی گئی۔ پھر آخری سرے تک پہنچنے سے پہلے شہزادے نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ڈگمگائی' پھر وہ اگلے حصے کی طرف سے الٹ گئی اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک زبردست دھماکہ سنائی دیا۔ دریائے توران کا پانی اپنی قریبی چٹانوں پر پھیلنے لگا تھا۔ شہزادے نے وہاں سے واپس آ کر بے ہوش انسپکٹر سرفراز کو اپنے کاندھے پر لاد لیا۔ پھر اس نے مونا کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور قہقہے لگاتا ہوا چٹانوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

☆------☆------☆

مرجانہ اپنی کوٹھی کے ایک بڑے سے ہال میں اپنے ماتحتوں کو لڑنے کی ٹریننگ دے رہی تھی۔ اس کے بدن پر ایک قمیض اور پائجامہ تھا اور کمر سے ایک سیاہ بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ سیاہ بیلٹ بتا رہا تھا کہ وہ بھی کتنی خطرناک فائٹر ہے۔ وہ صرف ننگے ہاتھوں سے اپنے دشمنوں کی ہڈیاں توڑ سکتی تھی لیکن اس وقت اس کے آس پاس جو لوگ حملہ کر رہے

تھے' وہ اس کے دشمن نہیں تھے۔ وہ انہیں سکھا رہی تھی کہ چاروں طرف سے گھرنے کے بعد کس طرح اپنے حواس درست رکھنے چاہئیں اور سامنے دشمن سے لڑتے وقت پیچھے سے حملہ کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ وہ سمجھاتی جا رہی تھی اور انہیں حملہ کرنے کی دعوت دیتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف سے اس پر حملے ہو رہے تھے لیکن وہ بجلی کی طرح اِدھر اُدھر لپک رہی تھی اور تمام لوگوں کو بیک وقت حملہ کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ پینترے بدل کر اس طرح نکل جاتی تھی کہ اس کے مقابلے پر ایک وقت میں ایک یا دو آدمی ہی آ سکتے تھے۔

اس ٹریننگ کے دوران اس کا دستِ راست واجد آ گیا۔ اس نے کسی قسم کا مخصوص اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی مرجانہ نے کھیل ختم کر دیا۔ پھر بڑے ہال سے نکل کر واجد کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ واجد نے کہا۔

"آپ نے اپنی ایک مرسڈیز انسپکٹر سرفراز کو تحفے کے طور پر دی تھی۔"

مرجانہ نے اس کی تصدیق کی۔

"تحفے کے طور پر نہیں' رشوت کے طور پر دی تھی۔ کیا اس مرسڈیز کو کوئی حادثہ پیش آیا؟"

"جی ہاں۔ اس کار کو دریائے توران سے نکالا گیا ہے' ساتھ ہی ایک شخص کی لاش پائی گئی ہے۔"

"کیا تم پولیس اسٹیشن گئے تھے؟"

"جی نہیں' ہمارے ایک خاص آدمی نے اس حادثے کی اطلاع دی ہے۔ میں نے سوچا مرسڈیز کار کا رجسٹریشن نمبر آپ کے نام پر ہے' انکوائری کے بعد آپ کو تھانے میں طلب کیا جائے گا اسی لئے اطلاع دینے آ گیا ہوں۔"

"اچھی بات ہے' تم باہر جاؤ' میں لباس بدل کر آتی ہوں۔"

واجد باہر چلا گیا۔ وہ لباس بدلتے وقت سوچنے لگی کہ کار میں کسی کی لاش ہو سکتی ہے؟ کیا انسپکٹر سرفراز مارا گیا ہے؟

یہ سوچ کر اسے دکھ ہوا کیونکہ انسپکٹر سرفراز بڑے کام کا آدمی تھا۔ اس کے تعاون سے سمگلنگ کے کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ اس کی موت کے متعلق سوچتے وقت وہ کرنل جِم کو بھی یاد کر رہی تھی۔ کرنل جم بھی اس کی طرح جعلی ادویات سمگل کرتا تھا۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ دونوں گروہوں میں اکثر تصادم ہوتا رہتا تھا' اس تصادم میں مرجانہ کا پلہ بھاری رہتا تھا کیونکہ پہلے کرنل جِم کے پاس مرجانہ کے

مقابلے کا کوئی فائٹر نہیں تھا اس لئے اس نے مرجانہ سے صلح کرلی تھی کہ وہ دونوں اپنی جگہ امن و امان سے کاروبار کریں گے اور ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن پچھلے چند ماہ سے کرنل جِم کے تیور بدل گئے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں سے شہزادہ ایک بلیک بیلٹر کو پکڑ لایا تھا۔

مرجانہ کو اپنے آدمیوں سے رپورٹ ملی تھی کہ شہزادہ واقعی خطرناک ہے۔ تنہا کے آدمیوں کو مار بھگاتا ہے۔ اس نے مرجانہ کے کتنے ہی آدمیوں کی ہڈیاں توڑ کر انہیں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ مرجانہ نے شکایت کی تو اسے جواب ملا۔

"اپنا گروہ توڑ کر ہمارے گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ تم عورت ہو' ہمارے مقابلے پر کاروبار نہیں چلا سکو گی۔"

کرنل جِم اور مرجانہ کبھی ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرتے تھے۔ وہ یا تو فون گفتگو کرتے تھے یا اپنے قاصدوں کے ذریعے معاملات طے کرتے تھے۔ مرجانہ نے کرنل جِم کو کہلا بھیجا۔

"پہلے تم مجھے عورت نہیں سمجھتے تھے' سرحد کی شیرنی کہتے تھے' میری طاقت سے مرعوب ہو کر تم نے صلح کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو نہیں چھیڑیں گے۔ شہزادہ جیسے ایک فائٹر کو خرید کر یہ نہ سمجھو کہ تم مجھے جھکنے پر مجبور کر دو گے۔ جس دن وہ فائٹر میرے ہتھے چڑھے گا۔ اس روز میں اس کی گردن توڑ کر تمہارے پاس اس کی لاش کا تحفہ بھیجوں گی۔ یہ سب جانتے ہیں' سب مانتے ہیں کہ مرجانہ جو کہتی ہے' کر گزرتی ہے۔"

مرجانہ نے سیاہ رنگ کی ساڑھی پہن کر اپنے آپ کو قد آدم آئینے میں دیکھا۔ ساڑھی کا روپہلا بارڈر اس کی گوری رنگت کی طرح جگمگا رہا تھا' اس لباس کی سیاہ رات میں اس کا حسن چاندنی کی طرح چٹک رہا تھا۔ وہ جب بھی سوشل گیدرنگ میں جاتی یا کبھی پولیس اسٹیشن جانا پڑتا تو ایسے وقت شریف عورتوں کی طرح ساڑھی یا شلوار کرتہ پہن لیا کرتی تھی۔ اس لباس میں وہ صرف ایک عورت نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ اس لباس میں کتنی بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔

وہ کوٹھی سے باہر آ کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور واجد سے کہا۔ "تھانے کی طرف چلو۔"

واجد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے حیرانی سے دیکھا لیکن کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے چپ چاپ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا

دی۔ راستے میں مرجانہ نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کار دریا میں کیسے گری ہو گی؟"

واجد نے جواب دیا۔ "انسپکٹر سرفراز نشے میں کار ڈرائیو نہیں کرتا۔ جب سے اس نے شراب پینی شروع کی ہے ایک ڈرائیور کو ملازم رکھ لیا ہے۔ اگر وہ آپ سے ملنے آ رہا تھا تو اس حادثے کے نتیجے میں دو لاشیں ملنی چاہئیں ایک انسپکٹر کی دوسری ڈرائیور کی........"

"پھر تو وہ ڈرائیور کی لاش ہو گی۔ کرنل جِم انسپکٹر کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ صرف میری کار کو نقصان پہنچا کر مجھے چیلنج کر رہا ہے۔"

"مادام! کرنل پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے تو آپ کو اغوا کرنے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔"

"میں جانتی ہوں وہ مجھے کسی طرح بے بس کر کے اپنا قیدی بنانے کے بعد مجبور کرے گا کہ میں اپنا گروہ توڑ دوں اور شہزادے کی طرح اس کی دست راست بن کر کام کروں۔"

"چیونٹی کی جب موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔ کرنل بھی اپنے پر نکال رہا ہے' آپ کے ہاتھوں اس کی موت یقینی ہے۔"

وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

"کرنل جِم مٹی میں رینگنے والا ایک کیچوا ہے۔ اسے تم بھی پیروں سے کچل سکتے ہو۔ میں اس انتظار میں ہوں کہ کس دن شہزادے سے ٹکراؤ ہو گا جس دن میں شہزادے کی گردن توڑوں گی' اس دن کرنل جِم کی کمر خود بخود ٹوٹ جائے گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ تھانیدار نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"مادام! میں آپ کے پاس ابھی آنے ہی والا تھا۔ کیا آپ کو کار کے حادثے کی اطلاع مل گئی ہے؟" مرجانہ نے انجان بن کر پوچھا۔

"کون سی کار کا حادثہ؟ میں تو انسپکٹر سرفراز احمد خان سے ملنے آئی ہوں۔"

"میں انہی کی کار کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ کار آپ نے انہیں استعمال کے لئے دی تھی' آج صبح وہ دریائے توران سے نکالی گئی ہے۔ اس کار کی اگلی سیٹ پر ان کے ڈرائیور کی لاش پائی گئی ہے لیکن انسپکٹر صاحب لاپتہ ہیں۔ ہم نے ان کی کوٹھی میں فون کیا تھا' وہاں سے ان کے ملازم نے بتایا کہ وہ صبح اپنے ڈرائیور کے ساتھ کوٹھی سے روانہ ہو گئے تھے۔"

مرجانہ نے پوچھا۔ "تو پھر انسپکٹر کہاں غائب ہو گئے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کار میں ان کا بریف کیس بھی پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کار میں موجود تھے۔ اگر موجود تھے تو ان کی لاش کار سے نکل کر دریا میں بہہ گئی ہوگی یا پھر وہ کہیں راستے میں اتر گئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شام تک اپنی خیریت کی اطلاع پہنچا دیں۔"

یہ بات سن کر مرجانہ سوچ میں گم ہو گئی۔ وہ اپنے طور پر یہ خیال قائم کر رہی تھی کہ انسپکٹر سرفراز کو کرنل جِم کے آدمیوں نے اغوا کیا ہے' کیونکہ انسپکٹر سمگلنگ کے سلسلے میں میرا ایک مضبوط حمایتی اور مددگار تھا۔ کرنل جم اسے غائب کر کے میرے کاروبار کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

تھانیدار مرجانہ کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"مادام مرجانہ آپ انسپکٹر صاحب کی دوست ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ان کی مدد سے سمگلنگ کا کاروبار کرتی ہیں۔ میں آپ لوگوں کے خلاف کچھ کہتے ہوئے اس لئے ڈرتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب بڑے اثر و رسوخ والے ہیں۔ وہ مجھے ملازمت سے برطرف کر سکتے ہیں لیکن آپ کی اطلاع کے لئے میں یہ عرض کر دوں کہ انٹیلی جنس والے آپ لوگوں کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کرنل جِم' مادام مرجانہ اور شہزادہ ان کی نظروں میں ہیں۔ انٹیلی جنس کا ایک آفیسر پچھلے دنوں انسپکٹر صاحب کے پاس آیا تھا اور بڑی سختی سے آپ لوگوں کے متعلق معلومات حاصل کر رہا تھا۔"

مرجانہ نے پوچھا۔ "انٹیلی جنس کا افسر کون ہے؟ کیا آپ اس سے میری ملاقات کرا سکتے ہیں؟"

"مادام! میں اسے نہیں جانتا۔ یہ بات مجھے انسپکٹر صاحب نے بتائی ہے۔ وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کون تھا؟ انہوں نے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ وہ اندھیرے میں آیا تھا اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد کوئی نقش قدم چھوڑے بغیر چلا گیا۔"

"ایسی صورت میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی سرکاری افسر تھا؟"

تھانیدار نے جواب دیا۔

"اس کی آمد سے پہلے ہی انٹیلی جنس والوں کی طرف سے انسپکٹر صاحب کو اطلاع دی گئی تھی کہ فلاں وقت ایک آفیسر ان کے پاس آئے گا وہ اس کے لئے ضروری معلومات فراہم کریں۔"

یہ سن کر مرجانہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک گہری سنجیدگی سے سوچتی

رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"اچھی بات ہے میں انٹیلی جنس والوں سے نمٹ لوں گی۔"

تھانے سے باہر آ کر اس نے واجد سے کہا۔

"تم کسی ٹیکسی میں واپس چلے جاؤ' میں جائے واردات پر پہنچ کر اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اسے اسٹارٹ کرنے لگی۔ واجد نے کہا۔

"مادام! ایسی جگہ آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے۔"

اس نے غرا کر واجد کو دیکھا پھر ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بولی۔ "موت ہمیشہ تنہا آتی ہے اور میں ان کے لئے موت بن کر جا رہی ہوں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی اور ڈرائیو کرتی ہوئی دور نکل گئی۔ بیس منٹ تک اس کی کار ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں پر دوڑتی رہی۔+ پھر ایک جگہ بلندی پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ پھر ڈیش بورڈ سے ایک دوربین نکال کر باہر آ گئی۔ وہ بہت دیر تک اور بہت دور تک بھٹکتی رہی اور آنکھوں سے دوربین لگا کر دور نشیب میں اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جو چٹانوں کے درمیان سے گزرتا تھا اور جہاں صبح کے وقت مونا' میڈم نوری اور شہزادے نے اس کے سب سے بڑے معاون انسپکٹر سرفراز کو شکار کیا تھا لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ راستہ ویران نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پہاڑی کے آخری سرے پر آ گئی اور دوربین سے نیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ نیچے بہت دُور تک ٹیڑھی میڑھی چٹانوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ان چٹانوں کے بیچ ایک شخص نظر آیا۔ مرجانہ نے دوربین کے لینس کو دوبارہ ایڈجسٹ کرتے ہوئے دیکھا تو وہ واضح طور سے نظر آنے لگا۔ وہ ایک چٹان پر اوور کوٹ بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا کیونکہ تمام جسم کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک ایئر گن رکھی ہوئی تھی۔ شاید پرندوں کا شکار کرنے آیا تھا اور شکار کرنے کی بجائے ان چٹانوں کو بیڈ روم سمجھ کر آرام فرما رہا تھا۔ مرجانہ نے نیچے کی طرف جھک کر اُسے آواز دی۔

"اے' تم کون ہو؟ اوپر آؤ........."

اس نے اوپر کی جانب دیکھا۔ پھر ہاتھ ہلا کر بولا۔

"میں جانتا ہوں کبھی کبھی موت خوبصورت عورت کا روپ بدل کر آتی ہے۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ جب اوپر آ گئی ہو تو نیچے بھی چلی آؤ۔ مرنے کے لئے یہ جگہ

بہت مناسب ہے۔"

مرجانہ نے غصے سے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں کہتی ہوں اوپر آؤ ورنہ سچ مچ تمہیں موت کی نیند سلادوں گی۔"

"ارے جاؤ ایک تو روح قبض کرنے آئی ہو' اوپر سے دھمکی دیتی ہو۔ میں بلندی پر پہنچ کر مرنا نہیں چاہتا۔"

مرجانہ آنکھوں سے دوربین ہٹا کر سوچنے لگی۔

"یہ کم بخت کون ہو سکتا ہے' میرا مذاق اڑانے کے انداز میں باتیں کر رہا ہے۔ اگر یہ میرے دشمنوں میں سے ہے تو پھر آج اس کی موت آگئی ہے۔"

یہ سوچتی ہوئی وہ کار کے پاس آئی' اس کی ڈگی کھول کر ایک مضبوط رسی نیچے کی طرف پھینک دی۔ وہ رسی کی مدد سے نیچے اُترنا چاہتی تھی۔ نوجوان نے آواز دی۔

"اے تم ساڑھی پہنے ہوئے ہو۔ میں یہاں لیٹے لیٹے تمہارے اترنے کا نظارہ نہیں کر سکوں گا۔ ساڑھی گڑبڑ کرے گی۔ بہتر ہے کہ تم اوپر ہی رہو میں خود تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اوپر آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مرجانہ نے جھنجلا کر کہا۔

"دیر نہ کرو جلدی آؤ۔ مرد کو ایک سپاہی کی طرح چاق و چوبند ہونا چاہئے۔"

وہ اپنا تمام سامان باندھ چکا تھا۔ مرجانہ نے سمجھا کہ اب وہ اوپر آئے گا لیکن وہ ایک تھیلے سے آئینہ نکال کر کنگھی کرنے لگا۔ مرجانہ دانت پیستی ہوئی اور مٹھیاں بھینچتی ہوئی اپنے غصے کو ضبط کرنے لگی۔ اگر وہ قریب ہوتا تو اسے ایک ہی ہاتھ جما کر اس کی ساری نزاکت دور کر دیتی۔

خدا خدا کر کے وہ رسی کو تھام کر اوپر چڑھنے لگا لیکن چڑھنے کے انداز میں بھی ایسا اناڑی پن تھا کہ کبھی کبھی اس کا پاؤں چٹان پر سے پھسل جاتا تھا اور وہ رسی کو پکڑے اِدھر سے اُدھر جھولنے لگتا تھا۔ مرجانہ رسی کو پکڑ کر اس طرح کھینچنے لگی جیسے کنویں سے ڈول کھینچ رہی ہو۔ وہ نوجوان بہت وزنی تھا کھینچتے کھینچتے مرجانہ کو پسینہ آنے لگا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اس احمق کو دیکھ کر وہ کسی قدر نرم پڑ گئی۔ وہ خوبرو اور صحت مند نوجوانوں کو پسند کرتی تھی اور جب تک ان سے جی نہ بھرتا' انہیں اپنا مہمان بنا کر رکھتی تھی لیکن اسے بزدلوں سے نفرت تھی' اس نے ظاہری نفرت سے کہا۔

"تم کیسے مرد ہو' اتنے اونچے پورے جوان ہو کر ابھی تک بچوں کی طرح اڑگن

سے کھیلتے ہو۔"

"میں پرندوں کا شکار کرنے آیا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے رنگ برنگے پرندوں کا شکار کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔"

"تم کب سے اس چٹان پر تھے؟"

"میں کل شام کو وہاں پہنچا تھا۔ سوچا تھا کہ دو چار پرندوں کا شکار کرنے کے بعد واپس چلا جاؤں گا لیکن مجھ پر اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ کبھی کبھی میں اسی طرح اچانک بیمار پڑ جاتا ہوں۔ میں اختلاجِ قلب کا مریض ہوں۔ یہ دیکھو.........."

اس نے تھیلے میں سے ایک دوا کی شیشی نکال کر دکھائی اور کہا۔

"ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے یہ دوا میرے لئے تجویز کی ہے۔ اسے پینے کے بعد آرام آجاتا ہے۔"

مرجانہ نے دوا کی شیشی پر لگے ہوئے لیبل کو پڑھا پھر اسے واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم نے پچھلی رات اس چٹان پر گذاری تھی؟"

"ہاں۔ اختلاج قلب سے نجات ملی تو بخار چڑھ گیا۔ رات بھر میری عجیب حالت رہی۔ کبھی سوتا رہا کبھی جاگتا رہا۔ صبح تک میں اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ چیخ چیخ کر کسی کو مدد کے لئے بھی نہیں پکار سکتا تھا۔ صبح میں نے دیکھا اس راستے پر ایک پک اپ آکر کھڑی ہو گئی تھی اور اس میں سے دو عورتیں نکل کر باتیں کر رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے ہی قد و قامت ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ پھر انہیں کچھ کہہ کر اس سامنے والی چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے انہیں آواز دی لیکن آواز اتنی کمزور تھی کہ وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ میں نے رومال نکال کر دو تین بار ہلایا تو میرے ہاتھ دکھنے لگے۔"

مرجانہ نے ناگواری سے کہا۔

"تم دیکھنے میں اتنے ہٹے کٹے نظر آتے ہو مگر عورتوں سے زیادہ نازک ہو۔ تم جیسے مرد کو شرم سے مرجانا چاہئے۔"

"میں تو بخار سے مر رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر سمجھا کہ واقعی میری موت آگئی ہے۔"

"کیا میں تمہیں موت کی طرح بھیانک نظر آتی ہوں؟"

"میں ہر خوبصورت عورت کو یہی سمجھتا ہوں۔ ایک حسین لڑکی میری زندگی میں آئی تھی لیکن جب وہ میرے گھر میں آئی اور میرے باپ کی دولت کو دیکھا تو میری سوتیلی ماں بن گئی۔ عورت جتنی چکنی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ دولت کی طرف پھسلتی ہے۔ اب

اس سوتیلی ماں نے مجھ پر روایتی مظالم توڑ توڑ کر مجھے اس قدر توڑ دیا ہے کہ میں زندہ رہنے کی بجائے ہر گھڑی موت کی تمنا کرتا ہوں۔"

مرجانہ نے کہا۔ "میری طرف سے تم ابھی مرجاؤ فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے کام کی باتیں کرو۔ یہ بتاؤ کہ وہ شخص چٹان کے پیچھے کیوں گیا تھا؟"

"صبح کا وقت تھا' ایسے وقت لوگ کھیتوں یا چٹانوں کے پیچھے ہی جاتے ہیں۔"

مرجانہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے جی میں آیا کہ ایک اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کردے لیکن وہ کمزوروں اور بزدلوں پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتی تھی۔ وہ غصے کو ضبط کرتی ہوئی بولی۔

"جو پوچھتی ہوں' اس کا صحیح جواب دو۔ وہ چٹان کے پیچھے کیوں گیا تھا؟"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہ کیوں گیا تھا۔ جب ایک مرسڈیز کار وہاں پہنچی تو وہ چٹان کے پیچھے سے نکل آیا۔"

مرسڈیز کار کا ذکر آتے ہی مرجانہ نے اس کے بازو کو اپنے مضبوط شکنجے میں لے کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا وہاں مرسڈیز کار آئی تھی؟ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

"پھر تو میں نے ایسا منظر دیکھا ہے جسے کبھی بھلا نہیں سکتا۔ پہلے اس کار کے ڈرائیور نے ریوالور دکھا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو باہر آنے پر مجبور کیا۔ جب وہ باہر آیا تو اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر دیا گیا۔ پھر چٹان کے پیچھے سے نکلنے والے آدمی نے ڈرائیور کی گردن پر ایک ایسا ہاتھ رسید کیا کہ وہ بھی زمین پر گر پڑا۔ کیا ایک ہاتھ مارنے سے آدمی مرجاتا ہے؟"

مرجانہ نے کہا۔ "اگر میرا ایک ہاتھ تمہاری گردن پر پڑ جائے تو تمہیں تجربہ ہو جائے گا لیکن اس تجربے کو سمجھنے کے لئے تم زندہ نہیں رہو گے۔ تم مجھے بھی فضول باتوں میں الجھا دیتے ہو۔ چلو بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

وہ بتانے لگا کہ کس طرح ڈرائیور کو کار کی اگلی سیٹ میں ٹھونس کر اور اس کار کو آگے لے جا کر دریا میں گرایا گیا۔ اس کے بعد وہ آدمی اُس آدمی کو کاندھے پر اٹھا کر لے گیا جسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کیا گیا تھا۔

مرجانہ سمجھ گئی کہ چٹان کے پیچھے سے نکل کر ڈرائیور کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ مارنے والا شہزادہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہی انسپکٹر سرفراز کو کاندھے پر اٹھا کر لے گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی اجنبی نوجوان سے بولی۔

"چلو اٹھو۔ تم اس واقعہ کے عینی شاہد ہو' میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گی۔"

وہ زمین پر سے اٹھ کر اپنا سامان اُٹھانے لگا۔ مرجانہ نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خاکسار کو کامران کہتے ہیں۔ مجھے شاعری سے گہری دلچسپی ہے۔ تمہارے حسن و جمال کو دیکھ کر ابھی ابھی ایک شعر نازل ہوا ہے۔ عرض کرتا ہوں..........."

اس نے قوالوں کے انداز میں ایک ہاتھ کان پر رکھ کر ترنم سے شعر سنانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے ہی مرجانہ نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔

"شاعر کا بچہ' میں خوبصورت لفظوں سے پگھلنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں فولاد ہوں' مجھ سے داد حاصل کرنا چاہتے ہو تو مرد کی طرح خم ٹھونک کر سامنے آؤ۔"

وہ سامنے آنے کی بجائے کار میں جا کر بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

انسپکٹر سرفراز نے کئی بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر سیاہی میں کہیں بھی امید کی کرن پھوٹتی نظر نہیں آئی۔ اس کے ہاتھ سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی' ورنہ وہ ریڈیم ڈائل سے اس بات کا اندازہ کرتا کہ اس تاریک کمرے میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ کچھ ایسے اوقات مقرر تھے کہ اسے کھانا مل جاتا تھا۔ کھانے سے پہلے ایک قد آور شخص اس کے پاس آتا تھا' اس کے ساتھ کرنل جم ہوتا تھا۔ کرنل جِم پہلے بڑی سہولت سے کہتا۔

"مسٹر سرفراز! آپ اگر مرجانہ کا ساتھ چھوڑ دیں تو وہ جلد ہی کمزور پڑ جائے گی۔ وہ آپ کو کچھ نہیں دیتی۔ اس نے ایک مرسڈیز کار دی اور شاید چند ہزار روپے آپ کو مل جاتے ہوں گے۔ اس کے بدلے میں وہ ہر ماہ لاکھوں روپے کماتی ہے۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دیں تو ہم اس سے دوگنی رقم آپ کو دیا کریں گے۔"

سرفراز نے اسے جواب دیا۔

"میں کسی ایک کا ساتھ دے سکتا ہوں' تمہارا یا مرجانہ کا۔ مرجانہ نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا اس لئے میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ وہ ہمیشہ مجھے خوش کر دیتی ہے۔"

قد آور شخص نے کہا۔ "ضرور خوش کرتی ہو گی۔ عورت جو ہے۔ ہمارے پاس اس

سے بھی طرحدار حسینائیں ہیں۔"

"پھر بھی میں مرجانہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ دوسری عورتیں اس کے سامنے ہیں۔"

"ضرور ہوں گی۔ مرجانہ جوانی کے سٹیج پر بھی جمناسٹک کے کرتب دکھاتی ہو گی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے لیکن مسٹر سرفراز میرا نام شہزادہ ہے۔ بہت جلد میں تمہاری مرجانہ کو یہاں لاؤں گا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کے ساتھ جمناسٹک کے کرتب دکھاؤں گا۔"

کرنل جِم نے کہا۔ "آپ کو گرفتار کر کے یہاں لانے کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہم سمگلنگ کے سلسلے میں آپ کے تعاون کے طلبگار ہیں۔ آپ کے بغیر بھی ہم اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ مرجانہ آپ کی رہائی کا مطالبہ کرے۔ وہ ہمارے پاس آئے اور ہمارے ماتحت رہ کر کام کرنے کا معاہدہ کرے۔ ایک ملک کے دو بادشاہ اور ایک سرحد کے دو سمگلر نہیں ہو سکتے۔ آپ کو یہاں لانے کا ایک اور مقصد ہے۔ وہ یہ کہ آپ پولیس کے بہت بڑے آفسر ہیں۔ آپ شہر کے ایسے دولت مندوں کو جانتے ہیں جو ماضی میں کوئی نہ کوئی جرم کر چکے ہیں۔ آپ مکمل ثبوت کے ساتھ ان کے جرائم کا ریکارڈ پیش کر دیں، ہم انہیں اپنے مقاصد کے لئے بلیک میل کریں گے۔"

"میرے پاس کسی کے جرم کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"

سرفراز کا جواب سنتے ہی شہزادے نے اس کی کمر پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ ایک دم سے چیختا ہوا فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ کرنل جِم نے گھبرا کر کہا۔

"شہزادہ، میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ ابھی اسے اذیتوں میں مبتلا نہیں کرنا ہے۔ اسے دیکھو کہیں مر نہ جائے۔"

شہزادے نے کہا۔ "یہ مرے گا نہیں البتہ اس کی ایک آدھ پسلی ٹوٹ گئی ہے۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں کے وزن کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ یہاں ڈاکٹر کو بھیج دیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ اس تاریک کمرے سے باہر چلا گیا۔ کرنل جِم بھی سرفراز کو فرش پر تڑپتا چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ ڈاکٹر اس کے پاس آیا تھا اور اسے دوائیں دے کر یہ اطمینان دلا گیا تھا کہ پسلیاں سلامت ہیں۔ صرف ایک آدھ پسلی ذرا سی چٹخ گئی ہے۔

وہ ان کے رحم و کرم پر پڑا رہا۔ وہ ہر گھڑی اس بات کی توقع کر رہا تھا کہ مرجانہ اسے اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے ضرور آئے گی، خواہ ہنگامہ برپا کرنے کے لئے

آئے یا کرنل جِم کے سامنے جھکنے آ جائے مگر آئے گی ضرور.........."

کرنل جِم ایک بڑے سے کمرے کے آرام دہ صوفے پر بیٹھا وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ شہزادہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔

"وہ بہت ضدی ہے، یہاں نہیں آئے گی۔ وہ اس بات پر اترا رہی ہے کہ اسے ہمارے خلاف کامران نامی ایک عینی شاہد مل گیا ہے۔"

کرنل جِم نے کہا۔ "میں اس عینی شاہد کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اسے بھی یا تو ختم کرنا ہو گا یا وہاں سے غائب کر دینا ہو گا۔"

"وہ مرجانہ کا خاص مہمان ہے اور اس کے آدمیوں کی کڑی نگرانی میں رہتا ہے، وہاں تک پہنچنے کے لئے پھر ایک بار مونا اور میڈم نوری سے کام لینا ہو گا۔"

"ہوں۔ ہم شہر جا کر اپنی کوٹھی سے مرجانہ کو فون کریں گے اور اسے سامنے آنے کے لئے کہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انسپکٹر سرفراز کی رہائی کے لئے ضرور ہمارے پاس آئے گی۔ جب وہ اپنے اسسٹنٹ واجد کے ساتھ ہماری کوٹھی کی طرف آئے گی تو تم اس کی کوٹھی کی طرف چلے جانا۔ وہاں جو دو چار لوگ پہرے پر موجود ہوں گے، وہ تمہارے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکیں گے۔ تم بآسانی کامران کو وہاں سے غائب کر دو گے۔"

شہزادے نے کہا۔ "مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مرجانہ سے سامنا نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے اس کے کتنے ہی آدمیوں کو نقصان پہنچایا ہے اسے انتقاماً میری طرف بڑھنا چاہئے تھا مگر پتہ نہیں اس کی خاموشی میں کیا مصلحت ہے اور کرنل، تم بھی مجھے اس کی کوٹھی جانے سے روکتے ہو، میرا مشورہ مانو اور مجھے وہاں جانے کی اجازت دو، ایک بار ہم دونوں ٹکرائیں گے تو فیصلہ خود بخود ہو جائے گا۔"

کرنل جِم نے کہا۔ "تم لڑنے والے صرف اتنا ہی سوچتے ہو کہ سامنے والے کو یا تو مار دینا ہے یا خود مر جانا ہے مگر کاروباری سیاست میں ایسا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بھی زندہ دیکھنا چاہتا ہوں اور مرجانہ کو بھی۔ تم نہیں جانتے مرجانہ ہماری ٹیم میں آ جائے گی تو سارا منافع اسی طرف آئے گا۔ پھر تم دونوں میرے دو مضبوط بازو بن کر رہو گے۔"

شہزادے نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔

"عورت کو تم ہی اپنا مضبوط بازو سمجھ سکتے ہو، میں نہیں سمجھ سکتا۔ جس دن وہ میرے سامنے آئے گی اس دن میں اسے اپنا بازو بنانے کی بجائے اسے اپنے بازوؤں میں لاؤں گا اور اسے سمجھاؤں گا کہ عورت صرف بازوؤں میں مچلنے کے لئے ہوتی ہے۔"

کرنل جِم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری خواہش کے سامنے رکاوٹ نہیں بنوں گا لیکن اس خواہش کی تک
دوستانہ ماحول میں ہونی چاہئے۔ جب وہ میرے کاروباری معاملات میں جھکے گی تو تمہار
سامنے بھی جھکتی چلی آئے گی۔"

شہزادے نے کہا۔ "ہمیں اب شہر کی طرف جانا چاہئے اور پہلی فرصت میں مر
سے فون پر رابطہ قائم کرنا چاہئے' میں اس کی کوٹھی میں داخل ہونے کے لئے بہت
چین ہوں۔"

کرنل جم آخری پیگ خالی کرنے کے بعد اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

☆======☆======☆

مرجانہ جب سے کامران کو پکڑ لائی تھی تب سے وہ اس کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا
اس نے کوٹھی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے کامران کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں
اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ قیصر آباد کا ایک بہت بڑا تاجر ہے اور اس کی ایک سوتیلی ما
ہے جو پہلے اس کی محبوبہ تھی مگر اب اس پر ظلم کرتی ہے اور اسے اپنے راستے سے ہٹ
چاہتی ہے تاکہ اس کے باپ کی ساری دولت کی وہ تنہا مالک بن جائے۔ اس کا بوڑھا باپ
بھی جوان بیوی کی حمایت کرتا ہے اور اس کی حمایت میں اپنے بیٹے کو احمق کہتا ہے۔
مرجانہ نے اس کی رام کہانی سننے کے بعد کہا۔

"تمہارا باپ کیا کہے گا' ساری دنیا یہی کہے گی کہ تم احمق ہو۔ جب سے آئے ہو
میرے حسن کے قصیدے پڑھ رہے ہو۔ میری جیسی عورت تمہارے جیسے احمقوں کے
لئے پیدا نہیں ہوتی ہے۔"

"مگر تم تو پیدا ہو چکی ہو مجھے تمہارے غصے کی پرواہ نہیں ہے۔ بقول شاعر "تمہیں
میرے پیار پر غصہ آتا ہے' مجھے تمہارے غصے پر پیار آتا ہے۔"

مرجانہ نے غصے سے پوچھا۔ "میں نے جو الٹا ہاتھ جمایا تھا کیا تم اُسے بھول گئے؟"

"بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر بننے سے پہلے ہی میرے استاد نے سمجھا دیا
تھا کہ معشوق ستم شعار ہوتا ہے' اس کی لات جوتوں کا بُرا نہیں منانا چاہئے۔"

"عورت سے مار کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی' تمہیں مرجانا چاہئے۔"

"ہاں مجھے مرجانا چاہئے مگر تم چاہنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔"

اس کی بات پر وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ اسی وقت واجد ایک خوبصورت لڑکی
کے ساتھ پہنچ گیا۔ مرجانہ کو مسکراتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ سنگدل عورت
مردوں کے سامنے مسکرانے کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مادام! یہ ثمینہ ہے' میں پہلے بھی اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں
اس لئے اسے ساتھ رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

مرجانہ نے ثمینہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا' پھر اسے قریب آنے کے لئے کہا۔ جب
وہ قریب آنے لگی تو پتہ چلا کہ وہ چلتے وقت ذرا سا لنگڑاتی ہے۔ مرجانہ نے واجد کو سوالیہ
نظروں سے دیکھا۔ واجد نے جلدی سے وضاحت کی۔

"مادام' شاید آپ بھول گئی ہیں' میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایک حادثے میں ثمینہ کی
ایک ٹانگ ضائع ہو چکی ہے۔ اس کی بائیں ٹانگ مصنوعی ہے۔"

مرجانہ نے ثمینہ کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور اپنا ہاتھ اس کی بائیں ٹانگ پر رکھ کر
اس کی شلوار ذرا اٹھا دی۔ گھٹنے سے نیچے پلاسٹک کی ٹانگ تھی لیکن اس مصنوعی ٹانگ کو
ننگا کرتے وقت بھی وہ شرما رہی تھی۔ مرجانہ نے مطمئن ہو کر کہا۔

"واجد ہم ہمیشہ خطرات میں گھرے رہتے ہیں' یہ بے چاری تمہارے ساتھ کہاں
بھاگتی پھرے گی؟"

ثمینہ نے کہا۔ "مادام! میں واجد کے ساتھ جینا اور مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے خطرات کی
پرواہ نہیں ہے۔"

مرجانہ وہاں سے اٹھ کر واجد کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہاں آکر اس
نے کہا۔

"میں نے تمہیں کامران کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا مگر تم
اپنی محبوبہ کو پکڑ لائے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں کام کے وقت فضول باتیں پسند نہیں
کرتی۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق میں نے تمام معلومات حاصل کر لی ہیں۔
کامران نے جو کچھ آپ سے کہا ہے' وہ درست ہے۔ کامران کے باپ کا نام رکن الدین
ہے۔ وہ شہر کا بہت بڑا جوہری ہے۔ میں نے اس کی کوٹھی میں پہنچ کر اس سے ملاقات کی
تھی اور اسے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا کامران ہمارے پاس ہے اور اپنی سوتیلی ماں کی وجہ سے
اپنے گھر واپس نہیں آنا چاہتا۔ اس کے باپ نے لاپروائی سے کہا۔

"اس بے وقوف لڑکے کا نام میرے سامنے نہ لو۔ وہ یہاں نہ آئے تو بہتر ہے۔ وہ
اُلو کا پٹھا میری نوجوان بیوی کو اپنی محبوبہ کہتا ہے اور مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے کہ میں نے
اس کی محبوبہ کو اس کی ماں بنا دیا ہے۔ وہ کم بخت بچپن ہی سے اول درجے کا احمق ہے۔
میرے لئے ہمیشہ پریشانیوں کا باعث بنا رہتا ہے۔ میں اس احمق کو اپنی جائیداد کا وارث

نہیں بنا سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے دوسری شادی کی ہے تاکہ دوسرا وارث پیدا ہو سکے۔ اگر وہ آپ کے پاس ہے تو آپ اسے یا تو مار ڈالیں یا اپنے طور پر اس جانور کی پرورش کریں۔ اس کے اخراجات کے لئے میں ہر ماہ آپ کو معقول رقم دیا کروں گا۔“

ایک باپ کی زبان سے اپنے بیٹے کے متعلق ایسی باتیں سن کر میں خاموشی سے واپس چلا آیا۔ کوٹھی کے باہر ملازموں سے بھی میں نے معلوم کیا۔ سب کا یہی بیان ہے کہ کامران وہاں رہ کر سب کے لئے دردِ سر بنا رہتا ہے‘ خاص کر ملازموں کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ اس کے الٹے سیدھے اشعار سنتے رہیں۔ کامران نے آپ کو جس ڈاکٹر کا نام بتایا تھا‘ میں نے اس سے بھی ملاقات کی ہے۔ وہاں بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ وہ سچ مچ اختلاجِ قلب کا مریض ہے۔“

واجد کہہ رہا تھا اور مرجانہ تصور میں کامران کو دیکھ رہی تھی۔ بظاہر اس نوجوان میں بڑی کشش تھی۔ وہ دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے لیکن اس کی بزدلی اور حماقتیں نفرت انگیز تھیں۔ مرجانہ کو ایسے مردوں سے سخت نفرت تھی لیکن وہ نفرت کے باوجود اس کے متعلق سوچتی جا رہی تھی۔

دوسرے کمرے میں کامران ثمینہ سے کہہ رہا تھا۔

”تم بہت حسین ہو مگر تمہارا نام بہت واہیات ہے۔“

ثمینہ نے اسے حیرانی سے دیکھ کر پوچھا۔

”تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتی۔ کسی جان پہچان کے بغیر تم بڑی بے تکلفی سے میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ ثمینہ جیسے خوبصورت نام کو واہیات کہہ رہے ہو۔“

”یہ نام تمہارے لئے خوبصورت ہو گا مگر ایک شاعر کی حیثیت سے ثمینہ کا ردیف کمینہ اور پسینہ سجھائی دیتا ہے۔ تمہیں اپنا نام بدل دینا چاہئے۔“

ثمینہ نے اداسی سے کہا۔ ”میں بہت دکھی ہوں‘ اس طرح میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں ایک جاگیردار کی بیٹی ہوں۔ باپ کے مرنے کے بعد بے انتہا دولت کی مالک ہوں لیکن محبت سے خالی ہوں۔ ایک لنگڑی عورت کو کوئی اپنی محبوبہ نہیں بناتا۔ میری دولت کو دیکھ کر کتنے ہی رشتے آئے لیکن میں صرف شوہر کے رشتے سے بہلنا نہیں چاہتی تھی۔ عورت شوہر سے زیادہ محبوب کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ اس سے محبت ملتی ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے واجد کی آنکھوں میں وہ پیار دیکھا ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں اس کے ساتھ یہاں چلی آئی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

”واجد کو پا کر میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ میں خوش نصیب ہوں یا بدنصیب‘ کیونکہ محبوب بھی ایسا ملا ہے جو مجرمانہ زندگی گذار رہا ہے۔ میں توجہ کی محتاج ہوں۔ وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے مجھ پر پوری توجہ نہیں دے سکے گا۔ میں بہت دور تک سوچتی ہوں۔ یہ بھی سوچتی ہوں کہ خدانخواستہ وہ قانون کی گرفت میں آئے گا تو میں اتنی بڑی دنیا میں پھر تنہا رہ جاؤں گی۔“

کامران نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا۔

”جب تک میں زندہ ہوں‘ تمہیں تنہا نہیں رہنے دوں گا۔ میرے شعروں میں کتنی ہی محبوباؤں کی گنجائش ہے۔ ابھی تک میں غلطی پر تھا۔ مرجانہ سے محبت کر رہا تھا جو ہمیشہ مرجانے کے لئے کہتی ہے۔ مرجانہ بڑا واہیات نام ہے۔ تمہارا نام خوبصورت ہے۔ اب میں تم سے محبت کروں گا۔“

ثمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اس سے مذاق کر رہا ہے یا واقعی ایسا احمق ہے جیسا کہ نظر آتا ہے۔ وہ ناگواری سے بولی۔

”محبت بدلنے والی چیز ہوتی تب بھی میں واجد کو چھوڑ کر تمہارے جیسے احمق کا تصور نہ کرتی۔“

”میرا تصور کرنا چاہئے۔ آج کل کی محبت پہلے کی طرح اندھی نہیں ہوتی ہے۔ وہ آگے پیچھے اچھی طرح سوچتی ہے جیسا کہ تم نے سوچا ہے۔ واجد اگر گرفتار ہو جائے یا پولیس مقابلے میں مرجائے تو..........“

ثمینہ چیخ کر بولی۔ ”بکواس مت کرو۔ اس سے پہلے میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ تم میرے سامنے میرے محبوب کے مرنے کی باتیں کر رہے ہو..........“

اس کی چیختی ہوئی آوازیں سن کر مرجانہ اور واجد کمرے میں آ گئے۔

”کیا بات ہے؟“ مرجانہ نے پوچھا۔

ثمینہ نے واجد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”واجد‘ یہ کون پاگل ہے‘ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ یہ احمق تمہارے مرنے کی باتیں کر رہا ہے اور مجھ پر عاشق ہو رہا ہے۔“

مرجانہ اور واجد نے گھور کر کامران کو دیکھا۔ کامران نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”مرجانہ! برا نہ ماننا‘ اب میں تمہاری جیسی سنگدل عورت سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس فیصلے سے تمہارا دل ٹوٹ جائے گا مگر میں مجبور ہوں۔ مجھے

اس حسینہ ثمینہ سے محبت ہو گئی ہے۔"

مرجانہ نے غصے سے کہا۔ "تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں تمہاری محبت میں مری جا رہی ہوں۔ پاگل بے وقوف کہیں کے۔ جب سے آئے ہو تب سے مجھے فضول باتوں میں الجھا رہے ہو۔ خبردار اگر ثمینہ سے فضول باتیں کیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ ثمینہ ہمارے ساتھ چلو' اسے یہاں تنہا مرنے دو۔"

ثمینہ ان کے ساتھ کمرے سے باہر جانے لگی۔ کامران نے کہا۔

"میں یہاں تنہا نہیں رہوں گا۔ اگر میری محبت کی قدر نہ کی گئی تو ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

مرجانہ نے دروازے پر سے پلٹ کر کہا۔

"میری مرضی کے بغیر تمہارے فرشتے بھی یہاں سے قدم نہیں نکال سکتے۔ تم اسی کمرے میں بند رہو گے۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں پہنچی تو واجد ریسیور اٹھا کر کسی سے باتیں کر رہا تھا' اس نے مرجانہ کو دیکھتے ہی ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرنل جِم آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

مرجانہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ پھر فخریہ انداز میں بولی۔

"ہیلو کرنل! سرفراز کے اغوا کے بعد مجھے تمہارے پیچھے بھاگنا چاہئے تھا مگر تم میرے پیچھے بھاگ رہے ہو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تم نادان ہو مرجانہ! میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ کامران جیسا ایک عینی شاہد میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ میرے ساتھ مل کر کاروبار کرو۔ ہم اس سلسلے میں دوست بن کر کسی اچھے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ میں اس وقت اپنی کوٹھی میں ہوں تم چاہو تو یہاں آ کر مجھ سے ملاقات کر سکتی ہو۔"

"میں ضرور ملاقات کروں گی لیکن ابھی خالی ہاتھ نہیں آنا چاہتی۔ کسی دن تمہارے شہزادے کی لاش کا تحفہ لے کر آؤں گی۔"

اس بات پر تھوری دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر کسی دوسرے مرد کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو مرجانہ ڈارلنگ' میں شہزادہ بول رہا ہوں۔ مجھے یہ سن کر ہنسی آ رہی ہے کہ تم مجھے ایک لاش میں تبدیل کرنا چاہتی ہو۔ میری بھی یہی تمنا ہے کہ تم سے جلد از جلد سامنا

ہو مگر اس سلسلے میں کرنل صاحب میری مخالفت کر رہے ہیں۔"

مرجانہ نے کہا۔ "تم کرنل کے زر خرید غلام ہو۔ کیا تم نے غلام بننے کے لئے مارشل آرٹ سیکھا ہے؟ اگر مرد ہو تو غلامی کا طوق اتار دو اور میرے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جاؤ۔"

"میں عورت کو صرف بستر کا شریک سمجھتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں موت کی سیج پر ملوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنی کوٹھی کی چھت پر آ گئی۔ باہر سرد برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں لیکن وہ غصے میں جل رہی تھی اس لئے سردی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ یہ سوچ کر پُرسکون ہو گئی کہ شہزادے کے متعلق زیادہ نہیں سوچنا چاہئے۔ آج نہیں تو کل اس سے فیصلہ کن ٹکراؤ ہو گا لیکن آج اور کل میں کتنے ہی دن گزرتے جا رہے تھے۔ پھر اس کے دماغ میں بات آئی کہ شہزادہ اور کرنل جِم اپنا خفیہ اڈا چھوڑ کر شہر آ گئے ہیں اور شاید آج کی رات وہ اسی کوٹھی میں گزاریں گے۔ اگر وہ آدھی رات کے بعد وہاں پہنچے تو شہزادے سے یقیناً سامنا ہو گا۔ کیوں نہ آج رات ہی فیصلہ ہو جائے؟

یہ سوچ کر اس نے رسٹ واچ کو دیکھا اس وقت نو بج رہے تھے اور وہ بارہ بجے کے بعد وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یہ تین گھنٹے گزارنے کے لئے وہ کامران کے پاس آ گئی۔ کامران غیر شعوری طور پر اس کی جذباتی سوچ میں سمایا ہوا تھا۔ وہ بظاہر اس سوچ سے انکار کرتی تھی لیکن اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔

اس نے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ کامران بستر پر لیٹا ہوا تھا' اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا پھر ناراضگی سے بولا۔

"اتنی رات کو ایک نامحرم کے کمرے میں کیوں آئی ہو؟"

"یہ میری خوابگاہ ہے۔" یہ کہتی ہوئی وہ الماری کے پاس آئی اور اسے کھول کر اپنا سلیپنگ گاؤن نکالنے لگی۔

کامران نے سلیپنگ گاؤن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم اس کمرے میں سونے آئی ہو؟"

"کیوں نہیں' مجھے اپنے کمرے میں ہی سونا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنا لباس اتارنے لگی۔ کامران نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بُری بات ہے۔ میں تم سے پاکیزہ محبت کرتا تھا' جیسے شاعر لوگ اپنے شعروں میں کرتے ہیں۔ اے تم شاعری کے لباس سے باہر نہ نکلو۔" مرجانہ نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔

"تم کیسے مرد ہو؟ عورتوں کی طرح شرما کر آنکھیں کیوں بند کر رہے ہو؟ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تمہارے جیسا قد آور نوجوان اتنا احمق نہیں ہو سکتا جتنا کہ تم نظر آتے ہو۔ آنکھیں کھولو مجھے دیکھتے ہی تمہاری ساری حماقتیں ڈھل جائیں گی۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں پھر اس کی آنکھیں اُلّو کے دیدوں کی طرح پھیل گئیں اور مرجانہ کے بدن پر جم کر رہ گئیں۔ اس کے بدن پر لباس کی ایک دھجی تک نہیں تھی اور اس کے کسرتی بدن کی دھجی دھجی اسے پکار رہی تھی۔ یوں بھی حسین عورت کا جسم شاہکار مجسّمے کی طرح تراشیدہ ہوتا ہے مگر وہ شاہکار سے بھی کچھ اونچی چیز تھی۔ جمناسٹک کی مشقوں نے اس کے بدن کے ایک ایک نشیب و فراز کو اس طرح نمایاں کر دیا تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہی دل بے اختیار دھڑکنے لگتا تھا۔

کامران کا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے دیدے پھیل کر یوں ساکت ہو گئے تھے جیسے دم نکل گیا ہو۔ پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بستر پر گر پڑا اس کی حالت سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اٹک اٹک کر سانس لے رہا ہے۔ مرجانہ پریشان ہو کر تیزی سے اس کے قریب آئی۔ قریب آ کر پتہ چلا کہ اس پر اختلاج قلب کا دورہ پڑا ہے۔ وہ بڑی مشکلوں سے سانسیں لیتا ہوا اشارے سے کہہ رہا تھا کہ اسے اس کی مخصوص دوا دی جائے۔

مرجانہ نے اس کے تھیلے سے دوا کی شیشی نکال کر اس کے قریب بستر پر پھینک دی' پھر اس کی طرف سے منہ پھیر کر سلیپنگ گاؤن پہننے لگی۔ گاؤن پہن کر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دوا پینے کے بعد بستر پر لیٹ گیا تھا اور آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

مرجانہ کبھی اس طرح پیاسی نہیں رہی تھی۔ اسے غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن کامران کی حالت بھی قابل رحم تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے سمجھا تھا کہ وہ کوئی دشمن کا آدمی ہے یا اس کا تعلق کرائم برانچ سے ہے لیکن وہ معزز اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اتنے دولت مند باپ کا بیٹا چور بدمعاشوں کی طرح کرنل جِم کا آلۂ کار نہیں بن سکتا تھا اور نہ ہی انٹیلی جنس والے ایک اختلاجِ قلب کے مریض کو ملازم رکھ سکتے تھے۔

مرجانہ اسے ہر طرح سے آزما چکی تھی۔ اس وقت بھی اس کی بیماری میں بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا مگر ایک بات اب بھی کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ وہ ان چٹانوں کے

درمیان کیسے پہنچ گیا تھا۔ پہاڑی کے نیچے وہاں تک پہنچنے کے لئے اس کے پاس رسی اور کوہ پیمائی کا دوسرا سامان نہیں تھا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ اتنی بلندی سے چھلانگ لگا کر ان چٹانوں میں پہنچ گیا ہو۔

یہ سوال مرجانہ کے ذہن میں کئی بار ابھرا لیکن وہ اتنی زیادہ بکواس کرتا تھا کہ وہ اہم سوال مرجانہ کے ذہن سے محو ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ کامران کے بستر کے پاس یہ سوچ کر کھڑی رہی کہ اب اس سوال کا جواب معلوم کر کے ہی وہاں سے ہٹے گی۔

تھوڑی دیر بعد کامران نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں پھر اس نے مرجانہ کو دیکھ کر بڑی نقاہت سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم نے لباس پہن لیا۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ میں عورت کو چھلکا اتار کر نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی صورت میں مجھ پر شدید دورہ پڑتا ہے۔"

مرجانہ نے اسے جھڑک کر کہا۔ "زیادہ باتیں نہ کرو۔ تمہاری فضول باتوں میں' میں کام کی باتیں بھول جاتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ پہاڑی کے نیچے ان چٹانوں کے درمیان کیسے پہنچ گئے تھے؟"

"میں شکار کی تلاش میں وہاں پہنچ گیا تھا۔"

"مگر کس راستے سے گئے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں شکار کی تلاش میں ایک غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ غار کے اندر جا کر دیکھنا چاہئے۔ جب میں اندر گیا تو بہت دور جانے کے بعد وہ غار دو راہے میں تقسیم ہو گئی۔ ایک راستے میں آگے جا کر ایک بہت گہری جھیل ہے۔ اس جھیل کے دوسری طرف بہت دور اونچی چٹانوں پر میں نے دیکھا کچھ لوگ بڑی بڑی لکڑی کی پیٹیاں اٹھائے کہیں جا رہے تھے۔ وہ چند قدموں تک چلتے دکھائی دیتے تھے' پھر چٹانوں کے پیچھے گم ہو جاتے تھے۔"

یہ سنتے ہی مرجانہ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ وہ جلدی سے اس کے قریب بستر پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کیا تم نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا؟"

"آنکھوں سے بھی دیکھا تھا اور دوربین سے بھی۔ بے چارے مزدور ہوں گے' اسی لئے میں غار کے دوسرے راستے پر چلا گیا۔"

مرجانہ اسے جھنجھوڑ کر بولی۔

"وہ مزدور نہیں تھے۔ تم نہیں جانتے کہ تم میرے لئے کتنے کام کے آدمی ہو۔ میں

ناحق تم پر ناراض ہو رہی تھی۔ کیا تم مجھے اس غار کا راستہ بتا سکتے ہو؟"

"ہاں بتا سکتا ہوں۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "کیا میں تمہارے جیسے احمق کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی؟ ایک کاغذ پر نقشہ بنا کر بتاؤ میں اس نقشے کی مدد سے وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک میز کے قریب گئی اور وہاں سے کاغذ اور پنسل اٹھا لے آئی۔ پھر کامران کو دیتے ہوئے بولی۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر نقشہ بناؤ۔ کوئی حماقت نہ کرنا۔"

"مجھے نقشہ بنانا آتا ہے۔ میں اسکول میں سب سے اچھی ڈرائنگ بناتا تھا۔ کہو ایک چوہا بنا کر بتاؤں؟"

وہ ڈانٹ کر بولی۔ "تمہیں جو کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔"

وہ چپ چاپ سر جھکا کر نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ مرجانہ اس کے قریب جھک کر دیکھتی جا رہی تھی اور کبھی کبھی اسے ٹوک کر پوچھتی جا رہی تھی۔ جب نقشہ مکمل ہو گیا تو وہ سارا علاقہ مرجانہ کے ذہن میں محفوظ ہو گیا، جہاں سے گزر کر وہ غار تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ کامران سے کاغذ لے کر اس کے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں اس نے واجد کو طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو اس نے کاغذ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کامران احمق ضرور ہے مگر ہمارے بہت کام آ رہا ہے۔ یہ نقشہ دیکھو اس نقشے کے ذریعے ہم کرنل جِم کے خفیہ اڈے تک پہنچ سکتے ہیں۔"

مرجانہ اسے ساری باتیں بتانے لگی کہ کامران شکار کی غرض سے بھٹکتا ہوا کس طرح جھیل کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ اس نے جھیل کے دوسری طرف کچھ لوگوں کو لکڑی کی پیٹیاں اٹھا کر جاتے دیکھا تھا۔ وہ احمق ان لوگوں کو معمولی قسم کا مزدور سمجھ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کرنل جِم کے آدمی تھے اور ادویات کی پیٹیاں سرحد پار پہنچا رہے تھے۔"

"یقیناً آپ کا خیال درست ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک وہ غار ہماری نظروں میں نہیں آیا۔ اس نقشے سے پتہ چلتا ہے کہ غار کا دہانہ بہت سی چٹانوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے، اسی لئے ہم کبھی ان کے اڈے تک نہیں پہنچ سکے۔ اب کیا حکم ہے؟"

"ہم اسی وقت روانہ ہوں گے۔ شہزادہ اور کرنل جِم یہاں شہر آئے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی عدم موجودگی میں ان کے اڈے پر چھاپہ ماریں گے۔ شاید ہمیں انسپکٹر سرفراز بھی وہاں مل جائے۔ تم ضروری سامان کے ساتھ ربڑ کی فولڈنگ کشتی اور ہیلمٹ ٹارچ بھی

ساتھ رکھ لینا۔ جاؤ جلدی تیاری مکمل کرو۔"

واجد حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ کامران اپنے بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کمرے سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ہولے ہولے یوں گنگنا رہا تھا جیسے کسی خیال کو شعر کے وزن میں ڈھال رہا ہو۔

دو گھنٹے بعد اس کوٹھی کے اندر اور باہر خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں ایک پک اپ آ کر کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ مونا اور میڈم نوری پک اپ کا دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ انہوں نے ایک نظر کوٹھی پر ڈالی۔ پھر کٹھ پتلیوں کی طرح وہی مقررہ حرکتیں کرنے لگیں یعنی ڈگی کھول کر انہوں نے پہیہ بدلنے کا سامان نکالا۔ میڈم نوری نے پچھلے پہیے کی ہوا کھول دی۔ پھر اسے بدلنے کے لئے جیک لگا کر ہینڈل گھمانے لگی۔ مونا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوٹھی کے دروازے پر آئی۔ مین گیٹ پر ایک مسلح نوجوان نے اسے روکا۔ وہ کہنے لگی۔

"میری آنٹی گاڑی کا پہیہ بدل رہی ہیں۔ کیا آپ ان کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

ایک جوان لڑکی کو دیکھ کر دوسرا پہریدار بھی وہاں آ گیا۔ دونوں ہی اس کی مدد کے لئے تیار ہو گئے اور پک اپ کی طرف بڑھنے لگے۔ پک اپ کے قریب پہنچنے کے بعد وہ پہیے کی طرف جھک کر دیکھنے لگے۔ اسی وقت پیچھے سے دونوں کی گردنوں پر بیک وقت کراٹے کے دو زبردست ہاتھ پڑے۔ وہ دونوں آواز نکالے بغیر شہزادہ کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"مونا تم ڈرائیونگ سیٹ پر بالکل تیار بیٹھی رہو، ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ میری بوڑھی معشوقہ تم میرے ساتھ چلو............"

یہ کہہ کر وہ کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔ میڈم نوری برا سا منہ بنا کر دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتی ہوئی اس کے پیچھے جانے لگی۔ کوٹھی کے برآمدے میں دو اور پہریداروں سے سامنا ہوا لیکن وہ بھی شہزادہ کے سامنے ثابت قدم نہ رہ سکے۔ ایک منٹ کے اندر ہی زمین دیکھنے لگے۔

کامران اپنے کمرے میں اونگھ رہا تھا۔ اتنے میں ثمینہ گھبرائی ہوئی تیزی سے اس کے پاس آئی۔ اسے دیکھتے ہی کامران نے خوش ہو کر کہا۔

"کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی سرکار مری، مجھے یقین تھا کہ میرا جذبۂ عشق یہاں کھینچ لائے گا۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "بکواس مت کرو۔ کوٹھی کے باہر ہنگامہ ہو رہا ہے۔ میں نے کھڑکی

کے شیشوں پر دو چار آدمیوں کے لڑتے ہوئے سائے دیکھے ہیں۔"

"رات کو سائے اور بھوت ہی نظر آتے ہیں۔ چلو اچھا ہے اس بہانے تم میرے پاس آگئیں۔ آؤ یہاں بیٹھو۔ ابھی ابھی ایک شعر موزوں ہوا ہے۔"

وہ سہمے ہوئے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

"خدایا' میں کیا کروں۔ نہ جانے واجد کہاں چلا گیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

کامران نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ڈرو نہیں' میں تمہارا محافظ ہوں۔ اگر کوئی تمہیں ہاتھ لگائے گا تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اگر کوئی تمہیں سینے سے لگائے گا تو میں.......... تو میں اس سے پہلے ہی تمہیں سینے سے لگالوں گا۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

وہ اپنا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"تم دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہو۔ مجھے اکیلی دیکھ کر سینے سے لگانے کا حوصلہ کر رہے ہو۔ اگر واجد یہاں ہوتا تو.........."

"تو میں اُسے بھی سینے سے لگا لیتا۔ اگر وہ تمہاری طرح انکار کرتا تو میں تمہارے سامنے اسے قتل کر دیتا۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔"

اسی وقت کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ دروازے پر شہزادہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے میڈم نوری نظر آ رہی تھی۔ شہزادہ مقابلے کی نیت سے آیا تھا لیکن کامران کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے تم ہی وہ کامران ہو؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرجانہ نے تم جیسے احمق کو عینی شاہد بنا کر رکھا ہے۔ تم تو رکن الدین جوہری کے بیٹے ہو نا!"

کامران نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارا باپ مجھے جانتا ہے۔ رکن الدین کی ایک کمزوری کرنل جِم کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے کرنل جِم کا کوئی آدمی گرفتار ہوتا ہے تو تمہارا باپ اپنی دولت کے سہارے اسے ضمانت پر چھڑا لیتا ہے۔"

کامران نے پوچھا۔ "یہاں کسے ضمانت پر چھڑانے آئے ہو؟ میں اس حسینہ سے محبت کر رہا تھا۔ خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئے۔ کس کام سے آئے ہو۔ جلدی بتاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں تمہیں یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔"

"میں اپنے باپ کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

"کرنل جِم تمہارا باپ نہیں ہے۔ میں تمہیں اسی کے پاس لے جاؤں گا۔"

"مجھے معاف کرو۔ ابھی میں عشق کر رہا ہوں۔"

شہزادہ نے ناگواری سے کہا۔

"میں نے تمہاری محبتوں اور حماقتوں کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مرجانہ اور واجد کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ دو گھنٹے پہلے میں نے مرجانہ کو ایک غار کا راستہ بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ غار کے آخری سرے میں ایک جھیل ہے۔ وہ میرے سامنے ننگی ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ اسی شرم سے جھیل میں ڈوب مرنے گئی ہے۔"

شہزادہ اسے حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے غصے سے پوچھا۔

"تم نے کس غار کا پتہ بتایا تھا؟ تم کیسے جانتے ہو کہ کسی غار کے آخری سرے میں ایک جھیل ہے؟"

"میں پرسوں وہاں شکار کی تلاش میں گیا تھا۔ جھیل کے دوسری طرف میں نے بے چارے مزدوروں کو دیکھا۔ وہ لکڑی کی بڑی بڑی پیٹیاں اٹھائے مزدوری کر رہے تھے۔"

شہزادہ نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"اُلو کے پٹھے! کیا تم نے یہ تمام باتیں مرجانہ کو بتائی ہیں؟"

"ہاں بتائی ہیں۔ اگر مجھے اُلو کا پٹھا کہو گے تو میں ساری دنیا کو بتاؤں گا۔ تم سرمایہ دار لوگ مزدوروں کے ذکر پر ہمیشہ جھلا جاتے ہو لیکن میں مزدوروں کے ذریعے انقلاب لاؤں گا اور اسی انقلاب کی چھاؤں میں ثمینہ سے محبت کروں گا۔ اے محبت زندہ باد.........."

نعرہ لگاتے ہی اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ پڑا۔ ہاتھ پڑتے ہی وہ الٹ کر بستر کے دوسری طرف جا گرا۔ ایسا گرا کہ پھر زمین سے نہ اٹھ سکا۔ شہزادہ نے اسے قریب آ کر دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ثمینہ سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ شہزادہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

"میری جان! بالکل نوخیز کلی ہو' میں تمہیں پھول بننا سکھاؤں گا۔ میری بوڑھی معشوقہ اسے بھی ساتھ لے چلو۔"

میڈم نوری غصے میں جھنجلاتی ہوئی آگے بڑھی اور ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیتی ہوئی بولی۔ "چل یہاں سے.........."

ثمینہ جانے سے انکار کرنے لگی۔ ایک طرف میڈم نوری اسے کھینچ کر لے جانے

گی۔ دوسری طرف شہزادہ بے ہوش کامران کو کندھے پر لے جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔
"کمبخت ہاتھی کی طرح وزنی ہے' مگر کھوپڑی سے بالکل خالی ہے۔"

☆======☆======☆

وہ دونوں پنسل ٹارچ کی روشنی میں غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ واجد کے کاند
پر ایک بڑا سا بیگ لٹک رہا تھا۔ مرجانہ نے ایک سٹین گن اٹھا رکھی تھی۔ اس کے کولہے
ہولسٹر میں ایک ریوالور پڑا تھا۔ واجد نے دونوں کولہوں پر ایک ایک چاقو لگا رکھا تھا
اس کے دوسرے کاندھے پر ایک رائفل لٹک رہی تھی۔

وہ غار کے اندر تھوڑی دور تک پنسل ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے۔
انہوں نے اپنے سروں پر کان کنوں والی ہیلمٹ پہن لی جس کے سرے پر بیٹری سے
والا بلب لگا ہوا تھا۔ غار کے دلدلی راستے پر وہ سنبھل سنبھل کر چلتے رہے۔ دونوں
ذہن میں کامران کا بنایا ہوا نقشہ محفوظ تھا اور وہ اپنی یادداشت کے بل پر آگے بڑھ ر
تھے۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ واجد
اپنے بیگ سے ربڑ کی فولڈنگ کشتی نکال لی۔ پھر ہینڈ پمپ کے ذریعے اس میں ہوا بھ
لگا۔ ذرا سی دیر میں ایک کشتی تیار ہو گئی۔ کشتی میں سوار ہو کر جھیل کے دوسری طر
جاتے ہوئے واجد نے کہا۔

"ہم کامران کی رہنمائی میں یہاں تک چلے آئے ہیں' اس کے آگے کیا ہے' وہ
نہیں جانتا ہم بھی اندھیرے میں ہیں۔ جھیل کے دوسرے سرے پر یقیناً ان کے پہر
ہوں گے۔"

مرجانہ سمجھتی تھی کہ دوسرے کنارے پر یقیناً مسلح پہریدار ہوں گے اسی لئے وہ
پوری طرح مسلح ہو کر آئے تھے۔ اس کے باوجود وہ پتوار چلاتی ہوئی جھیل کے ایک ا
حصے کی طرف آئی جہاں ایک عمودی چٹان اوپر تک چلی گئی تھی۔ وہ چٹان جھیل
دوسرے کنارے کے قریب تھیں اس چٹان کے کنارے کشتی کو کھڑا کرنے کے بعد
نے بیگ سے شاٹ گن اور تار نکال لی۔ پھر تار کے ایک سرے کو گن سے منسلک کر
اُس نے نوے ڈگری پر ٹرائیگر دبا دیا۔ تار کا آخری سرا اپنے ہک کے ساتھ سنسناتا
چٹان کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد اس نے تار کو کھینچ کر دیکھا۔ چٹان کے اوپر ہک
پھنسنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملی اس لئے وہ پھر نیچے آ گیا۔ اس نے دو تین بار اسی
کوشش کی۔ آخر ایک بار ہک اوپر جا کر پھنس گیا۔ اس نے مطمئن ہو کر سٹین گن ش
سے لٹکائی۔ دونوں ہاتھوں میں دستانے پہنے۔ پھر تار کے سہارے اوپر چڑھنے لگی۔ ا

بھی اس کے پیچھے جانے لگا۔ پندرہ منٹ کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ چٹان کی بلندی پر
پہنچ گئے۔ وہ دونوں تاریکی میں راستہ ٹٹولتے ہوئے چند قدم آگے گئے۔ آگے پتہ نہیں
کھائی تھی یا سطح زمین تھی۔ انہوں نے راستہ معلوم کرنے کے لئے پنسل ٹارچ روشن
کی۔ ٹارچ روشن ہوتے ہی عین نگاہوں کے سامنے ایک قدآور شخص نظر آیا۔ اس نے
ٹارچ والے ہاتھ پر ایک لات مارتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں شہزادہ............"

ٹارچ ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ مرجانہ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کے سینے پر ایک
فلائنگ کک جماتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں مرجانہ.........."

اس نے بڑی جچی تلی کک جمائی تھی۔ شہزادہ لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر اس
سے پہلے کہ وہ سنبھل کر مرجانہ پر حملہ کرتا' کرنل جِم نے پیچھے سے مرجانہ کے سر پر
رائفل کے بٹ سے ضرب لگا دی۔ اس بپھری ہوئی شیرنی کی آنکھوں میں تارے ناچ
گئے۔ اس نے ڈگمگاتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی مگر چکرا کر گر پڑی۔ شہزادہ نے غصے سے
پاؤں پٹختے ہوئے کرنل جم کے پاس آ کر کہا۔

"نان سنس' تم نے پیچھے سے حملہ کیا۔ تم نے اس سے مقابلہ کرنے کا موقع کیوں
نہیں دیا؟"

کرنل جِم نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ جب تک مرجانہ سے دوستانہ ماحول میں
گفتگو نہیں ہو گی' اس وقت تک تم دشمن بن کر اس سے نہیں ٹکراؤ گے۔ تمہیں
کاروباری معاملات میں میرے حکم پر عمل کرنا چاہئے۔"

وہ جھلا کر بولا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے کاروبار پر۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ایک
عورت نے میرے سینے پر لات ماری ہے۔ میں اپنے جوابی حملے سے اسے ٹھنڈا کر دیتا۔ تم
نے مجھے موقع کیوں نہیں دیا؟"

کرنل جِم نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت سے مواقع ملیں
گے۔ طیش میں نہ آؤ۔ اگر یہ دوست بن کر گئی تو تم دوستانہ ماحول میں اس سے مقابلہ کر
کے اسے شکست دے دینا تمہاری حسرت پوری ہو جائے گی۔"

حسرت پوری ہونے سے پہلے سے اچانک شہزادہ کے سر پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔
اندھیرے میں چھپے ہوئے واجد نے اپنی رائفل کے بٹ سے اس کے سر پر ضرب لگائی
تھی۔ شہزادہ سر پکڑ کر ڈگمگایا لیکن گرنے سے پہلے واجد سے لپٹ گیا۔ واجد کو یوں لگا جیسے

وہ آہنی شکنجے میں جکڑ گیا ہو۔ اس نے گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی لیکن اس وقت تک کرنل جِم نے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی تھی اور اپنے آدمیوں کو آواز دے رہا تھا۔ شہزادہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ واجد نے اس کی گرفت سے نکل کر کرنل جِم پر حملہ کیا۔ اس سے پہلے ہی چاروں طرف سے اس پر حملے ہونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد واجد بھی مار کھاتے کھاتے چکرا کر گر پڑا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اسی طرح تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اسے اپنے بدن کی چوٹیں یاد آئیں۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ اس نے کراہ کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ تب اسے پتہ چلا کہ اس کا سر ریشم جیسی ملائم رانوں پر رکھا ہوا ہے۔ اس نے بڑی نقاہت سے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟"

"واجد! خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے۔ میں تمہاری ثمینہ ہوں۔"

ثمینہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی اس کے چہرے پر جھک گئی۔ واجد نے پوچھا۔

"ہم اس وقت کہاں ہیں؟"

"جہنم میں۔" اندھیرے میں کامران کی آواز سنائی دی۔ "میں نے سنا تھا کہ جہنم میں آگ جلاتی ہے مگر بہت دیر سے تمہاری یہ ثمینہ مجھے جلا رہی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" ثمینہ چیخ کر بولی۔ "واجد! کوئی شہزادہ نام کا درندہ ہمیں یہاں پکڑ لایا ہے۔ ہم اس کی قید میں ہیں مگر یہاں بھی یہ احمق خاموش نہیں رہتا۔ اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

کامران نے کہا۔ "اے مجھے الزام نہ دو۔ شہزادہ صاحب نے خود ہی کہا تھا کہ تم ایک نوخیز کلی ہو اور وہ صاحب تمہیں پھول بنانا چاہتے ہیں۔ کیا تم بھول گئیں کہ وہ تمہیں کیسے چھیڑ رہا تھا۔ توبہ توبہ مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

اس بات پر ثمینہ رونے لگی۔ واجد غصے سے تلملا کر اٹھ بیٹھا پھر اس نے ثمینہ کے بازو کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ بدمعاش تمہیں چھیڑ رہا تھا؟"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "ہاں، وہ میرے کپڑے اتارنا چاہتا تھا۔ یہ احمق اول درجے کا بزدل ہے۔ میری مدد کرنے کے بجائے دور ہی دور سے اس درندے کو نصیحت کر رہا تھا اور اسے جہنم کے عذاب سے ڈرا رہا تھا۔"

واجد نے نفرت سے کہا۔ "اس احمق بزدل سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہے؟"

"کچھ نہیں .... کرنل جِم ہمارے درمیان آ گیا تھا۔ وہ شہزادہ کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گیا کہ اس لڑکی کے ساتھ کھیلنے کے لئے رات پڑی ہے، پہلے ہمیں مرجانہ کی خبر لینی چاہئے۔ شہزادہ جاتے جاتے یہ کہہ گیا ہے کہ وہ واپس آ کر مجھے نہیں بخشے گا۔"

واجد نے غصے سے کہا۔ "میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

کامران کی آواز سنائی دی۔ "بدمعاشوں کا خون خراب ہوتا ہے، تمہیں کچھ اور پینا چاہئے۔"

واجد غصے سے پاگل ہو گیا۔ وہ غراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ پھر اندھیرے میں کامران کی آواز کی سمت دوڑتا چلا گیا۔ کامران اس طرف نہیں تھا۔ وہ دیوار سے جا کر ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی پچھلی چوٹوں کی ٹیسیں بھی بیدار ہو گئیں۔ وہ ایک بار پھر چکرا کر گر پڑا۔ اس کی کراہیں سن کر ثمینہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کامران کو گالیاں دینے لگی۔ کامران نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ مجھے گالیاں دے رہی ہو۔ تمہارے منہ میں کیڑے پڑیں گے۔ اللہ کرے تمہیں شہزادہ اٹھا کر لے جائے۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولی۔ "تمہیں اٹھا کر لے جائے۔"

"مجھے لے جا کر کیا کرے گا۔ تمہیں تو وہ پھول بنانا چاہتا ہے۔ مجھے کیا گوبھی کا پھول بنائے گا؟"

ثمینہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی واجد کی طرح دیوار سے سر ٹکرا کر بے ہوش ہو جائے۔ اس طرح تھوڑی دیر کے لئے اس احمق سے نجات مل جائے گی۔ فی الحال اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بالکل خاموش رہے اور اس پاگل کی کسی بات کا جواب نہ دے۔

اس نے اپنے فیصلے پر عمل کیا اور بہت دیر تک خاموش رہی۔ اس دوران کامران بڑبڑاتا رہا۔ کچھ دیر بعد واجد کو ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ ثمینہ نے کہا۔

"واجد! اب تم اس احمق کی کسی بات کا جواب نہ دو۔ میں بھی بہت دیر سے خاموش ہوں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ خاموشی ہزار بلا کو ٹالتی ہے اور یہ احمق ہزار بلا کی ایک بلا ہے۔ یہ اپنی باتوں سے ذہنی اذیتیں پہنچاتا ہے۔ اس سے اچھے تو دشمن ہیں جو صرف جسمانی اذیتیں دیتے ہیں۔"

کامران نے پوچھا۔ "اچھا تو کیا جسمانی اذیتیں دے کر پھول بنایا جاتا ہے؟"

وہ چیخ کر بولی۔ "تم پھول کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ خدا کرے تمہارے منہ میں چھالے پڑ جائیں۔"

واجد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ثمینہ! ابھی تم مجھے نصیحت کر رہی تھیں کہ اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہئے۔ اب تم خود ہی چیخ رہی ہو۔ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔"

وہ جھلا کر بولی۔ "میں کیا کروں' یہ کسی نہ کسی طرح بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

"تم اس کی باتیں نہ سنو۔ ابھی میں مادام کے لئے پریشان ہوں۔ پتہ نہیں انہیں کہاں قید کیا گیا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ دروازہ کس طرف ہے؟"

"ہاں' دروازہ آہنی سلاخوں سے بنا ہوا ہے اور اس پر ایک تالا پڑا ہوا ہے۔ یہاں سے نکلنا محال ہے۔"

واجد نے کہا۔ "تم میری صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔ میں مضبوط سے مضبوط تالے کھول لیتا ہوں لیکن کھولنے کے لئے ایک تار کی ضرورت ہے۔"

"اس کال کوٹھری میں تار تو کیا ایک چھوٹی سی کیل بھی نہیں ملے گی۔ ہمیں دشمنوں کے رحم و کرم پر رہنا پڑے گا۔"

کامران نے کہا۔ "میری لنگڑی محبوبہ! اگر مجھے تمہاری مصنوعی ٹانگ مل جائے تو میں اس تالے کو کھول کر پھینک دوں گا۔"

ثمینہ نے واجد کو جھنجوڑ کر کہا۔ "تم خاموش کیوں ہو۔ سنتے نہیں' یہ میرے لنگڑے پن کا مذاق اڑا رہا ہے۔"

اس نے ثمینہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ثمینہ غصے کو پی جاؤ۔ ابھی اس احمق کی بکواس نے میرا دماغ روشن کر دیا ہے۔ تم اپنی مصنوعی ٹانگ الگ کرو۔ میں اس میں سے تار نکال کر تالا کھول دوں گا۔"

اس کے بعد اندھیرے میں خاموشی چھا گئی۔ اس تاریکی میں ثمینہ کی ٹانگ الگ کی جا رہی تھی اور واجد اس میں سے تار نکال رہا تھا۔ جب وہ تار لے کر راستہ ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف گیا تو کامران کے گنگنانے کی آواز آئی۔

"لنگڑی ہو کر چلو گی تو بڑا مزہ آئے گا۔"

ثمینہ اسے کوسنے لگی۔ "خدا کرے تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں' تم لنگڑے لولے بن جاؤ۔ دیکھ لینا ایک مجبور عورت کی بددعائیں ضرور رنگ لائیں گی.........."

دروازے پر سے واجد نے دھیمی آواز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ثمینہ خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ کام بگڑ جائے گا۔ کامران میں تمہارے سامنے بھی ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں ہمیں یہاں سے نکل جانے دو اس کے بعد جی بھر کر بکواس کرتے رہنا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد وہ تالا کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کھولنے کے بعد اس نے ثمینہ کو سہارا دیا اور اسے لے کر اس کوٹھری سے باہر آ گیا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور اندر تاریکی سے کامران کے بدستور گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ ثمینہ نے کہا۔

"اسے جہنم میں رہنے دو۔ چلو یہاں سے.........."

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک راہداری میں پہنچے۔ وہاں مشعل کی ہلکی ہلکی سی روشنی تھی۔ جب وہ راہداری سے گزرنے لگے تو اچانک ہی شہزادہ ان کے سامنے آ گیا۔ سامنا ہوتے ہی اس نے ایک کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ واجد پہلے ہی زخموں سے چُور تھا۔ ایک ہاتھ پڑتے ہی ثمینہ اس سے چھوٹ گئی اور وہ زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ شہزادہ نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم ایک ٹانگ سے کتنی دور جا سکتی ہو' میری جان! آؤ میں تمہیں اپنی جنت میں لے چلتا ہوں۔"

اس نے اسے اٹھا کر کاندھے پر لاد لیا۔ وہ تڑپتی اور مچلتی رہی اور وہ قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

کامران اندھیری کوٹھری سے نکل کر باہر آیا۔ راہداری سے مشعل کی دم توڑتی روشنی باہر فرش تک پہنچ رہی تھی۔ فرش پر تالا کھلا پڑا تھا۔ اس کے قریب وہ تار بھی پڑا ہوا تھا جس سے واجد نے تالا کھولا تھا۔ وہ تار کو اٹھا کر راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی واجد زمین پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے اسے ہلا جلا کر دیکھا پھر اسے چھوڑ کر راہداری کے آخری سرے کی طرف چلا گیا۔ آخری سرے پر ایک دوسری کوٹھری تھی۔ اس کوٹھری سے مرجانہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"سرفراز! مجھے اس اڈے کے متعلق پوری تفصیل سے بتاؤ۔ تم اتنے دنوں میں دیکھ چکے ہو کہ کرنل جِم کس کمرے میں رہتا ہے اور شہزادہ کی خوابگاہ کس طرف ہے۔"

کامران نے دروازے کی سلاخیں تھام کر اندھیری کوٹھری میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہزادہ کی خوابگاہ میں ثمینہ کی بکنگ ہو چکی ہے۔ اب تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟"

اس کی آواز سنتے ہی مرجانہ دروازے پر آ گئی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کامران

تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"جیسے سب آتے ہیں۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میرے ڈیڈی کرنل جِ
ہاتھوں بلیک میل کئے جاتے ہیں۔ شہزادہ مجھے پہچانتا ہے۔ وہ مجھے اور ثمینہ کو یہاں
بنانے کے لئے لے آیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ پھول کیسے بنایا جاتا ہے؟"

"یہ کیا بکواس ہے، ثمینہ کہاں ہے بتاؤ؟"

"میں نہیں جانتا۔ واجد نے اس کی مصنوعی ٹانگ سے یہ تار نکال کر تالا کھولا تھا
اسے لے کر باہر چلا گیا تھا۔ باہر اس نے ثمینہ کو چھوڑ دیا اور خود راہداری میں اب آ
سے سو گیا ہے۔"

مرجانہ نے کہا۔ "وہ تار واجد کے پاس ہو گا۔ مجھے لا کر دو۔"

کامران نے تار اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تار لے کر تالا کھولنے میں مصروف
گئی۔

کامران نے کہا۔ "چور بدمعاش بھی تالا کھولتے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں، تمہیں
کچھ پڑھنا چاہئے۔"

مرجانہ نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی بکواس
الجھ گئی تو کبھی وہاں سے نکل نہیں سکے گی۔ اس نے کئی منٹ کی جدوجہد کے بعد تالا کھو
لیا۔ پھر دروازہ کھول کر کامران کو ایک طرف دھکا دیتی ہوئی واجد کی طرف جانے لگی
انسپکٹر سرفراز بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

"مرجانہ! یہ کامران کون ہے؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے پہلے بھی اس کی
آواز سنی ہے۔"

اس وقت تک مرجانہ واجد کے پاس پہنچ کر اس پر جھکی اسے ٹٹول رہی تھی۔ پھ
اٹھتی ہوئی بولی۔

"اس کے شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہاں شہزادہ آیا تھا۔ وہ
ثمینہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

کامران ان کے قریب آ رہا تھا۔ مرجانہ نے کہا۔

"کامران تم واجد کے پاس ٹھہرو، میں ابھی واپس آتی ہوں۔ آج شہزادہ کی موت آ
گئی ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی انسپکٹر سرفراز کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ کامران وہاں تھوڑی دیر
تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر واجد کو وہیں فرش پر چھوڑ کر ادھر جانے لگا جدھر مرجانہ گئی

تھی۔ وہ جہاں سے گزرتا گیا وہاں کرنل جِم کے آدمی یا تو بے ہوش پائے گئے یا زخمی حالت
میں کراہتے ہوئے نظر آئے۔ صاف ظاہر تھا کہ مرجانہ ان کی مرمت کرتی ہوئی وہاں سے
گزرتی گئی ہے۔ اس وقت کامران کو مرمت کرنے والا محاورہ غلط نظر آیا۔ کیونکہ مرجانہ
اچھے خاصے مسلح جوانوں کو توڑ پھوڑ کر گئی تھی۔

ایک بڑے ہال میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہاں مرجانہ کھڑی ہوئی شہزادہ کو للکار رہی
تھی کہ وہ جہاں بھی ہے سامنے آ جائے۔ کرنل جِم اس سے کہہ رہا تھا۔

"پلیز مرجانہ! میری بات پہلے سن لو۔ میں پوری دیانتداری سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا
چاہتا ہوں، تم اطمینان سے بیٹھ کر پہلے میری باتیں سن لو۔"

"تجھ جیسے بے ایمان سے دوستی نہیں ہو سکتی۔ میں تیرے سامنے شہزادہ کی لاش گرا
کر تیرا غرور اور تیری بے ایمانی ختم کرنے آئی ہوں۔ اگر تُو اپنی بھلائی چاہتا ہے تو ثمینہ کو
میرے حوالے کر دے۔"

اسی وقت بڑے ہال کے دوسرے دروازے پر شہزادہ نظر آیا اس نے ہنستے ہوئے
کہا۔

"مرجانہ ڈارلنگ! وہ لنگڑی حسینہ میرے پاس ہے آؤ مقابلے کی شرط لگاؤ۔ اگر تم
جیت گئیں تو ثمینہ تمہیں مل جائے گی اور اگر میں جیت گیا تو بولو کیا انعام دو گی؟" وہ
بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

کرنل جِم نے جلدی سے کہا۔ "میں بتاتا ہوں۔ ہارنے والا سپاہی اپنے ہتھیار پھینک
کر اطاعت قبول کر لیتا ہے۔ مرجانہ تم ہارنے کے بعد ہمارے گروہ میں شامل ہو جاؤ گی اور
ہماری دستِ راست بن جاؤ گی۔"

کامران نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "آہا اب مزہ آئے گا۔ مرد اور عورت کو میں
نے سب کے سامنے لڑتے کبھی نہیں دیکھا ہے۔"

انسپکٹر سرفراز نے اسے گھور کر دیکھا۔ مرجانہ شہزادہ سے کہہ رہی تھی۔

"میں نے ہارنا اور جھکنا نہیں سیکھا ہے یا تو تمہیں مار ڈالوں گی یا خود مر جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے کراٹے کا پوز لیا۔ شہزادہ بھی مسکراتے ہوئے اس کے سامنے
یوں آیا جیسے سامنے ایک نادان اور کمزور سی عورت کھڑی ہو وہ خود کو بہت بلند اور برتر
سمجھ رہا تھا۔ اس زعم میں وہ مار کھا گیا۔ مرجانہ نے دونوں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلیوں سے
دائیں بائیں حملہ کیا تھا۔ شہزادہ نے بڑی آسانی سے دونوں حملوں کو روکا لیکن اس کے
وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مرجانہ بجلی کی طرح تیزی سے پلٹے گی اور اسے کمر پر لاد کر

دور پھینک دے گی۔

شہزادہ کو اپنی چوٹوں کا احساس نہیں تھا لیکن کامران نے "شیم شیم" کہہ کر اسے جنون میں مبتلا کر دیا۔ شہزادہ نے فرش پر سے اٹھتے اٹھتے پہلے کامران کو ہی ایک ٹھوکر مارنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی وہ اچھل کر کرنل جم کے پاس پہنچ گیا۔ شہزادہ اپنے مقابلے سے بھٹک گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مرجانہ نے دو تین ایسی ٹھوکریں ماریں کہ شہزادہ کی ناک سے اور باچھوں سے خون بہنے لگا۔ پھر تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کے جوابی حملے بڑے شدید اور خطرناک تھے' مرجانہ سنبھل نہ سکی' مار کھاتی چلی گئی۔ مار کھانے کے دوران اسے بھی جوابی حملے کا موقع ملا۔ اس بار اس نے صرف دو انگلیوں سے حملہ کیا۔ عورت کی انگلیاں جو بہت نازک ہوتی ہیں اور صرف زلفیں سنوارنے کے کام آتی ہیں وہی انگلیاں مارشل آرٹ کی مشقوں سے گزر کر آہنی سلاخیں بن جاتی ہیں۔ مرجانہ نے مار کھاتے کھاتے اپنی انگلیوں کی دونوں آہنی سلاخیں اس کی آنکھوں میں پیوست کر دیں۔

بڑے ہال کی محدود فضا میں شہزادہ کی دردناک چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں دبائے ایک اندھے کی طرح اِدھر اُدھر ڈگمگا رہا تھا۔ پھر وہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ کرنل جِم نے اپنے ایک مضبوط بازو کو ٹوٹتے دیکھ کر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی لیکن کامران نے اس کی پشت پر ایک ایسی لات ماری کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا مرجانہ کے قدموں میں آگرا۔ مرجانہ اور کرنل جِم نے نظریں اٹھا کر کامران کی جانب دیکھا تو وہ احمق اپنے کپڑے اتار رہا تھا۔ اس کے لباس کے نیچے ایک اور لباس تھا۔ جب اندر کا لباس نگاہوں کے سامنے آیا تو مرجانہ ایک دم سے چونک کر اسے حیرانی سے تکنے لگی کیونکہ اس احمق کامران کی کمر سے سیاہ بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ وہ سیاہ بیلٹ خطرے کا الارم بن گیا تھا۔ مرجانہ نے حیرانی سے چیخ کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

کامران نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کال کوٹھری سے نکلتے وقت انسپکٹر سرفراز نے تم سے کہا تھا کہ وہ کہیں میری آواز سن چکا ہے۔ ہاں سن چکا ہے۔ میں انٹیلی جنس کا وہی آفیسر ہوں جو ایک بار تاریکی میں سرفراز کے پاس آیا تھا اور تم لوگوں کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ میرے لئے تم اور شہزادہ مسئلہ بنے ہوئے ہو۔ کیونکہ تمہارے ہاتھوں انٹیلی جنس کے کتنے ہی آدمی زخمی ہو گئے تھے یا مارے گئے تھے۔ یہ کیس میرے حوالے اس لئے کیا گیا کہ تم دونوں کے سامنے میں بھی مارشل آرٹ کا تھوڑا سا نمونہ پیش کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا اگر شہزادے کی طرف بڑھوں گا تو تم ہوشیار ہو جاؤ گی'

اور تمہیں تنہا گرفتار کروں گا تو شہزادہ محتاط ہو جائے گا۔ کئی ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے اس غار کا راستہ معلوم کیا تھا۔ پھر تم دونوں کو ایک جگہ لانے کے لئے میں نے تمہیں اس غار کا پتہ بتایا۔ تم یہاں آ گئیں۔ اگر شہزادہ مجھے پکڑ کر نہ لاتا تو میں خود یہاں پہنچ جاتا۔ جس طرح پولیس کی ایک بھاری جماعت میرا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ چکی ہو گی۔ یہاں کرنل جِم کے جتنے آدمی تھے تم نے انہیں بیکار کر دیا ہے۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ تم آپس میں لڑتے لڑتے ایک دوسرے کو کمزور بنا دو جہاں میں حکمت عملی سے کام نکال سکتا ہوں وہاں مارشل آرٹ کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ میں جانتا تھا کہ تم اور شہزادہ جب ایک دوسرے سے ٹکراؤ گے تو تم میں سے ایک بالکل بیکار ہو جائے گا اور مجھے توقع تھی کہ شہزادہ تم پر سبقت لے جائے گا مگر تمہارا آخری داؤ اس پر چل گیا۔ اب وہ بالکل بیکار ہے اور تم میدان میں کھڑی ہو لیکن میں ایک عورت سے کیا مقابلہ کروں؟ میں تمہیں نیک مشورہ دیتا ہوں کہ خاموشی سے خود کو میرے حوالے کر دو۔ ورنہ یہاں سے ٹوٹ پھوٹ کر جاؤ گی تو بقول شاعر........"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ مرجانہ نے اچانک ہی اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک ماری تھی لیکن اس کی لات سینے کے بجائے دیوار پر پڑی اور وہ چیختی ہوئی الٹ کر فرش پر آ گئی۔

کامران نے کہا۔ "میں اب بھی تمہیں ٹھوکروں میں اڑا سکتا ہوں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم مارشل آرٹ بھول جاؤ۔"

لیکن وہ بھولنے کی بجائے فرش پر سے اچھل کر بجلی کی طرح اس کی طرف لپکی۔ کامران نے اس کے حملہ کرنے والے ہاتھ کو پکڑ کر ایک طرف جھٹکا دیا۔ پھر اسے موڑ کر اس کی پشت کی طرف لے آیا۔ اس کے بعد دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن میں قینچی ڈال کر جو ہاتھ اس کی گرفت میں آیا تھا اس ہاتھ کی کلائی کو توڑ دیا۔ پھر اسے فرش پر دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر سرفراز تم باہر جاؤ اور پولیس فورس کو مخصوص سگنل دو مگر یاد رکھنا کہ تمہارے لئے فرار کے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہونے سے پہلے تمہیں آخری بار ایک پولیس انسپکٹر کا فرض انجام دینا ہو گا۔ چلو جاؤ یہاں سے۔ ہری اَپ........"

انسپکٹر سرفراز سر جھکا کر حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ کامران نے کرنل جِم کی گردن پکڑ کر کہا۔

"چلو بیٹے مجھے ثمینہ کے پاس لے چلو۔"

وہ اسے دھکا دیتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چاروں طرف سے وزنی بوٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ سرفراز اور کرنل جم پولیس کی حراست میں آ گئے۔ کامران ثمینہ کی مصنوعی ٹانگ اور ایک تار لے کر جب شہزادہ کی خوابگاہ میں پہنچا تو وہ بستر پر برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ عیب والی محبت کی تلاش میں ایک ٹانگ سے چلتے چلتے ایک درندے کی سیج پر پہنچ گئی تھی اور اپنی مرضی کے خلاف بے حیائی کا دوسرا عیب لگا کر موت کی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی ننگی چھاتیوں کے عین وسط میں ایک خنجر پیوست تھا۔

کامران کے ہاتھوں سے مصنوعی ٹانگ چھوٹ کر گر پڑی۔ محبت کی تلاش ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے اب دوسری ٹانگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

☆------☆------☆

ریشمی جال

ردا کثر عورت کو کمزور سمجھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

لورت ایک پہیلی ہے۔

ونٹ کی طرح اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کس کروٹ بیٹھے گی۔

یک سفاک قاتل کا قصہ جو ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے چلا تھا۔

میں کرائے کا قاتل ہوں' میرے لئے قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ کے لئے ک لکھنا۔ جس طرح آپ کہانی کے کرداروں کو کلائمکس تک پہنچانے کے لئے مکمل پلاٹ کرتے ہیں اسی طرح میں اپنے شکار کو چُھری تلے کھینچ لانے کے لئے ٹھوس اور منصوبے بناتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے شکار کئے ہیں۔ یہ دوسری بات کہ اس بار میں خود شکار ہو چکا ہوں۔

میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ آج سے ٹھیک گیارہویں دن سُولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ آپ ایک رپورٹر کی حیثیت سے میرے تاثرات معلوم کر آئے ہیں۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ جب موت کا دن موت کی تاریخ اور موت کا وقت مقرر ہو چکا ہے اور آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لٹک رہا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت کے اس اٹل فیصلے سے نہ بچا سکتی ہو تو ایسے وقت میرے دل پر کیا گزر رہی گی؟

آپ کا پہلا سوال ہے۔ ”کیا میں اپنے پچھلے جرائم پر نادم ہوں اور پچھتا رہا ہوں؟“

”نہیں' پچھتانے سے سزائے موت بدل نہیں سکتی۔ پھر پچھتانے سے کیا فائدہ؟“

آپ کا دوسرا سوال ہے۔ ”کیا مجھے آخری وقتوں میں خدا یاد آ رہا ہے؟“

”نہیں جی۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں' خدا تو اس وقت یاد آتا ہے جب دعا مانگنے کا پروگرام ہو۔ میں نے کتنے ہی قتل کئے' کبھی میرے دل میں خوفِ خدا نہ ہوا' پھر کر منہ سے خدا کو مخاطب کروں۔ میں اپنی عادتوں سے مجبور ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کوئی بھی چیز مانگ کر حاصل نہیں کی۔ میں چھین لیتا ہوں۔ یا پھر پرفیکٹ لائن آف ایکشن بنا کر اکثر کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔ جب ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہے تو انسان کا غرور اسے خدا سے غافل کر دیتا ہے۔“

آپ کا تیسرا سوال ہے۔ ”ان آخری ایام میں مجھے سب سے زیادہ کس چیز کی خواہش ہے؟“

بڑا احمقانہ سوال ہے۔ بہت ہی پرانا اور گھسا پٹا سوال ہے۔ سب جانتے ہیں ہر قیدی

کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ پنجرہ توڑ کر نکل جائے۔ کیا آپ میری یہ خواہش پوری کرنے میں میری کوئی مدد فرما سکتے ہیں؟

دراصل آپ کو سوال کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا یا پھر آپ بھی دوسرے لکھنے والوں کی طرح یہ سوچ کر آئے ہیں کہ آپ کو میری ذات سے کوئی عبرتناک اور سبق آموز کہانی ملے گی جسے لوگ پڑھ کر جرائم سے توبہ کر لیں گے۔

توبہ کے لئے قانون تو کیا اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے دروازے کھول رکھے ہیں۔ توبہ کے دروازے اس لئے کھول رکھے ہیں کہ انسان پچھلی غلطیوں پر نادم ہو اور آئندہ اس سے باز آ جائے۔ انسان کو اتنی سہولتیں حاصل ہیں اس کے باوجود وہ نہیں سمجھتا۔ کتنے ہی پیغمبر اس دنیا میں سمجھانے کے لئے آئے۔ اب پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ شاید اس لئے سمجھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔

اسی لئے کہتا ہوں کہ آپ ناصح بن کر آئے ہیں تو واپس چلے جائیں۔ میں ایک عادی مجرم ہوں اگر عادی مجرم کا مطلب آپ نہیں سمجھتے ہیں تو میں سمجھا دوں کہ کوئی ضرورت یا مجبوری ہمیں اس راستے پر لے کر نہیں آتی۔ ہم عادت سے مجبور ہو کر جرم کرتے ہیں۔ میرا پیشہ بھی قتل کرنا ہے۔ یہ ایک قسم کا کاروبار ہے اور کاروبار میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ نقصان اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کاروبار اچھا نہیں تھا۔ نقصان تو ہم اپنی غلطیوں کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے کاروبار میں نقصان اٹھا کر بھی سنبھلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہمارے کاروبار میں سنبھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اس کاروبار میں جو سرمایہ لگاتے ہیں وہ سرمایہ ہماری زندگی ہوتی ہے۔ نقصان اٹھاتے ہی زندگی سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

میں آپ کے سامنے اپنے تجربات بیان کرتا ہوں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ کسی بڑے جیالے مرد کو قتل کرنا آسان ہے لیکن کسی کمزور بیمار عورت کو قتل کرنا اتنا مشکل کام ہے' اتنا مشکل کام ہے کہ میں اُس کے قتل کے متعلق سوچتا ہوں تو اب بھی مجھے پسینہ آ جاتا ہے۔

آپ شاید میری بات کا یقین نہیں کر رہے ہیں۔ آپ میری بات کو نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم مرد ہیں نا۔ اس لئے عورت کو کمزور سمجھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ مرد ہو تو اس سے زور آزمائی کر لیں' اپنی قوت سے اس پر غالب آ جائیں۔ مگر عورت کے معاملے میں دماغ لڑانا پڑتا ہے کیونکہ وہ جو سوچتی ہے' وہ کرتی نہیں اور جو کرتی ہے' وہ سوچنے سے پہلے ہی کر گزرتی ہے۔ اک دم اونٹ کی ذات ہے۔ کب

کروٹ بیٹھے گی‘ یہ پہلے سے پتہ نہیں چلتا۔ سالی اپنی زندگی میں بھی دھوکہ دیتی ہے
مرنے کے بعد بھی کباڑا کر جاتی ہے۔

شاید اب بھی میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھا تو سنئے میں ذرا تف
سے وہ واقعہ سناتا ہوں۔

اس وقت میری عمر پینتیس برس کی ہے۔ میں پانچ برس پہلے کی بات بتا رہا ہو
مجھے مارنے والی ایک عورت ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے پیدا کرنے والی بھی
عورت ہے لیکن میں نے اپنی ماں کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ البتہ اپنے باپ کی
محبوباؤں کو اکثر دیکھا ہے۔ میرے ڈیڈی ہمیشہ لمبا ہاتھ مارتے تھے۔ اونچی سوسائٹی کی
دولت مند حسیناؤں سے دوستی بڑھاتے تھے جو اپنے شوہروں کے بڑھاپے کا غم کرتی
یا ایسی مالدار بیواؤں سے عشق کرتے تھے جو اپنے خاوند کی چھوڑی ہوئی دولت سے کا
میں آ کر ولایتی وہسکی پیتی تھیں اور وہسکی کے ایک ایک گھونٹ کا سہارا لے کر اپنے
ہونے کا غم غلط کرتی تھیں۔ ڈیڈی ان سے دو ہاتھ آگے تھے۔ ایسی کسی بیوہ کے سا
بیٹھ کر لمبے لمبے آنسو روتے تھے اور رقت آمیز لہجے میں بیان کرتے تھے کہ مرحوم
کتنی خوبیاں تھیں۔ ایسے وقت اگر رونے والی کے آنسو شراب کے جام میں ٹپک جا
وہ اس کا جام اٹھا کر کہتے۔

"اس جام میں جو شراب ہے اس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا کیونکہ اس
تمہارے آنسوؤں کے موتی گھل رہے ہیں۔ میں تمہارا غمگسار ہوں۔ میں تمہارے غ
اپنے سینے میں اتار لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ آنسو پینے کے بہانے اس کے حصے کی وہسکی پی جاتے تھے۔ ایسے وا
کون عورت ان کی بے لوث ہمدردی سے متاثر نہیں ہو گی؟ آنسو تو کبھی مرنے وا
خاوند نے نہیں پیے تھے۔ ایک عاشق پی جاتا تھا۔ عورت بوڑھی ہونے کے بعد بھی
سمجھتی کہ عشق کے مرحلوں میں محبت کرنے والے زہر کا جام بھی اٹھا کر پی جانے کی د
دیتے ہیں اور شادی کے بعد وہی جام عورت کو پلاتے ہیں۔ دیکھئے آپ ناراض نہ ہوں
آپ جیسے شریف مردوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو ڈیڈی جیسے لوگوں کی فطرت
کر رہا ہوں۔ وہ عورت کو موم کرنے کے ایک ہزار ایک عاشقانہ ہتھکنڈے جانتے تھے۔
دولت مند محبوبائیں ڈیڈی کے ہرجائی عشق سے ریٹائر ہوتے ہوتے ان کے پاس اتنا
چھوڑ جاتی تھیں کہ کوٹھی کا کرایہ‘ پٹرول کا خرچ اور شراب وغیرہ کا بل ادا کرنے میں
ہمارا ہاتھ خالی نہیں ہوا تھا۔ ایسی عورتیں بڑی فیاض اور دل والی ہوتی ہیں۔ اپنی کمزور

چھپانے کے لئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیتی رہتی ہیں۔

پھر میری آمدنی الگ تھی۔ سال میں ایک دو ضرورت مند مل ہی جاتے تھے جو اپنے
کسی عزیز سے‘ یا کسی دوست سے‘ یا کسی دشمن سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ میں ان کی
مشکل آسان کر دیتا تھا۔ ایک قتل بھگتانے کا کبھی پانچ ہزار لیتا تھا اور کبھی پچیس ہزار۔
جیسا ضرورت مند ہوتا تھا میں ویسے ہی دام لگاتا تھا اور دام بچھاتا تھا۔

پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ میرے ڈیڈی کو ایک مالدار بیوہ سے عشق ہو گیا۔ اس
بیوہ کا نام شائستہ منیر تھا۔ شائستہ کبھی تنہا کلب میں آیا کرتی تھی۔ کبھی اس کے ساتھ اس
کی جوان بیٹی نظر آتی تھی۔ اس کی بیٹی کو بالکل ہی جوان نہیں نوخیز کہنا چاہئے۔ جب وہ
کلب کے رنگین ماحول میں داخل ہونے کے لئے دروازے پر قدم رکھتی تو یوں لگتا تھا
جیسے ابھی ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی ہو۔

شائستہ کلب کے ہنگاموں میں اپنے غم کو بھلانے آئی تھی لیکن شراب کے پیالوں
میں غم غلط نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنے خاوند کی زندگی میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتی
تھی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو عورت بہکانے والی چیزوں سے پرہیز کرتی
ہے وہ کس قدر محتاط رہنے کی عادی ہو گی۔ ڈیڈی جیسے ماہر شکاری دو برس تک جال پھینکتے
رہے۔ ایک پروانے کی طرح اس کا طواف کرتے رہے۔ کبھی یوں لگتا تھا کہ وہ جلتی ہوئی
شمع پگھل رہی ہے۔

کبھی مایوسی ہوتی تھی کہ وہ زندگی کی صبح تک جلتی رہے گی اور پوری طرح جلنے
سے پہلے ڈیڈی جیسے پروانے کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

ڈیڈی میں بظاہر ایسی کوئی کمزوری نہیں تھی جو کسی عورت کی نظروں میں کھٹکتی۔ وہ
مجھ سے زیادہ قد آور ہیں۔ اچھا گٹھا ہوا جسم ہے۔ ان کا سینہ اتنا چوڑا ہے کہ بیوہ عورتیں
وہاں آسانی سے سر رکھ کر رو سکتی ہیں۔ مگر دو سال گزر گئے شائستہ کا سر وہاں تک نہ
پہنچا۔ جب ڈیڈی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں تو اکثر مجھ سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔
وہ مجھ سے اکیس برس بڑے ہیں اس کے باوجود ہم دونوں بے تکلفی سے دوستوں کی
طرح باتیں کرتے ہیں۔ اگر ایک دوسرے کے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو ہم
ایک دوسرے کو مشورہ دے کر اور عملی طور پر ایک دوسرے کے کام آ کر دلدل میں پھنسی
ہوئی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔

"ڈیڈی سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ آپ شائستہ سے عشق کرنے کی بجائے
اس کی کمزوری کو سمجھیں۔ آپ خود ہی کہا کرتے تھے کہ عورت کی کسی کمزوری سے کھیلا

جائے تو پھر وہ ساری اکڑ بھول جاتی ہے لیکن شائستہ کے سامنے پہنچ کر آپ اس فارمولے کو بھول گئے ہیں۔"

ڈیڈی نے تائید میں سرہلا کر کہا۔

"ہاں شائستہ کے معاملے میں میری ذہانت کچھ کام نہیں آ رہی ہے۔ اگر وہ صرف اپنے مرحوم شوہر کے متعلق سنجیدہ ہوتی تو میں اتنے دنوں میں اس کی سنجیدگی ختم کر دیتا۔ اس کے شوہر کی جگہ میں اس کے دل میں جا کر بیٹھ جاتا۔ مگر وہ کمبخت ہمیشہ اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتی ہے اس کے اندر جوان عورت کے جذبات نہیں ہیں۔ صرف ممتا کی آگ بھری ہوئی ہے۔ میں اس کے سامنے عشق کی باتیں کرتا ہوں کہ ایک عورت اپنے محبوب کے لئے کیسی قربانیاں دیتی ہے تو وہ ایک ماں کی قربانیوں کے قصے چھیڑ دیتی ہے کہ ایک عورت کو ماں بننے کے بعد صرف اپنی اولاد کے بارے میں سوچنا چاہئے۔"

میں نے ان کی باتیں سن کر فوراً ہی کہا۔

"میں سمجھ گیا کہ اس کی بیٹی اس کی کمزوری ہے۔ ہمیں کوئی ایسا پروگرام بنانا چاہئے جس پر عمل کر کے ہم شائستہ کو اس کی بیٹی کی طرف سے فکر میں مبتلا کر دیں۔"

اس روز ہم دونوں باپ بیٹا شائستہ کی بیٹی کو موضوع گفتگو بنا کر کتنے ہی منصوبے بناتے رہے۔ دوسری صبح میں نے شائستہ کی کوٹھی سے اس کی بیٹی کا پیچھا کیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتی تھی۔ پھر ایک بجے ڈرائیور اسی کار میں واپس لے آتا تھا۔ تین دن تک میں دور ہی دور رہ کر اسے دیکھتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مقررہ وقت پر آتی جاتی ہے تو میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دو غنڈے کرائے پر حاصل کئے اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ دوسرے دن انہیں کس لڑکی کا راستہ روکنا ہے اور وہ لڑکی کس نمبر کی کار میں کس راستے سے گزرتی ہے۔

میری ہدایت کے مطابق انہوں نے ایک ویران راستے پر رکاوٹ کھڑی کر دی۔ جیسے ہی شائستہ کی کار وہاں آ کر رکی، دونوں غنڈوں نے بوڑھے ڈرائیور کو باہر کھینچ کر مارنا شروع کر دیا۔ بوڑھا دو چار ہاتھ میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر وہ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر شائستہ کی بیٹی کو باہر کھینچنے لگے۔ وہ دہشت سے چیخنے چلانے لگی۔ اس وقت میں فلمی ہیرو کی طرح ڈیڈی کی کار دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ پھر ان دونوں غنڈوں سے الجھ پڑا۔ پروگرام کے مطابق انہیں مار کھانا تھی کیونکہ میں نے اچھا خاصا معاوضہ دیا تھا۔ شائستہ کی بیٹی حیرانی سے آنکھیں پھاڑے میری دلیری کو اور میرے لڑنے کے انداز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک مار کھانے کے بعد وہاں سے بھاگ گئے۔

اتنے میں بوڑھا ڈرائیور کراہتے ہوئے ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر سٹیئرنگ سیٹ پر بٹھا دیا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ ڈرائیو کرنے کے قابل ہے تو میں نے شائستہ کی بیٹی کو تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں تم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آگے بڑھو، میں اپنی کار میں پیچھے آتا ہوں۔ میں تمہیں گھر تک پہنچاؤں گا۔"

شائستہ کی بیٹی کا نام للی تھا۔ اپنے مختصر سے نام کی طرح سترہ برس کے مختصر سے جسم کی لڑکی تھی۔ اب وہ بائیس برس کی ہو چکی ہے۔ اب بھی دھان پان سا جسم ہے۔ بالکل ہیرے کی کنی ہے۔ نگاہوں میں ایسے سما جاتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ جاتا ہے۔ میں عاشق مزاج نہیں ہوں ورنہ پہلی ہی نظر میں دل ہار جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لئے لڑنے کے باوجود میں فلمی ہیرو کی طرح اس پر عاشق نہیں ہوا۔ اس طرح آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے عورتوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔

اس کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ للی کوٹھی کے احاطے میں کار سے اُتر رہی تھی۔ شائستہ کار کا ہارن سنتے ہی باہر پورچ میں آگئی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی بیٹی نے ایک ہی سانس میں سارا واقعہ سنا ڈالا۔ میں اپنی کار سے اتر کر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شائستہ اپنی بیٹی کی باتیں سن کر مجھے احسان مندی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگی تو میں نے کہا۔

"میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے۔ میں ایک شریف باپ کا بیٹا ہوں اور دوسری عورتوں کی عزت کرنا جانتا ہوں۔"

اس نے مجھے کوٹھی کے اندر چل کر چائے پینے کی دعوت دی۔ میں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ وہ مجھے چھوڑنے کے لئے باہر مین گیٹ تک آئی۔ پھر ڈیڈی کی کار کو دیکھتے ہی بولی۔

"کیا یہ تمہاری کار ہے؟ اسے تو میں اکثر کلب کے کمپاؤنڈ میں دیکھتی ہوں۔"

میں نے جواب۔

"میرے ڈیڈی کلب رین بسیرا کے ممبر ہیں۔ ان کا نام کرامت علی ہے، اگر آپ بھی وہاں جاتی ہیں تو پھر اس کار کی طرح میرے ڈیڈی کو بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔"

بس اس طرح شائستہ کے دل پر ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ اس شام وہ کلب میں آئی تو پہلی بار اس نے ڈیڈی سے مسکرا کر باتیں کیں۔ وہ خود نہیں پیتی تھی مگر اس نے ڈیڈی کے لئے وہسکی کا آرڈر دے دیا۔ ان کے پینے کے دوران وہ کہتی رہی۔

"تمہارا بیٹا بہت دلیر ہے۔ للی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کس طرح دو ہٹے کٹے جوانوں سے تنہا لڑ رہا تھا۔ وہ تنہا ہونے کے باوجود زخمی نہیں ہوا بلکہ انہیں مار مار کر بھگا دیا۔"

ڈیڈی نے شراب کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"میرے بیٹے نے لڑنے کا فن مجھ سے سیکھا ہے۔ تم نے کبھی میرے متعلق مجھ سے نہیں پوچھا۔ ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ کتنا خطرناک فائٹر ہوں۔ میں نے کرامت کلب کے نام سے ایک ادارہ کھول رکھا ہے۔ وہاں میں نوجوانوں کو لڑنے کا فن سکھاتا ہوں۔ ساتھ انہیں یہ تعلیم بھی دیتا ہوں کہ انہیں کس طرح کمزور اور مظلوم عورتوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔"

شائستہ نے انہیں تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں باپ بیٹے قابل تعریف ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہی۔"

"کیسی غلط فہمی؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"میں سمجھی تھی کہ تم ہرجائی طبیعت کے آدمی ہو۔ دو سال پہلے میں نے تمہیں بلقیس خانم کے ساتھ اکثر دیکھا تھا۔"

میرے ڈیڈی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"عورت بڑی شکی ہوتی ہے۔ کسی کے ساتھ رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میں ں سے عشق کرتا رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ بلقیس خانم بیوہ ہونے کے بعد بہت زیادہ یشان رہتی تھی۔ اس کا خاوند میرا دوست تھا۔ اس دوستی کے ناطے میں اس کا خیال رکھا لرتا تھا۔ میں اپنے شاگردوں کو سکھاتا ہوں کہ کس طرح عورتوں کی عزت کرنی چاہیے۔ رمیں کسی عورت کے ساتھ کیسے بہک سکتا ہوں۔ میں کبھی کسی عورت کی طرف مائل میں ہوا۔ مگر یہ دل بھی عجیب ہے پتہ نہیں کیوں تمہاری طرف کھنچا جاتا ہے۔ تم پہلی عورت ہو کہ تنہائی میں بھی مجھے یاد آتی ہو۔"

شائستہ نے پہلی بار شرما کر نظریں جھکا لیں۔ یہ تمام باتیں ڈیڈی نے مجھے جتنی تفصیل سے بتائی تھیں' اتنی ہی تفصیل سے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ عورت شرما کر نظریں جھکا لے تو سمجھ لیجئے کہ اس کے بگڑنے کا مرحلہ آ گیا ہے۔ اس دن کے بعد شائستہ کا زیادہ وقت ڈیڈی کے ساتھ گزرنے لگا۔ ایک ماہ کے بعد ہی اس نے ڈیڈی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بات کا علم ہمیں بعد میں ہوا کہ وہ میرے ڈیڈی کی پناہ میں کیوں آئی تھی۔ جب خاوند بے انتہا دولت مند ہو اور اپنے پیچھے بے حد خوبصورت بیوی اور بیوی

ے زیادہ خوبصورت بیٹی چھوڑ کر مر جائے تو دوست احباب اور سبھی رشتے دار مکھیوں کی طرح اتنی ساری مٹھاس پر بھنبھنانے لگتے ہیں۔ شائستہ نے اپنوں میں سب کو آزما لیا تھا' سب ہی خود غرض تھے۔ خود غرض تو ہم بھی تھے مگر شائستہ کے وفادار تھے۔ اس کے اشاروں پر ناچتے تھے اور وقت آنے پر اس کے دشمنوں پر بھاری پڑ جاتے تھے۔

میں نے غنڈوں کے ساتھ للی کو بچانے کا جو ڈرامہ کھیلا تھا۔ دراصل اسی ڈرامے نے شائستہ کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ میں اور میرے ڈیڈی ان دونوں ماں اور بیٹی کے لئے بہت اچھے باڈی گارڈ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ورنہ وہ عورت عاشق مزاج نہیں تھی۔ صرف ڈیڈی اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ شائستہ کا دل ان کے لئے دھڑکتا ہے اور اس نے ہزار جان سے ان پر عاشق ہونے کے بعد ان سے شادی کر لی ہے۔

شادی کے بعد ہم باپ بیٹا کرائے کی کوٹھی سے اٹھ کر شائستہ کی عالیشان کوٹھی میں آ گئے۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں گھریلو ماحول نصیب ہوا۔ اس ماحول میں ہم نے ماں بیٹی کی بے لوث اور بے مثال محبت دیکھی تھی۔ ماؤں کی مثالی محبت مشہور ہے۔ میں بے مثال محبت اس لئے کہتا ہوں کہ شائستہ نے ممتا کی جو مثال پیش کی ہے وہ اب سے پہلے میری نظروں سے کبھی نہیں گزری۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی بیٹی کو جننے کے لئے ہی اس دنیا میں آئی تھی اور وہ جو زندگی کی سانسیں لے رہی تھی تو صرف اپنی بیٹی کے لئے لے رہی تھی۔ حتیٰ کہ دوسری شادی بھی اس نے بیٹی کے لئے کی تھی۔

میں للی کے ساتھ اسی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس لئے دن رات اس سے آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ پہلے پہل میں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ کیونکہ ڈیڈی شائستہ کو جیتنے کے بعد اس کی دولت کو جیتنے والے تھے۔ للی تو ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایک سادہ چیک تھی۔ ماں اس پر جتنی رقم لکھتی' اس سے زیادہ اس کی قیمت نہ ہوتی لیکن رفتہ رفتہ ہمیں بہت سی باتوں کا علم ہونے لگا۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ شائستہ کی دولت ہاتھی کے دانت جیسی ہے یعنی کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ جس عالیشان کوٹھی میں ہم رہتے تھے وہ للی کے نام تھی۔ سٹین لیس سٹیل کے کارخانے میں ماں بیٹی کا برابر کا حصہ تھا۔ شائستہ کا شیئر اس وقت قائم رہتا جب تک وہ شادی نہ کرتی۔ وصیت کی رو سے وہ دوسری شادی کرنے کے بعد اپنے حصے سے محروم ہو گئی تھی اور اب للی اس کارخانے کی واحد مالکہ تھی۔ میرے ڈیڈی نے جھنجلا کر اس سے کہا۔

"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"اگر پہلے بتا دیتی تو کیا تم مجھ سے شادی نہ کرتے'کیا تم نے صرف ایک مالدار بیوہ

سمجھ کر مجھ سے شادی کی ہے؟"

ڈیڈی نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔

"شائستہ مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ تم خود ہی غور کرو۔ للی کی شادی ہو گی تو اس کی دولت اور جائیداد پر اس کے خاوند کا حق ہو گا۔ اس کے بعد تمہاری زندگی کیسے گزرے گی؟"

"اس کے بعد زندگی گزارنے کے لئے ہی میں نے تم سے شادی کی ہے۔ تم کیسے مرد ہو کیا مجھ اکیلی کا بوجھ نہ اٹھا سکو گے؟"

"کیوں نہیں اٹھا سکوں گا۔ مگر تم ساری زندگی دولت سے کھیلتی آئی ہو اور میں اتنی دولت نہیں کما سکتا۔ اتنی دولت تو صرف نصیب والوں ہی کو ملتی ہے اور تم ہو کہ جان بوجھ کر بدنصیب بن رہی ہو۔"

"میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ سب کچھ میرے مرحوم خاوند کی وصیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ تم اپنی بات کہو جب سے شادی ہوئی ہے تم نے ایک پیسہ بھی میری ہتھیلی پر لا کر نہیں رکھا۔ شادی سے پہلے ڈینگیں مارتے تھے کہ فائٹروں کا بہت بڑا کلب قائم کر رکھا ہے۔ وہاں سے تمہیں بہت آمدنی ہو گی۔ کہاں گئی وہ ساری آمدنی؟"

ڈیڈی سے جواب نہ بن پڑا تو وہ غصے سے کہنے لگے۔

تم مجھے طعنے دے رہی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری یا تمہاری بیٹی کی دولت کا لالچی ہوں۔ اب میں تمہیں کما کر بتاؤں گا اور اس وقت تک تمہارے سامنے نہیں آؤں گا جب تک کہ تمہاری ہتھیلی پر اپنی محنت کی کمائی نہیں رکھوں گا۔"

وہ غصے سے تنتناتے ہوئے شائستہ کی کوٹھی سے نکل گئے۔ شائستہ نے پہلے تو ان کے جانے کی پرواہ نہ کی۔ اس نے سوچا کہ یونہی غصہ دکھا گئے ہیں۔ دماغ ٹھنڈا ہو گا تو واپس آ جائیں گے۔ مگر ڈیڈی بھی پکے ڈرامہ باز تھے۔ وہ جانتے تھے کہ شائستہ نے تین برس کی بیوگی کے بعد دوبارہ ازدواجی زندگی کا مزہ چکھا ہے۔ راکھ تلے دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکتی ہے تو لپک لپک کر بھڑکانے والے کو پکارتی ہے۔ دو ہی دن کے بعد وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ڈیڈی کو تلاش کر کے واپس لے آؤں۔ تلاش کیا کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے شائستہ کا پیغام پہنچایا تو وہ خوش ہو کر بولے۔

"بیٹے میں نہ کہتا تھا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہنے لگی ہے۔ میرے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتی۔"

میں نے ان سے کہا۔

"ڈیڈی آپ نے پورا پیغام تو سنا ہی نہیں جس عورت کی محبت کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں وہ مجھے کسی کل سے عورت نظر نہیں آتی۔ جس طرح میں صرف قتل اور خون ریزی کے کاروبار کے مطابق سوچتا ہوں اور عورت کے متعلق کبھی نہیں سوچتا' اسی طرح شائستہ صرف اپنی بیٹی کے متعلق سوچتی ہے۔ آپ کے بارے میں نہیں سوچتی۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ آپ اسے مل جائیں بلکہ یہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی کا محافظ باپ کوٹھی میں واپس آ جائے۔"

میرے ڈیڈی نے خواہ مخواہ کی بحث سے بچنے کے لئے کہا۔

"شائستہ اور اس کی بیٹی کی ایسی کی تیسی۔ ہمیں صرف اپنے مقصد پر نظر رکھنی چاہئے۔ میں نے جس مقصد کے لئے اس سے شادی کی تھی اس میں ناکام ہو رہا ہوں۔ مگر شادی تو کر ہی چکا ہوں۔ اس رشتے کا کوئی فائدہ تو اٹھانا ہی ہو گا۔"

میں نے پوچھا۔

"بھلا ہم کس طرح فائدہ اٹھائیں گے۔ شائستہ تو کھوٹا سکہ نکلی۔"

میرے ڈیڈی نے جواب دیا۔

"شائستہ نہ سہی' للی ہی سہی۔ میرا داؤ خالی گیا ہے۔ لہٰذا تم للی کو داؤ پر لگاؤ۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"صاف بات ہے' تم چپکے چپکے للی کو اپنے عشق میں گرفتار کرو' اس بات کا علم اس کی ماں کو نہ ہونے پائے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کریلا کبھی نہیں کھاتا اور عورتیں مجھے کریلے سے بھی زیادہ کڑوی لگتی ہیں۔"

"للی عورت نہیں ہے' ایک نادان لڑکی ہے۔ ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اس سے شادی کرو مگر شادی سے پہلے ضروری ہے کہ وہ تمہاری محبت میں دیوانی ہو جائے۔"

"لیکن مجھے تو محبت کرنی نہیں آتی۔ آپ للی کو قتل کرنے کے لئے کہیں تو میں فوراً کر دوں گا۔"

انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ اب تمہیں خنجر کی دھار سے نہیں بلکہ پھولوں کی نزاکت سوچنا ہو گا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ للی کی ساری دولت اور جائیداد کوئی دوسرا لے جائے؟"

"نہیں' اس میں تو ہمارا نقصان ہے۔"

"تو پھر للی سے محبت کرو۔ اب تم وہی بات کہو گے جو للی کہتی ہے۔ وہی کپڑے گے جو للی پسند کرتی ہے۔ ایک عورت کی انگلی پکڑنے سے پہلے انگلیوں کی نزاکت پ اشعار یاد کر سکتے ہو یاد کر لو کیونکہ عورت تیر اور تلوار سے نہیں مرتی' اپنی انگلیوں ناخنوں کی تعریفیں سن کر مرجاتی ہے۔"

ایک طویل بحث کے بعد ڈیڈی نے مجھے للی سے عشق کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد سے میں ان سے محبت کرنے کے گر سیکھنے لگا۔ پہلے پہل انہوں نے للی کی سی مخروطی انگلیوں کے متعلق کتنے ہی اشعار یاد کروائے۔ ان اشعار میں خوبصورت عورتوں کی انگلیوں کے متعلق اتنی خوبصورت باتیں کہی گئی تھیں کہ کوئی بھی باذوق ان اشعار کو نہیں بھول سکتا تھا لیکن میں روز یاد کرتا تھا روز بھول جاتا تھا۔ کیونکہ سی مخروطی انگلیوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب تک کسی بات سے دلچسپی نہ ذہن نشین نہیں ہوتی۔ البتہ ایک شعر یاد ہو گیا۔

"اللہ رے دستِ ناز کی نازک سی انگلیاں
دل میرا مجھ سے لے گئیں پنجہ مروڑ کے"

اس میں پنجہ مروڑنے والی بات تھی اور یہ میری فطرت کے عین مطابق تھی لئے مجھے یہ شعر یاد رہ گیا۔ ڈیڈی نے سمجھ لیا کہ وہ مجھے میرے مزاج کے مطابق ہی یاد کرا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مجھے بتایا کرتے تھے مجھے کس طرح گرم گرم نگاہوں للی کے چہرے کو تکتے رہنا چاہئے۔

☆======☆======☆

میں نے پہلے سبق پر عمل کیا اور اسے گرما گرم نگاہوں سے تکنے لگا۔ ڈیڈی چھپ کر یکھ رہے تھے۔ للی جب اسکول چلی گئی تو انہوں نے میرے پاس آ کر کہا۔

"تم بالکل ڈفر ہو۔ تم للی کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے قصائی بکری کو دیکھتا ہے۔ یہ رست ہے کہ عورت تنہائی میں مرد کو قصائی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر للی ابھی مل عورت نہیں ہے۔ اس کے سامنے نگاہوں کی چھری لے کر جاؤ گے تو وہ ڈر جائے لی۔ اس لئے نگاہوں کی دھار کو پہلے پہل ذرا کند کر لو۔"

انہوں نے آئینے کے سامنے مجھ سے دیکھنے کی مشقیں کرائیں۔ پھر اسی کے مطابق ں کو آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے دیکھنے لگا۔ کتنے ہی دنوں تک کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ڈیڈی نے میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"تم یہ نہ سمجھو کہ للی پر تمہاری نگاہوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ جب جوان ڑکیاں اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتی ہیں تو چپکے چپکے یہ بھی محسوس کرتی ہتی ہیں کہ کس کی نگاہیں ان تبدیلیوں پر پڑ رہی ہیں۔ ایسے وقت اگر وہ غصے سے دیکھے سجھ لو کہ کام بگڑ گیا۔ اگر انجان بن کر خاموش رہے تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ اس ے احساسات تمہاری نگاہوں کی گرمی محسوس کر رہے ہیں۔"

ڈیڈی عشق کے میدان میں واقعی منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ اگر وہ گائیڈ نہ کرتے تو ا کی طرف سے محسوس ہو جاتا۔ آخر ایک دن للی نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھتے رہتے ہو؟"

ڈیڈی نے پہلے ہی بہت سے جوابات سکھا دیئے تھے۔ میں نے ان سے پڑھا ہوا سبق د کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں دیکھتا ہوں میرا دل تمہیں دیکھتا ہے۔ پہلے میں نے کئی بار کوشش کی کہ ہاری طرف نہ دیکھوں تم برا مان جاؤ گی۔ سچ سچ بتاؤ کیا تم برا مان گئی ہو؟"

ڈیڈی نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں اچانک ہی اس سے یہ سوال کر دوں' واقعی وہ یرے باپ نکلے۔ بالکل صحیح پیش گوئی کی تھی کہ وہ اس اچانک سوال سے پہلے گھبرا جائے

گی۔ پھر شرم سے گلنار ہو جائے گی اور جواب دینے سے کترائے گی۔ اسے کہ
موقع مل گیا۔ اسی وقت اس کی ماں نے اسے آواز دی تھی۔ وہ میرے پاس سے
تیزی سے باہر جانے لگی۔

تب میں نے اس کی چال میں فرق محسوس کیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھا
دوران غیر ارادی طور پر بل کھاتی جاتی تھی۔ میں نے اس کی زندگی میں بل ڈا
تھے۔ مگر لعنت ہے شائستہ پر' ایسے وقت اس کی ممتا بیٹی کے لئے تڑپ گئی تھی۔
ٹھیک نشانے پر بیٹھنے والا تھا کہ اس نے بیٹی کو نشانے سے ہٹا دیا۔

میں نے ڈیڈی کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ انہیں للی سے ہونے والی سار
بتانے کے بعد کہا۔

"اس کی ماں کباب میں ہڈی بن جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے' اس بوڑھی ہڈی
کتے کے سامنے ڈال دوں۔"

ڈیڈی نے بگڑ کر کہا۔

"نان سنس' سوچ سمجھ کر باتیں کرو' وہ بوڑھی ہڈی میرے سامنے رہتی ہے۔

میں نے فوراً ہی ڈیڈی سے معافی مانگ لی۔ کیونکہ میں بے خیالی میں اپنے با
کہہ گیا تھا۔ یوں تو شراب پینے کے بعد ہم ایک دوسرے کو اس سے بھی بڑی گالیا
تھے۔ مگر شائستہ کی کوٹھی میں رہ کر ہمیں مشرقی تہذیب کے مطابق مشرقی باپ بیٹے
رہنا تھا۔ مغربی تہذیب بہت اچھی ہے۔ باپ بیٹے کے درمیان شراب کی بوتل کھو
اور بڑی فراخدلی سے بے شرمی کی اجازت ہے۔ ڈیڈی نے مجھے سمجھایا۔

"یہ نہ بھولو کہ ہم شائستہ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ وہ کہیں اِدھر اُدھر چ
ہماری گالی گلوچ سن سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ تم للی سے محبت کو
بڑھاتے رہو۔ شائستہ کی فکر نہ کرو۔ محبت کے راستے میں ایسی رکاوٹیں آتی ا
ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ شائستہ کو ابھی تمہاری عشق بازی کا علم نہیں ہوا۔"

"ڈیڈی! کیا للی اپنی ماں کو یہ نہیں بتائے گی کہ میں اسے کیسی نظروں ۔
ہوں۔"

"نہیں کوئی عورت اپنے دل کا راز کسی کو نہیں بتاتی۔ وہ چاہتی ہے کہ ا۔
خوشیاں مل رہی ہیں وہ انہیں دل میں چھپا کر رکھے۔ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے
تم پرواہ نہ کرو اور آگے بڑھتے رہو۔"

میں آگے بڑھتا رہا۔ شائستہ جب شام کے وقت ڈیڈی کے ساتھ کلب چلی

، للی کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ تنہائی میں وہ جو باتیں کرتی
میں بھی اسی طرح کی باتیں کرتا تھا۔ جو رنگ اسے پسند تھا' اسی رنگ کا لباس پہنتا تھا
ات بات پر رٹے ہوئے اشعار سناتا تھا۔

ابتدا میں مایوسی ہوئی تھی۔ وہ میری ہر پسند کو پسند کرتی تھی۔ مگر اظہارِ محبت کا موقع
بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایک گھر میں
کے باعث صرف مجھے پسند کرتی ہے یا محبت بھی کرتی ہے۔ میں جب بھی مایوس ہوتا
رے ڈیڈی میری ہمت بندھاتے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"بہت وقت ضائع ہو رہا ہے۔ کتنے ہی دن گزر گئے ہیں۔ اتنے عرصے میں تو میں
درجن عورتوں کو شکار کر لیتا ہوں۔ دیکھو کوٹھی کی چار دیواری میں بات نہیں بنے
اس کے ساتھ باہر کہیں تفریح کا پروگرام بناؤ۔ اگر مان جائے تو سمجھ لو کہ ہتھے چڑھ
ہے۔"

اسی رات جب شائستہ اور ڈیڈی کلب چلے گئے تو میں پروگرام کے مطابق اداس ہو
ھ گیا۔ للی نے مجھ سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔ اتنے اداس کیوں نظر آ رہے ہو؟"

میں نے جواباً ایک شعر عرض کیا:

"مقتل میں حال پوچھو نہ مجھ بے قرار کا
تم اپنے گھر کو جاؤ چھری پھیر پھار کر"

اس شعر میں بھی چھری کا ذکر تھا اس لئے مجھے یاد رہ گیا تھا۔ شاید میں نے موزوں
پر وہ شعر نہیں پڑھا تھا۔ للی نے پوچھا۔

"اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"مطلب یہ ہے کہ یہ کوٹھی میرے لئے مقتل بن گئی ہے۔ یہاں میرا دل گھبراتا
کیا تم میرے ساتھ کہیں باہر نہیں چل سکتیں؟"

"اس کے لئے تو ممی سے اجازت لینی ہو گی۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔

"کیا غضب کرتی ہو؟ تمہاری ممی کو معلوم ہو گا تو وہ کبھی اجازت نہ دیں گی۔ تم
کی کوشش کرو' میں ایک جوان مرد ہوں اور تم بھی بچی نہیں ہو۔ وہ ہزار طرح کے
ت کریں گی کہ کیوں جا رہی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ کسی کے ساتھ جانے کی آخر
ت کیا پیش آ گئی؟"

"ہاں وہ ایسے سوالات کریں گی مگر میں آج تک ان کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں گئی۔ جہاں جانے کی خواہش کرتی ہوں وہ خود ہی لے جاتی ہیں۔"

"اس لئے کہ وہ تمہیں بچی سمجھتی ہیں۔ اپنی انگلی پکڑ کر چلانا چاہتی ہیں لیکن ا میں انگلیاں بدل جاتی ہیں۔ بیٹیاں ماں باپ کی انگلیاں چھوڑ کر اپنی پسند کی کسی دوسر کو سہارے کے لئے تھام لیتی ہیں۔ تم میرے ساتھ جانے کے لئے ممی سے نہ پوچھنا۔"

وہ پریشان ہو کر بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ کیونکہ میں پہلی بار اسے جھوٹ کر گھر سے باہر نکلنا سکھا رہا تھا۔ اب تک صرف اپنی ماں کے لئے اس کے جذبات تھے۔ میں ان حالات میں کھوٹ پیدا کر رہا تھا۔ اسی وقت پورچ میں کار کا ہارن سنائی نہ جانے کیوں شائستہ جلدی واپس آ گئی تھی۔ للی جلدی سے اٹھ کر یوں کھڑی ہو گ چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ میرے پاس سے جانے لگی' میں اسے آواز دی۔

"للی! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

وہ چلتے چلتے تھم گئی۔ اس کے دل میں ماں کا خوف بھی تھا۔ اس کے پاؤں میں التجا کی زنجیریں بھی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر لرزتی آواز میں بولی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے' میں سوچوں گی۔"

اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ماں سے ڈرنے کے باوجود میرے بارے میں سوچ گی۔ نے پتے کی بات بتائی کہ کسی عورت کی سوچ کو اپنا لو وہ خود ہی سوچ کی بھول بھلیا بھٹکتی چلی آئے گی۔ آخر یہی ہوا اور دوسرے دن للی نے مجھ سے پوچھا۔

"میں ممی کی لاعلمی میں کیسے باہر نکل سکتی ہوں؟ صبح سے ایک بجے تک اسکو رہتی ہوں۔ ایک بجے ہی ممی میرا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ پھر شام تک مجھے اپنی نظرو سامنے رکھتی ہیں۔ آج کل شام کو وہ باقاعدگی سے کلب نہیں جاتی ہیں۔ کبھی جاتی ہ تو جلد ہی لوٹ آتی ہیں۔ اکثر مجھ سے کہتی ہیں کہ ان کا دل گھبراتا ہے۔ انہیں ایسا لگ جیسے کوئی مجھے ان سے چھین رہا ہے۔"

پتہ نہیں ان ماؤں کو کہاں سے چھٹی حس مل جاتی ہے۔ اپنی اولاد کے تحفظ کے نیند سے بھی چونک جاتی ہیں۔ ابھی میں عشق کی ابتدا کر رہا تھا اور ایک ماں کے دل آپ ہی آپ خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"بیٹی جوان ہو جائے تو ہر ماں یہ سوچ کر گھبراتی ہے کہ کوئی بیٹی کو اس سے چھ

لے جائے گا۔ اس دنیا کا یہی دستور ہے۔ شادی کے نام پر بیٹیاں چھین لی جاتی ہیں۔ ایک دن تمہارے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ تم اپنی امی کی گھبراہٹ کی فکر نہ کرو۔ تم اگر میرے ساتھ چلنا چاہو تو اسکول کے بہانے چل سکتی ہو۔"

اس نے سہمی ہوئی طویل سانس کھینچ کر اپنے کنوارے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ پہلی بار چوری کرنے والی تھی۔ میرے لئے اپنی تعلیم کا وقت چرانے والی تھی۔ اس لئے سہم گئی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا۔

"گھبراؤ نہیں' تمہاری ممی کو پتہ نہیں چلے گا۔ وہ یہی سمجھیں گی کہ تم ایک بجے تک اسکول میں پڑھ رہی ہو۔ میں بوڑھے ڈرائیور کی جیب گرم کر دوں گا۔ وہ ہمارا رازدار بن کر رہے گا۔"

وہ گھبرا رہی تھی' ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں اس کے اندر حوصلہ پیدا کرتا رہا۔ اسی دن میں نے ڈرائیور کو سو روپے کی خیرات دی اور اسے اپنا رازدار بنا لیا۔ دوسری صبح اسکول کے وقت سے پہلے ہی میں کوٹھی سے نکل گیا۔ آدھ گھنٹے بعد ڈرائیور للی کو اسکول جانے والے راستہ پر لے آیا۔ میں نے للی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو "سی بیچ" کا راستہ بتا دیا۔

سمندر کے ساحل پر عام دنوں میں تمام کاٹیج ویران پڑے رہتے ہیں۔ راستے میں للی سے کھل کر باتیں نہ کر سکا کیونکہ ڈرائیور موجود تھا لیکن تمام راستہ میں اس کے ملائم سے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا رہا۔ اسے تسلیاں دینے کے انداز میں اس کے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ ہولے ہولے بھینچتا رہا۔ یہ ضروری نہیں کہ محبت کا یقین دلانے کے لئے انسان زبان سے بولتا رہے اور عشقیہ اشعار پڑھتا رہے۔ مرد کی خاموش حرکتیں بھی عورت کے دل میں شاعر کے ترنم کی طرح اترتی ہیں۔ اسی لئے میں اپنے ہاتھوں کی گرمی سے اس کے دل کو گرماتا رہا۔

تمام راستے اس نے اپنا ہاتھ پکڑنے اور اس ہاتھ سے مجھے کھیلنے کا موقع دیا۔ اس لئے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر میں نے دو گھنٹے کے لئے ایک کاٹیج کرائے پر لیا۔ کاٹیج کے ایک کمرے میں بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر کے ساتھ ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ وہاں سے ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا تھا۔ میں نے تنہائی کے اس موقع کو ضائع نہیں کیا۔ اس پہلی ملاقات کو کچھ اس طرح یادگار بنانا تھا کہ پھر وہ کبھی بھی مجھے بھلا نہ پاتی۔ ہم دونوں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ میں جذباتی انداز میں پیار و محبت کی باتیں کر رہا تھا اور وہ رہ رہ کر اپنی ممی کا ذکر کر رہی تھی۔ جب میں نے اسے ڈرتے دیکھا

تو اسے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگالیا۔

"تم اس وقت میری پناہ میں ہو۔ یہاں ممی تمہیں پکڑنے نہیں آئیں گی اور نہ ہی تمہیں کوئی دیکھنے آئے گا۔ کیا تمہیں یہ محسوس نہیں ہو رہا کہ تم اس وقت میرے بازوؤں میں محفوظ ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلا دیا۔ میری پناہ میں رہنے کے لئے وہ مجھ سے کچھ اور زیادہ چپک گئی۔ بالکل نوخیز کلی تھی۔ صیاد کے ہاتھوں میں تھرتھر کانپ رہی تھی۔ اب تک میں نے اپنی چھری تلے اپنے شکار کو تھرتھراتے اور تڑپتے دیکھا تھا مگر للی کی تھرتھراہٹ میں بڑا ہی حسن تھا۔ ایسی دلکشی تھی کہ میں خود اس کا دیوانہ بن کر رہ گیا۔

مگر وہ بہت محتاط لڑکی تھی۔ شاید اس کی ممی نے پہلے ہی سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ مردوں سے کس طرح دامن بچا کر رہنا چاہئے۔ مگر میں نے سوچا اتنا ہی کافی ہے۔ جب وہ تنہا ہو گی تو اس ملاقات کی یادیں اسے بے چین کرتی رہیں گی۔ آئندہ بھی ملنے کی تحریک پیدا کرتی رہیں گی۔

ہم ایک بجے سے پہلے ہی کوٹھی میں واپس آ گئے۔ پہلے وہ اسکول کے وقت کے مطابق بوڑھے ڈرائیور کے ساتھ کوٹھی میں گئی۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد میں وہاں پہنچا کہ شائستہ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ مگر وہ شائستہ کی بچی لومڑی کی طرح چالاک تھی اور عقاب کی سی نظریں رکھتی تھی۔ روز کا دستور یہ تھا کہ جب بیٹی اسکول سے آتی تھی تو وہ اسے سینے سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لیتی تھی۔ اس روز اس نے سینے سے لگایا تو بیٹی کے دل کی دھڑکنیں باؤلی ہو رہی تھیں۔ پیشانی کو چوما تو چہرے کی رنگت بدلی ہوئی تھی اور ماں کی طرف دیکھنے والی نظریں سہمی سہمی تھیں۔ اس طرح ماں کو شبہ ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، صبح اسکول جانے والی للی واپس تو آ گئی مگر اپنا بچپن اور معصومیت کہیں چھوڑ آئی ہے۔

شائستہ نے یہ بات میرے ڈیڈی سے کہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی میں کس طرح تبدیلی محسوس کر رہی ہے۔ میرے ڈیڈی نے انجان بن کر پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کیا للی کسی کو پسند کرنے لگی ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟ میں موقع دیکھ کر پیار و محبت سے اس کے دل کا حال معلوم کروں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی ایسے ویسے لڑکے کو پسند کرے۔"

میرے ڈیڈی اس کی بات سن کر خاموش رہے' وہ چاہتے تھے کہ للی خود ہی اپنی ماں

کے سامنے اپنی پسند کا اظہار کرے۔ دو دن بعد میں نے پھر للی کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ ٹھیک اسکول کے وقت وہ بوڑھے ڈرائیور کے ساتھ چڑیا گھر میں مجھ سے ملنے آ گئی۔ وہاں اس نے مجھے بتایا۔

"ممی کو شبہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں تنہائی میں بیٹھی کیا سوچتی رہتی ہوں۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ امتحانات قریب آ رہے ہیں اس لئے میں خاموش بیٹھی دل ہی دل میں یاد کیا ہوا سبق دہراتی رہتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا بہانہ کیا۔ ممی کو اطمینان ہو گیا ہو گا۔"

"ہاں۔ وہ میری بات سے مطمئن ہو کر خاموش ہو گئی تھیں۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی ہیں۔ کل رات میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تکیہ میں منہ چھپائے تمہاری باتیں یاد کر کے مسکرا رہی تھی کہ اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ممی میرے سرہانے کھڑی ہوئی تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر گھبرا گئی۔ پتہ نہیں وہ کب سے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ مجھے گھبراتے دیکھ کر وہ میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے سمجھانے لگیں۔"

"انہوں نے کیا سمجھایا ہے؟"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ ماں سے بڑھ کر جوان بیٹی کا مخلص ساتھی کوئی اور نہیں ہوتا۔ دنیا کا ہر رشتہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر دھوکہ دیتا ہے۔ صرف ایک ماں ایسی ہوتی ہے جو اپنی اولاد سے دھوکہ کھا کر بھی دعائیں دیتی ہے۔ تم مجھے دھوکہ دو گی تب بھی میں تم سے ناراض نہیں ہوں گی۔ تمہیں اچھے برے کی پہچان کرانا میرا فرض ہے۔ اسی لئے میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ اگر تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔"

"میں چاہتی تھی کہ ان سے صاف صاف ساری باتیں کہہ دوں مگر ہمت نہیں ہوئی۔"

"ہمت کیوں نہیں ہوئی۔ تمہیں صاف صاف کہہ دینا چاہئے تھا۔"

"تم نہیں جانتے۔" وہ کہنے لگی۔ "ممی تمہارے اور تمہارے ڈیڈی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب انہوں نے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ شادی کی تو ہر عورت کی طرح ان کے دل میں یہ بات تھی کہ تمہارے ڈیڈی ان کے اخراجات برداشت کریں گے لیکن نہ وہ کچھ کماتے ہیں نہ تم کچھ کرتے ہو۔ تم ہی بتاؤ ایسی صورت میں' میں تمہارا ذکر ان کے سامنے کیسے کر سکتی ہوں۔"

میں نے اپنے چہرے پر اداسی اور مایوسی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم بھی اپنی ممی کی طرح مجھے ناکارہ سمجھتی ہو تو پھر مجھے بھول جاؤ۔ میں یہ
سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔ تم پر اپنا منحوس سایہ پڑنے نہیں دوں گا۔"

اس نے تڑپ کر میرے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر جلدی سے بولی۔

"دل توڑنے والی باتیں نہ کرو۔ اگر ممی کی طرح میں بھی تمہیں برا سمجھتی تو ک
تمہارے اتنے قریب نہیں آتی۔ تم یہ بتاؤ آخر تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"میں کسی کی ملازمت پسند نہیں کرتا۔ شروع ہی سے کاروبار کی طرف میرا دھیا
ہے۔ مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں کوئی کاروبار کرسکوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "شادی کے بعد میری ساری دولت تمہاری ہوگی۔ سٹین لیس سٹیل
کارخانہ بھی تم سنبھال لو گے لیکن شادی سے پہلے کسی طرح کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار ک
تاکہ ممی کو تمہارے خلاف کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔"

میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ کچھ نہ کچھ کروں گا اور جو کماؤں گا اس کی ای
آگے لاکر رکھ دوں گا لیکن اس دوسری ملاقات کے بعد جب للی گھر پہنچی تو اس کی
بہت غصے میں تھیں۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر اس کی پیشانی کو نہیں چوما بلکہ فو
ہی سوال داغ دیا۔

"کہاں سے آرہی ہو؟"

"اسکول سے.........." وہ سہم کر بولی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ میں آج اسکول سے تمہاری رپورٹ لے کر آئی ہوں۔ تم آ
بھی اسکول نہیں گئی تھیں اور آج سے تین دن پہلے بھی تم اسکول کے بہانے کہیں
تھیں۔ کہاں گئی تھیں؟ کس کے ساتھ گئی تھیں؟"

وہ للی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ایک گھنٹہ تک ا
کو کمرے میں بند رکھ کر اس سے ساری باتیں اگلوالیں۔ اس کے چاہنے والے کی حیثیت
سے جب میرا نام آیا تو شائستہ نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ وہ غصے سے تنتناتی ہو
میرے ڈیڈی کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"تم لوگ جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ کیا میں اسی دن کے ل
تم لوگوں کی پرورش کررہی ہوں کہ تم میرے ہی سائے میں بیٹھ کر میری ہی جڑ کاٹنا شرو
کردو؟"

ڈیڈی نے انجان بن کر پوچھا۔

"آخر بات کیا ہے؟"

"انجان نہ بنو۔ پہلے تم نے مجھ سے اس لئے شادی کی کہ میری دولت کے بل پر
عیش کرسکو گے۔ جب باپ بیٹوں کو یہ پتہ چلا کہ ساری دولت اور ساری جائیداد للی کے
نام پر ہے تو اب تمہارا بیٹا اسے محبت کا فریب دے کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"شائستہ اس وقت تم غصے میں ہو اگر سہولت سے میری بات سنو گی تو تمہیں اپنی
غلط فہمی کا پتہ چل جائے گا۔ ہم باپ بیٹے کے دل میں تم لوگوں کے لئے جو عزت اور محبت
ہے اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔ تمہاری محبت
سے مجبور ہوں۔ اس لئے تم سے شادی کی ہے۔ دل پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ اگر میرا بیٹا
للی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ دل سے مجبور ہوگا اور للی بھی دل سے مجبور ہوگی۔ پھر تم
ان کے دل کے معاملات میں کیوں بولتی ہو؟"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی بولی۔

"تمہارا بیٹا چور، بدمعاش اور قاتل ہے۔"

میرے ڈیڈی نے حیرانی پوچھا۔

"کسی دشمن نے تمہارے کان بھرے ہوں گے۔"

"میں نادان نہیں ہوں کہ دوسروں کے بہکانے میں آکر تمہارے بیٹے پر اتنا بڑا
الزام لگاؤں۔ تم سے شادی کرنے کے بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ تم باپ بیٹے ناکارہ ہو تو
اسی وقت میں تم لوگوں کے بارے میں چپکے چپکے معلومات حاصل کرتی رہی۔ میرے پاس
اس بات کی مکمل رپورٹ ہے کہ تم دولت مند عورتوں کو پھانس کر زندگی گزارتے رہے
ہو۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑا دکھ ہوا کہ میں کس آدمی کے پلے پڑ گئی ہوں اور میں تمہیں
چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرے تمام رشتہ دار اس شادی اور طلاق کو مذاق بنا لیتے۔ میں
نے یہ سوچا کہ جو غلطی کر بیٹھی ہوں اس کو ساری زندگی نبھاؤں گی۔ تمہیں صرف کھانے
پینے، گھومنے پھرنے کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقم میں اس لئے
تمہیں دیتی رہتی ہوں کہ بات اور نہ بگڑے، تم دس جگہ جاکر عورتوں کی کمائی نہیں کھاؤ
گے۔ میرے ہی پاس پڑے رہو گے۔"

وہ بولتی جارہی تھی اور غصے سے ہانپتی جارہی تھی۔

"لیکن میں اپنی بیٹی کو غلطی نہیں کرنے دوں گی۔ کیونکہ تمہارا بیٹا تم سے بھی زیادہ
خطرناک ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ کئی قتل کرچکا ہے۔"

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟"

"کسی نے بھی بتائی ہو، تم سمجھتے تھے کہ میں ایک عورت ہوں، تم لوگوں کی اصلیت

معلوم نہیں کر سکوں گی لیکن تم یہ بھول گئے ہو کہ یہی عورت اپنی ذہانت سے سٹین لیس سٹیل کا اتنا بڑا کارخانہ چلا رہی ہے۔ وصیت کی رُو سے جب تک للی کی شادی نہ ہو اس وقت تک میں اس کے وکیل کی نگرانی میں تمام دولت اور جائیداد کو سنبھالتی رہوں گی۔ للی بھی میری سب سے بڑی جائیداد ہے' اسے بھی سنبھالنے کے لئے ہر اس شخص کی اصلیت معلوم کروں گی جس سے وہ نادان لڑکی فریب کھائے گی اور یہ تو تمہارے سامنے کی بات ہے کہ میں نے تمہارے بیٹے کے متعلق صحیح معلومات حاصل کی ہیں اور اب کبھی میں اپنی بیٹی پر اس کا سایہ نہیں پڑنے دوں گی۔ میں تو یہ سوچ کر تم دونوں کو برداشت کر رہی تھی کہ تم لوگ میرا کھاتے ہو میرے وفادار رہو گے۔ مگر اچھا ہوا کہ میں وقت پر ہوشیار ہو گئی۔ تم اپنے بیٹے سے کہو کہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے چلا جائے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

میرے ڈیڈی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"واقعی تم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ کیونکہ تم اپنی بیٹی کی برائی چاہتی ہو۔ اس کی پسند کو یہ الزام دے کر ٹھکرا رہی ہو کہ وہ چور بدمعاش اور قاتل ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے بیٹے کو الزام نہ دو۔ اپنی بیٹی کو جا کر سمجھاؤ کہ وہ میرے بیٹے کا خیال چھوڑ دے۔ اس طرح یہ جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ دوسروں کو برا کہنے سے بہتر ہے کہ وہ اپنی ہی بیٹی کی کمزوریوں کو سمجھے اور اسے سمجھائے۔ اس لئے وہ اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی۔ اس روز سے وہ اپنی بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ اسے اچھے بُرے کی پہچان کراتی رہی۔ اسے دنیا جہان کے نشیب و فراز سمجھاتی رہی۔ میری ایک ایک بُرائی گن گن کر بتاتی رہی لیکن للی نے میری کوئی برائی دیکھی نہیں تھی تو کیسے یقین کر لیتی۔ اس نے تو صرف میرا پیار دیکھا تھا۔ اس لئے میرے پیار کا ایک ایک انداز اسے میری ہی طرف کھینچتا تھا۔ ایسے ہی موقع پر میں اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے جانے لگا تو اس نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے اسے کہا۔

"مجھے جانے دو۔ میں نے آج تک تمہیں یہ بات نہیں بتائی تھی کہ تمہاری ماں اپنی ممتا کی آڑ میں کس طرح تم سے دشمنی کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اور پانچ دس برس تک تمہاری شادی نہ ہو تاکہ تمہاری ساری دولت اور جائیداد ان کے ہاتھوں میں رہے۔ یقین نہ ہو تو تم اپنی ممی سے جا کر پوچھو۔ وہ کبھی اتنی جلدی تمہاری شادی نہیں کرنا چاہیں گی۔"

وہ جا کر کیا پوچھتی۔ اس کی ممی تو اکثر کہتی تھی کہ ایک سال بعد وہ میٹرک پاس کرے گی۔ پانچ چھ برس تک کالج میں پڑھے گی۔ یہ سارا حساب للی کے سامنے تھا۔ میری باتوں نے اسے اس پہلو پر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کی ماں اسے خود مختار بننے نہیں دے گی۔ میں نے ماں بیٹی کے درمیان اختلافات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ ابتدا میں للی میری محبت اور ممتا کے درمیان الجھتی رہی۔ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ جو لڑکیاں ایک بار والدین کو دھوکہ دے کر اسکول کے بہانے اپنے عاشقوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں' وہ پھر اسی راستہ پر بھٹکتی رہ جاتی ہیں۔ بچپن سے جوانی تک جو والدین کی محبت اور ان کا خلوص ہوتا ہے وہ انہیں یاد نہیں رہتا۔ صرف وہ سحر یاد رہتا ہے جو مجھ جیسے عاشق ان کے کانوں میں پھونکتے رہتے ہیں۔ للی محبت کے اس مقام پر آ پہنچی تھی جہاں والدین کی نصیحتیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

شائستہ کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دن کا چین اور رات کی نیند غارت ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ للی نے مجھے وہاں سے زبردستی جانے سے روک لیا تھا۔ ماں سے ضد کی تھی کہ اگر میں وہاں سے چلا گیا تو وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ بھوکی مرجائے گی۔ بیٹی کی بھوک ماں کی بھوک تھی۔ بیٹی کی پریشانی ماں کی پریشانی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک للی ہی تھی جو شائستہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں بیٹی کے لئے وہ اپنی زندگی کی ساری پونجی ہار گئی تھی۔ دوسری شادی کر کے وصیت کی رُو سے اپنے حصے کی جائیداد کو بیٹی کے نام منتقل کر دیا تھا۔ جو اپنے پاس تھا وہ سب کچھ اسے دے چکی تھی۔ اس بیٹی کو اگر اس کے خون کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنا سارا خون نچوڑ کر اسے دے دیتی۔ پھر وہ ایسی گڑیا جیسی معصوم بیٹی کو مجھ جیسے قاتل کے حوالے کیسے کر سکتی تھی؟

میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا' اس کی عزیز بیٹی کو اس کے سامنے رکھ کر ایسی ترپ چال چلی تھی کہ وہ زیادہ عرصے تک ہمیں نہیں ٹال سکتی تھی۔ اسے بیٹی کی پسند کے آگے جھکنا تھا۔ کیونکہ للی رفتہ رفتہ اپنی ماں کو اپنی خوشیوں کی دشمن سمجھتی جا رہی تھی۔ اب ماں سے جھگڑنے بھی لگی تھی اور جھگڑے کے دوران یہ بات کہہ جاتی تھی کہ ماں اس کی دولت پر سانپ بن کر بیٹھی ہوئی ہے۔

شائستہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ جس بیٹی نے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی اب میرے عشق نے اسے باغی بنا کر ماں کے سامنے الٹی سیدھی باتیں کرنا سکھا دیا تھا۔ مگر شائستہ کے حوصلے کی داد دینی چاہئے کہ ہر طرف سے بازی ہارے جانے کے باوجود وہ بیٹی کو بچانے کی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ ہی لیتی تھی۔ جب اس عورت سے کوئی بات نہ بنی تو

اس نے ہمارے کنگلے ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے بظاہر یہ رشتہ منظور کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ مجھے یہ شادی اپنے بل بوتے پر کرنی ہو گی لیکن جس طرح وہ ہمارے کھانے پینے کے اخراجات وغیرہ برداشت کرتی تھی' اس طرح وہ شادی کے اخراجات برداشت نہیں کرے گی۔ للی نے سنا تو ماں کی اس شرط پر اعتراض کیا۔

"آپ نے یہ فضول سی شرط کیوں رکھی ہے؟ آخر میری دولت کس دن کام آئے گی؟"

"تمہاری دولت تمہاری شادی کے بعد کام آئے گی۔ شادی کے بعد تم چاہو تو سب کچھ شوہر کے نام کر دینا مگر اس سے پہلے تمہیں یہ آزمانا چاہئے کہ جس شخص کو تم سب کچھ دو گی وہ شادی سے پہلے تمہیں کچھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟"

للی ماں سے بحث نہ کر سکی کیونکہ اس کے وکیل نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا اور اس سے کہا تھا۔

"شادی سے پہلے کسی کی مدد کرنے کے لئے تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ ہم نے تمہارے انتخاب کو تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا شادی ہونے تک ہم جو کچھ بھی کریں گے تمہاری بھلائی کے لئے کریں گے۔ شادی سے پہلے تم کچھ نہ بولو۔"

للی اپنی ماں سے جھگڑا کر سکتی تھی لیکن اپنے وکیل سے جھگڑا کر کے نہیں جیت سکتی تھی۔ اس لئے خاموش رہنا پڑا۔ اب مجھے تمام دولت کا مالک بننے سے پہلے خود کو للی کا اہل ثابت کرنا تھا۔ شائستہ کا مطالبہ تھا کہ میں اس کی بیٹی کے لئے زیورات کے پانچ سیٹ اور اعلیٰ درجے کے پچیس جوڑے لاؤں۔ اس کے علاوہ شادی کے تمام دوسرے اخراجات برداشت کروں۔ میں نے اور ڈیڈی نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے مطالبات پورے کرنے کے لئے ہمیں کم از کم بیس ہزار روپے کی ضرورت ہو گی۔

شائستہ نے وقتی طور پر بڑی زبردست رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ میں مجبوری ظاہر کر کے للی کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اکثر اس کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ میں اس کے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں مگر کرنسی نوٹ آسمان پر نہیں ہوتے' زمین پر ہوتے ہیں۔ دو چار ہزار کی بات ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ روپے کسی درخت پر تو نہیں لگتے ہیں کہ میں توڑ کر لے آتا۔ یکمشت بیس ہزار تو صرف پرانے دھندے سے ہی حاصل ہو سکتے تھے لیکن ادھر ایک مدت سے میں نے چاقو پکڑنا چھوڑ دیا تھا۔ خنجر کی دھار پر چلنے کی بجائے پھول کی نزاکت پر چل رہا تھا۔ اب ایسی بات نہیں تھی کہ میں داؤ پیچ بھول گیا تھا۔ بس اتنی سی حماقت ہوئی تھی کہ اپنے لائن کے پرانے ساتھیوں سے ملنا جلنا چھوڑ

دیا تھا۔ اب کوئی تگڑی اسامی تلاش کرنے کے لئے ان سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی ضرورت تھی۔

ڈیڈی بھی کچھ کم پریشان نہیں تھے۔ وہ بھی اس فکر میں تھے کہ سونے کی چڑیا جلد از جلد میرے نکاح کے پنجرے میں بند ہو جائے۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ بھی اپنے طور پر کہیں سے کچھ رقم حاصل کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اس دن کے بعد شائستہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ اس نے ڈیڈی کا جیب خرچ بند کر دیا تھا۔ ڈیڈی نے اعتراض کیا تو جواب ملا۔

"میرے روپے تمہاری جیب میں جائیں گے اور تمہاری جیب سے تمہارے بیٹے کی جیب میں پہنچیں گے۔ میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماروں۔ آخر تمہیں پیسے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہاں تین وقت کی بجائے چار وقت کھاتے ہو۔ تمہارے لئے میں نئے جوڑے سلوا دیتی ہوں۔ تم کہیں جانا چاہتے ہو' میں اپنے ساتھ کار میں لے جاتی ہوں۔ کلب میں وہسکی پیتے ہو' بل میں ادا کرتی ہوں۔ پھر تم نقد رقم لے کر کیا کرو گے؟"

"ضرورت تو پڑتی ہی رہتی ہے۔ کلب میں سبھی اونچی سوسائٹی کے لوگ فلش اور رمی کھیلتے ہیں۔ اب میں ان کے ساتھ نہ کھیلوں تو وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟"

"میں انہیں سمجھا دوں گی کہ تم راہِ راست پر آ گئے ہو۔ اگر تم نے یہ سوچ رکھا ہے کہ جوئے میں بڑی بڑی رقمیں جیت کر تم اپنے بیٹے کو دولہا بناؤ گے تو میں ان حرام کے پیسوں سے اپنی بیٹی کو دلہن نہیں بناؤں گی۔"

شائستہ اور ڈیڈی کے درمیان اسی بات پر جھگڑے ہوتے رہے۔ ڈیڈی پہلے کی طرح ناراض ہو کر اس گھر سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس بار شائستہ انہیں واپس نہیں بلائے گی۔ وہ اسی طرح ہمیں تتر بتر کرنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ لہٰذا وہ اس کی ہر زیادتی کو برداشت کر رہے تھے۔ ویسے دیکھا جائے تو شائستہ کی زیادتی بھی کیا تھی۔ وہ چاہتی تو انہیں خرچ دیتی' اب نہیں چاہتی تھی اس لئے اخراجات بند کر دیئے تھے۔ ازدواجی زندگی میں مرد کا پلہ اسی وقت بھاری ہوتا ہے جب وہ کماتا ہو' اگر نہ کمائے تو دولت مند عورت کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ بات غلط ہے کہ مرد عورت سے برتر ہے۔ برتر تو صرف دولت ہوتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں چاندی کا جوتا ہوتا ہے وہی دوسرے کے سر پر مارتا ہے یا مارتی ہے۔

ڈیڈی چپکے چپکے کوشش کرتے رہے کہ کسی دوسری دولت مند عورت کو شکار کرلیں اور اس کی خبر شائستہ کو نہ ہونے پائے اور وہ تھی کہ سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی تھی۔ مگروہ چوبیس گھنٹے تو پہرہ نہیں دے سکتی تھی۔ رات کو سوتے وقت اور بیٹی کو سمجھاتے وقت وہ ان سے غافل ہو جاتی تھی۔ ڈیڈی نے اپنے سونے اور جاگنے کا وقت بدل دیا۔ جب وہ رات کو سوتی تو یہ جاگتے رہتے۔ چونکہ رات کو جاگتے رہتے تھے اس لئے دن کو سوتے رہتے۔ اس طرح شائستہ سے کسی حد تک دوری ہو گئی۔

اسی دوری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنی ایک پرانی بیوہ فرینڈ سے رابطہ قائم کیا۔ رات کو جب شائستہ سو جاتی تو وہ چپ چاپ کوٹھی سے نکل جاتے اور پرانے رشتے کی قسمیں کھا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے رہتے۔ ان کی دو راتیں ٹوٹی ہوئی محبت کو جوڑنے میں لگ گئیں۔ تیسری رات وہ اپنے مطلب کی بات کرنا چاہتے تھے یعنی اس سے اچھی خاصی رقم اینٹھنے والے تھے لیکن اسی وقت شائستہ پہنچ گئی۔

میں راتوں کو اپنے شکار کی تلاش میں نکل جاتا اگر کوٹھی میں موجود رہتا تو شائستہ کو وہاں تک پہنچنے کا موقع نہ دیتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ مکار عورت میرے ڈیڈی کو ڈھیل دے رہی تھی۔ تیسری رات جب وہ گھر سے نکلے تو وہ بھی اپنی کار میں ان کا پیچھا کرتی ہوئی ان کی بیوہ فرینڈ کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ وہاں ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ ڈیڈی کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے ان کی بیوہ فرینڈ سے کہا۔

"بتاؤ میرا شوہر تمہارے گھر کیوں آیا ہے' تم سے کیا رشتہ ہے؟ اگر کوئی نہیں تو بولو اس کے ساتھ شادی کرو گی؟ اس سے کہو کہ مجھے طلاق دے کر تمہارے پاس چلا آئے۔"

یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا تھا کہ ڈیڈی شائستہ کو طلاق دے کر چھوڑ دیتے اور اس طرح میری پوزیشن کمزور بنا دیتے۔ دوسری طرف اس بیوہ عورت کی عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے خاوند کے مرنے کے بعد جو کچھ کیا تھا' چوری چھپے کیا تھا اور شائستہ اس کی بیوگی کا بھانڈا پھوڑ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر شائستہ سے کہا۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ تم میری عزت رکھ لو۔ میں آئندہ تمہارے آدمی کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔"

ڈیڈی نے بھی معافی مانگی تو شائستہ نرم پڑ گئی۔ وہ پھر ڈیڈی کو اپنے ساتھ باندھ کر واپس لے آئی اور انہیں اچھی طرح یہ سبق سکھا دیا کہ وہ نیند کی حالت میں بھی اپنی بیٹی کی بھلائی کے لئے جاگتی رہتی ہے۔ اگر ڈیڈی دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اسی طرح پکڑے جائیں گے۔ ڈیڈی شکست کھا کر بیٹھ گئے۔ شائستہ نے انہیں معاف تو کر دیا

تھا لیکن اپنی بیٹی کے سامنے ان کے دھوکے اور فریب کی باتیں کرتی رہتی تھی۔

"دیکھو للی! اب بھی ہوش میں آؤ۔ میں اس آدمی سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔ یہ دونوں باپ بیٹے اوّل درجے کے مکار ہیں۔"

للی نے جواب دیا۔ "باپ اگر بُرا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹے میں بھی بُرائی ہے۔ جس میں بُرائی ہے' آپ اسے چھوڑ دیں۔"

"تم ابھی نادان ہو۔ تمہیں شادی کے بعد پتہ چلے گا کہ شوہر بُرا ہو تب بھی اسے چھوڑتے ہوئے دنیا جہان کی بدنامیاں عورت کو ڈراتی ہیں۔ اگر طلاق لوں گی تو خاندان والے طنز کریں گے۔ تمہارے بارے میں بھی یہی کہیں گے کہ ماں شوہر بدلتی ہے تو آگے چل کر بیٹی بھی یہی کرے گی۔ تم نہیں جانتیں جو کچھ والدین کرتے ہیں وہی اچھی بری باتیں ان کی اولاد سے بھی منسوب کر دی جاتی ہیں۔ ویسے بھی میں کرامت کو اس لئے برداشت کر رہی ہوں کہ وہ ایک اچھا محافظ ہے۔ جب سے وہ اس کوٹھی میں آیا ہے کسی رشتے دار نے ہمیں پریشان نہیں کیا۔ ہم دو عورتوں کے لئے اتنا سا تحفظ بھی بہت ہے۔ اب جو الجھنیں وہ پیدا کر رہے ہیں ان میں تو میں الجھ ہی چکی ہوں۔ اگر میں انہیں کوٹھی سے بھگا بھی دوں تو تم اپنی احمقانہ محبت سے باز نہیں آؤ گی۔ اگر تم میرا ساتھ دو اور وعدہ کرو کہ اس قاتل بدمعاش سے شادی نہیں کرو گی تو میں ایک ہی جھٹکے میں ان سے سارے رشتے توڑ دوں گی۔"

للی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے میرے پاس آ کر یہ ساری باتیں بتائیں۔ اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ ایک ہی بات پر اڑی ہوئی تھی کہ میرے ڈیڈی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن مجھ میں برائی نہیں ہے کیونکہ میں اس کے سامنے ہمیشہ میٹھے بول بولتا تھا اور اسے محبت کی مٹھاس سے آشنا کراتا رہتا تھا۔

ایک رات میں پریشان حال اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا کیونکہ تین ماہ گزر چکے تھے' اب تک کوئی شکار مجھے نہیں ملا تھا اور ڈیڈی بھی اپنی سی کوششیں کر کے ناکام ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیس ہزار جیسی بڑی رقم کہاں سے حاصل ہو گی اور کیسے حاصل ہو گی؟ اسی وقت للی میرے کمرے میں آئی۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ یہ ایش ٹرے سگریٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس قدر سگریٹ کیوں پیتے ہو؟"

"اس لئے کہ کلیجہ جل جائے۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "کسی طرح مجھے موت آ جائے۔ تمہیں دیکھ کر ندامت سے میرا سر جھک جاتا ہے کہ میں تمہیں حاصل

کرنے کے لئے کہیں سے کچھ کما کر نہیں لا سکتا۔ للّی میں کیا کروں' بتاؤ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ کوئی چھوٹا سا کاروبار کر سکوں۔ اگر چھوٹا سا کاروبار کیا بھی تو اس سے بیس ہزار کا منافع حاصل کرنے تک بوڑھا ہو جاؤں گا۔ تمہاری ممی بہت چالاک ہیں' وہ یہی چاہتی ہیں کہ تم بھی اسی انتظار میں بوڑھی ہو جاؤ۔ کبھی شادی نہ کر سکو اور وصیت کی رُو سے وہ اور وکیل صاحب تمہاری دولت اور جائیداد کے مالک بنے رہیں گے۔"

میں شروع ہی سے للّی کے ذہن میں یہ زہر ٹپکاتا آ رہا تھا کہ اس کی ماں شادی کے سلسلے میں صرف اس لئے رکاوٹ بن رہی ہے کہ بیٹی دولت اور جائیداد کے معاملہ میں خودمختار نہ بن جائے۔ وہ ایک بار اپنی ماں کے روبرو بھی کہہ چکی تھی کہ وہ خواہ مخواہ محبت کی نمائش کرتی ہے اور سانپ بن کر اس کی دولت پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے اسے اور زیادہ بھڑکایا۔

"تم ایک فرماں بردار بیٹی بن کر اپنی ممی کو ظلم کرنے کا موقع دے رہی ہو۔ تمہارا تو کچھ نہیں بگڑ رہا ہے مگر فکر اور پریشانیاں مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں۔"

"ایسی بات نہ کہو۔ میں تم سے زیادہ پریشان رہتی ہوں۔ میں خاموش رہتی ہوں اس لئے میرے دل کی حالت تم پر ظاہر نہیں ہوتی۔ میں سوچتے سوچتے تھک گئی ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"تمہیں دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہئے۔"

"میری تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ میں ساری دولت اور جائیداد چھوڑ کر تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں۔"

میں اس کے اس فیصلہ سے گھبرا گیا۔ دولت اور جائیداد کے بغیر اس کی قیمت ہی کیا تھی کہ میں اسے بھگا کر لے جاتا۔ میں نے سمجھایا۔

"یہ احمقانہ فیصلہ ہے۔ تمہارے مرحوم باپ نے یہ سب کچھ تمہارے لئے چھوڑا ہے۔ تم اپنے حقوق چھوڑ کر میرے ساتھ بھاگو گی تو تمہاری ممی اور وہ وکیل صاحب اِدھر اُدھر سے ثبوت حاصل کر کے مجھے خواہ مخواہ قاتل اور بدمعاش ثابت کریں گے اور تمہیں بھی یہ کہا جائے گا کہ تمہیں اچھے بُرے انسان کی پہچان نہیں ہے۔ تم غلط فیصلہ نہ کرو بلکہ ابھی جا کر اپنی ممی سے اپنا حق مانگو۔"

میں نے اسے بار بار بھڑکایا تو وہ غصے سے تنتناتی ہوئی اپنی ممی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ شائستہ کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ اک ذرا سا سرکا ہوا تھا میں پردے کی آڑ میں رہ کر ماں بیٹی کو دیکھ سکتا تھا۔ ان کی باتیں بھی سن سکتا تھا۔ شائستہ

ایزی چیئر پر بیٹھی ہوئی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ للّی اسی وقت دندناتی ہوئی کمرے میں پہنچی اور غصے سے پاؤں پٹخ کر کہنے لگی۔

"ممی یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو آرام سے بیٹھی رہتی ہیں یا سوتی رہتی ہیں۔ آپ کو اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہے کہ آپ دوسروں کی زندگیاں تلخ کر رہی ہیں۔ جس بیٹی کے لئے جان دینے کی باتیں کرتی تھیں اسی کی زندگی میں آپ نے زہر گھول دیا ہے۔"

شائستہ نے ممتا بھری مسکراہٹ سے کہا۔

"بیٹی' ماں کے پاس زہر نہیں ہوتا۔ تم کیا جانو کہ میں کس طرح اس زہر کا توڑ کر رہی ہوں جو تمہاری زندگی میں گھولا جا رہا ہے۔"

"اب آپ ممتا اور محبت کی باتیں کریں گی۔ میں آپ کی باتیں سنتے سنتے تنگ آ گئی ہوں۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ جب تک آپ گھر میں رہتی ہیں' مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے سر پر بہت بھاری پتھر رکھا ہوا ہے۔"

شائستہ نے اسے بہت ہی دل برداشتہ ہو کر دیکھا۔ پھر دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

"تم میری وہی معصوم بیٹی ہو جو میرے سامنے ادب سے باتیں کیا کرتی تھی اور میرے سینے سے یوں لگ جاتی تھیں جیسے ماں سے بڑھ کر کوئی نہ ہو۔"

وہ غصے اور نفرت سے بولی۔

"اس وقت میں نادان تھی' نہیں جانتی تھی کہ جسے ماں سمجھتی ہوں وہی میری خوشیوں کی دشمن بنے گی۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو للّی! اگر میری محبت تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو یہاں سے چلی جاؤ۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔

"میں کیوں جاؤں گی۔ میرے ڈیڈی کا گھر ہے۔ دوسری شادی کر لینے کے بعد آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہئے تھا مگر معلوم ہوتا ہے آپ مجھے مار کر ہی یہاں سے جائیں گی۔ میرا بس چلتا تو میں ہی آپ کو مار ڈالتی۔"

شائستہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ کھلی ہوئی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ لاڈلی بیٹی اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی ماں کو مارنے کی خواہش ظاہر کر رہی تھی۔ وہ بڑے کرب سے بولی۔

"نہیں' بیٹی تم مجھے مار کر ایک دن پچھتاؤ گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پچھتاؤ۔ تم کہو تو

میں خود ہی زہر کھا کر مرجاؤں۔"

"ہاں مرجائیے' زہر کھا لیجئے' گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیجئے۔ مرنے کے کتنے ہی راستے ہیں۔ خدا کے لئے مر کر ہی میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ میں دوسری صبح آپ کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے جھٹکے کھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ شائستہ کا چہرہ ایسے پیلا پڑ گیا تھا جیسے بیٹی سارا خون نچوڑ کر چلی گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسی وقت مرگئی ہو۔ ہاں اسے زندگی کی بڑی سے بڑی ٹھوکروں نے نہیں مارا تھا۔ بیٹی کی باتوں نے مار دیا تھا۔ وہ کمرے میں چاروں طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اپنی قبر کو اندر سے دیکھ رہی ہو۔ قبر میں اندھیرا ہوتا ہے' شاید اسے بھی اندھیرا نظر آ رہا تھا اسی لئے ایک اندھی کی طرح اس کے دیدھے پھیل گئے تھے۔

اسے جیتے جی مرتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ یوں تو وہ ایک عرصے سے مرتی چلی آ رہی تھی۔ پہلے خاوند نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوسرا خاوند میرے باپ کے روپ میں ملا تو وہ اسے اچھی طرح لوٹتا رہا اور ذہنی کرب میں مبتلا کرتا رہا۔ جس بیٹی پر اتنا ناز تھا وہ بھی ایسی بات کہہ گئی تھی جیسے زندگی اس پر تھوک کر چلی گئی ہو کہ میں جا رہی ہوں تم مرجاؤ ....

اور میں صاف طور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ مر رہی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے سرہانے والی میز کی طرف جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی روح عالم ارواح میں ہوا کے دوش پر چل رہی ہو۔ اس نے میز کی دراز کھول کر ایک شیشی نکالی۔ للی نے مجھے بتایا تھا کہ ممی اپنے سرہانے خواب آور گولیاں رکھتی ہیں۔ جب تک کہ ایک گولی نہیں کھالیتیں انہیں نیند نہیں آتی لیکن اس وقت اس نے شیشی سے کتنی ہی گولیاں اپنی ہتھیلی پر الٹ دیں۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ خودکشی کر رہی ہے۔ وہ دوسرے ہاتھ کی انگلی سے ہتھیلی پر رکھی ہوئی گولیوں کو گن رہی تھی۔ بیٹی کے دیئے ہوئے دکھوں کی طرح ایک ایک گولی کا حساب کر رہی تھی۔ جب بیٹی اپنی نہ رہی تو پھر اس دنیا میں کیا رہ گیا؟ عورت اپنے شوہر کے مرنے کے بعد صرف اولاد کے لئے زندہ رہتی ہے۔ کیونکہ اولاد کے سوا زندگی میں جتنی خوشیاں آتی ہیں وہ سب میرے اور میرے باپ کی طرح جھوٹی ہوتی ہیں۔ ہم خوشیوں کے نام پر آئے تھے اور اس گھر کو اس کے لئے دکھوں کا جہنم بنا دیا۔ بیٹی کی بے مروتی اس جہنم کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ بھی یہی مشورہ دے کر چلی گئی تھی کہ اس

جہنم میں بھی موت نہیں آتی تو زہر کھالو' یا پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لو۔ کسی طرح مر جاؤ اور میرے لئے نیکی کرو۔

بیٹی جیسی آخری پونجی چھن گئی تو خواب آور گولیوں کو اپنی مٹھی میں سختی سے بھینچ لیا۔ پھر ایک گلاس میں جگ سے پانی انڈیلنے لگی۔ بس جہاں تک ماں کو اپنا فرض نبھانا تھا وہ نبھا چکی۔ آخری فرض یہ رہ گیا تھا کہ مر کر بیٹی کی یہ خوشی بھی پوری کر دے۔ اس نے ایک ہاتھ سے پانی کا گلاس اٹھایا پھر خواب آور گولیوں سے بھری ہوئی مٹھی کو اپنے منہ کے قریب لائی۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک ننھی سی چھلانگ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ گولیاں منہ میں جاتیں حلق سے اترتیں' پھر بیٹی سے ہمیشہ کے لئے رشتہ ٹوٹ جاتا۔ مگر وہ اچانک ہی رک گئی۔ چند ساعتوں کے لئے ایک دم سے ساکت ہو گئی۔

اُلو کی پٹھی' ڈرامہ کر رہی تھی۔ وہ گولیوں کو نگلنے کی بجائے اچانک ہی قہقہے لگانے لگی۔ قہقہوں کے ایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ایک ایک گولی کو گلاس کے پانی میں ڈالنے لگی۔ شاید وہ ہمارا مذاق اڑا رہی تھی یا پھر مرنے کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیا تھا کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کی خواہش کو کبھی نہیں ٹھکرایا تھا۔ اس کی اس عادت کو ہم سب ہی جانتے تھے کہ جب وہ اپنی بیٹی کی ضد سے مجبور ہو جاتی ہے تو بے بسی سے ہنسنے لگتی تھی اور ہنستے ہنستے رونے لگتی تھی۔ اس کی پسند کی کوئی چیز آؤٹ آف مارکیٹ ہو تو وہ بلیک سے مہنگے داموں ہنستے ہنستے اسے خرید دیتی تھی۔ وہ ایک قاتل کو اپنا جیون ساتھی بنانے کی ضد کرے تو وہ روتے روتے اس رشتے کو تسلیم کر لیتی تھی۔ بلکہ تسلیم کر چکی تھی۔ پھر بیٹی نے اسے مردہ دیکھنے کی خواہش کی تھی تو وہ اس کی یہ خواہش کیسے پوری نہ کرتی؟ مگر تعجب ہے اس وقت اس خواہش کو اس نے ٹال دیا تھا۔ اس کی ہتھیلی کی ساری خواب آور گولیاں گلاس کے پانی میں حل ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے گلاس کے پانی کو ایک جھٹکے سے کھڑکی کی طرف پھینک دیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں کھڑا ہوا ہوں۔ سارا پانی میرے منہ پر آیا۔ اُلو کی پٹھی نے میرا ہی جوتا میرے منہ پر دے مارا تھا۔

میرے جی میں آیا کہ میں ابھی بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں جاؤں اور اس عورت کا گلا دبوچ کر اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔ اس سے پہلے بھی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ قتل کا کوئی بزنس نہیں مل رہا ہے تو میں شائستہ کو ہی قتل کر دوں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اگر وہ شادی سے پہلے قتل ہو جاتی تو للی مجھ پر شبہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی ماں میرے خلاف کافی زہر اگل چکی تھی۔ میرے ڈیڈی نے بھی مجھے سمجھایا۔

"تمہیں صبر سے کام لینا چاہئے۔ ابھی للی تمہاری حمایت کر رہی ہے۔ اگر اس گھر

میں ایک قتل ہو جائے گا تو اس کا وکیل تمہارے پیچھے پڑ جائے گا اور اس طرح وہ لالی کے اعتماد میں تمہاری طرف سے شگاف پیدا کر دے گا۔ تم جلد بازی نہ کرو۔ ابھی تو تین ماہ ہی گزرے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمہیں جلد ہی بیس ہزار کا بزنس مل جائے گا۔"

کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ ڈیڈی کو پیرو مرشد مان لوں۔ ان کی باتیں اکثر صحیح ثابت ہوتی تھیں۔ ایک ہفتے کے بعد ہی مجھے ایک بزنس مل گیا۔ میں جمن دادا کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ جی ایریا کا حمدو ایک نوجوان کے ساتھ میری میز پر آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"یار تم کہاں مرجاتے ہو' کل سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ سنا ہے آج کل کسی عالیشان کوٹھی میں رہتے ہو۔ اتنی اونچی جگہ رہو گے تو نیچے والوں کا دھندا کیسے کرو گے۔ ایک دم فسٹ کلاس بزنس ہے۔ بولو کرو گے؟"

میں ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے عرصے کی تلاش کے بعد میں حمدو سے نہ مل سکا تھا کیونکہ وہ حال ہی میں سزا کاٹ کر آیا تھا اور آتے ہی اس پٹھے نے میرے لئے بزنس مہیا کر دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی دو چائے کا آرڈر دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات یہیں ہو گی؟"

حمدو نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ہاں یہیں ہو گی۔ یہاں کون سالا جاسوسی کرنے آئے گا۔" اس نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جوان بہت شریف آدمی ہے۔ ایک دم اپنے جیسا شریف ہے۔ یہ اپنی بوڑھی ماں کو ہمیشہ کے لئے خلاص کر دینا مانگتا ہے۔"

وہ نوجوان گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے چاروں طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا۔

"حمدو بھائی مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس معاملہ میں پھنس جاؤں۔"

"ارے تم کیوں گھبراتے ہو۔ تم نے ہم کو پیسہ دے دیا ہے' بس تمہارا کام ختم ہو گیا باقی والا کام اپنا یہ بھائی کرے گا۔"

حمدو نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کتنے کا بزنس ہے؟"

"بزنس تو پچیس ہزار کا تھا۔ یہ جوان پچیس ہزار لے کر قاسم دادا کے پاس گیا تھا۔ قاسم دادا اپنے علاقے میں چیئرمین کی کرسی کے لئے الیکشن لڑ رہا ہے۔ اگر اس کے پاس

ذرا بھی ٹائم ہوتا تو وہ پچیس ہزار کو کبھی نہ چھوڑتا۔ بہت مجبور ہو کر اس نے تین ہزار اپنے پاس رکھ لئے اور اس نوجوان کو بسم اللہ بھائی کے پاس پہنچا دیا۔ بسم اللہ بھائی اپنے کفن کا کپڑا خریدنے بازار جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مرنا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حاجیوں کی فہرست میں اس کا نام نکل آیا ہے۔ حاجی لوگ اپنے ساتھ کفن کا کپڑا لے جاتے ہیں نا' اسی لئے وہ کفن خریدنے جا رہا تھا۔ اس لئے اس نے بھی کمیشن کے تین ہزار اپنے پاس رکھ لئے اور انیس ہزار میں یہ سودا میرے پاس پہنچا دیا۔ تم جانتے ہو کہ میں ابھی دو سال کی سزا کاٹ کر آیا ہوں۔ اتنی جلدی میں کسی لفڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بھائی سیدھی بات ہے' میں نے بھی اپنا تین ہزار کمیشن رکھ لیا ہے اور اب سولہ ہزار میں یہ بزنس تمہارے آگے ہے .... بولو کرو گے؟"

میں سوچنے لگا۔ ساڑھے تین ماہ کے بعد بزنس ملا بھی تو ایسا کہ میرے حساب سے چار ہزار کم رہے تھے۔ کوئی بات نہیں سولہ ہزار تو ہاتھ آ رہے تھے۔ باقی جو کمی تھی وہ بھی کہیں سے کسی طرح پوری ہو جاتی۔ پھر بھی میں نے حمدو سے شکایت کی کہ کمیشن بہت کٹ گیا ہے۔ حمدو نے جواب دیا کہ کام کی مناسبت سے یہ رقم بھی بہت ہے کیونکہ ایک معمولی سی چٹکی میں مسلنے والا کام ہے۔ ایک بہت ہی کمزور اور بیمار عورت کو قتل کرنا ہے۔

عورت کو قتل کرنا ہے؟ پھر تو کوئی بات نہیں تھی۔ واقعی چٹکیوں میں مسلنے والا کام تھا۔ کسی طرح کا دنگا فساد یا زور آزمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بات کا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ شکار زور آور ہو گا اور مجھ پر غالب آ جائے گا۔ ایک کمزور عورت میں کیا دم خم ہوتا ہے' وہ بھی بیمار عورت۔ بس ایک بار کس کے دبوچا اور چھری پھیر دی..........

ذرا ٹھہریئے .... مجھے پسینہ پونچھنے دیجئے۔ زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو قتل کیا تھا۔ کمزور اور بیوقوف عورت سمجھ کر قتل کیا تھا۔ اب وہ مجھے یاد آتی ہے تو آپ ہی آپ پسینہ آ جاتا ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی حماقت ہو چکی ہے۔ یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ شکار کھیلنے سے پہلے شکار کی عادات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ میں نے اس لئے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کمزور تھی۔ بیمار تھی اور اپنے بستر تک محدود تھی۔ میں نے ایک عورت کی فطرت کو نہیں سمجھا لیکن قتل کرنے سے پندرہ گھنٹے پیشتر اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور اس کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ نوجوان اس بیمار عورت کا بیٹا تھا اور اپنی بیمار ماں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کی ماں دو سال سے بیمار ہے۔ نہ مرتی ہے نہ تجوری کی چابیاں دیتی ہے۔ دو سال سے انتظار کرتے کرتے

وہ اس قدر بیزار ہو گیا تھا کہ اب بھی اگر وہ نہ مرتی تو وہ خود گھبرا کر مرجاتا۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ دو دن کے اندر اندر اسے ختم کر دیا جائے۔ ایک دن تو سودے بازی میں گزر گیا تھا۔ دوسری صبح میں اس نوجوان لڑکے کا دوست بن کر اس لڑکے کی کوٹھی میں گیا تاکہ شکار کھیلنے سے پہلے اچھی طرح کمین گاہ کا جائزہ لے لوں۔

وہ کوٹھی چار بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھی۔ ڈرائنگ روم کے دائیں طرف بیڈ روم میں وہ بیمار عورت بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پندرہ منٹ تک اس عورت سے باتیں کیں۔ اسے دلاسے دیتا رہا کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اسے بیماری سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ باتوں کے دوران میری نگاہیں بیڈ روم کا جائزہ لیتی رہیں۔ وہاں کھڑکیوں میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں داخل ہونے کے لئے ایک اگلا دروازہ تھا۔ دوسرا پچھلا دروازہ' دوسرے بیڈ روم میں جا کر کھلتا تھا۔ وہ لیٹر بہت چھوٹا تھا۔ وہاں بھی لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔

اب آپ ہی سوچئے' وہاں دیکھنے کے لئے کیا رہ گیا تھا۔ گھر میں ماں بیٹے کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔ بیٹا ہمارا رازدار تھا۔ بیمار عورت اٹھنے بیٹھنے اور جدوجہد کرنے کے قابل نہیں تھی۔ میرے کسی دوست یا دشمن کو علم بھی نہیں تھا کہ میں سولہ ہزار کا قتل بھگتانے جا رہا ہوں۔ ایسی صورت میں مجھ سے زیادہ مطمئن کون ہو سکتا تھا۔

میں رات کے نو بجے کمرے سے نکلا۔ سب سے پہلے للی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی اور تکئے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ یعنی ماں سے پھر ایک بار لڑائی ہوئی تھی۔ میں اسے دلاسہ دینا چاہتا تھا کہ اب اس کے رونے کے دن ختم ہو رہے ہیں۔ میری مٹھی میں سولہ ہزار آ چکے ہیں۔ کل ہی میرے ڈیڈی اس کی ممی سے کہیں گے کہ وہ ہماری شادی کی تاریخ مقرر کر دیں۔ مگر یہ بات کہنے سے پہلے میں شائستہ کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی دیر تک روتی رہی ہے۔ مگر کہیں جانے کے لئے اپنے روتے ہوئے چہرے پر مسکراتے ہوئے میک اپ کی تہیں جما رہی تھی۔ میں ڈیڈی کے کمرے میں گیا تو انہوں نے بتایا۔

"میں شائستہ کے ساتھ کلب جا رہا ہوں' وہیں موقع پا کر میں اس سے باتیں کروں گا کہ ہم نے اچھی خاصی رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ آج وہ بہت ہی مردہ مردہ سی نظر آ رہی ہے۔ اسے اپنی شکست کا یقین ہو گیا ہے۔ تم جاؤ اور سنبھل کر اپنا کام نمٹاؤ۔ باقی میں سمجھ لوں گا۔"

ایک گھنٹہ بعد جب وہ شائستہ کے ساتھ چلے گئے تو میں للی کے پاس آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ میں نے اسے خوشخبری سنائی کہ میں نے اچھی خاصی رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ یہ سن کر اس نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ روتی ہوئی کہنے لگی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ممی کو دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مر گئی ہوں۔ صرف ایک لاش کی طرح حرکت کر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی مردہ باہیں پھیلا کر مجھے اپنے پاس بلایا۔ مردہ سی آواز میں کہنے لگیں بیٹی ایک بار سینے سے لگ جاؤ۔ دیکھو میں تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے مرتی جا رہی ہوں۔ میں گھبرا کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ ایک بار ان کے سینے سے لگوں گی تو وہ مجھے تم سے چھین لیں گی۔"

میں نے اسے چوم کر کہا۔

"اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ تم اپنے دل سے سارا خوف نکال دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کل ہی ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔"

رات کے گیارہ بجے تک میں اس سے پیار و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ پھر کوٹھی سے باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور کالے خان کے شراب خانے میں پہنچ گیا۔ میں ولایتی پینے کا عادی ہوں لیکن ایسے وقت ٹھرا پیتا ہوں اور ایک آدھے سے زیادہ نہیں پیتا تاکہ بدن میں مستی اور چستی رہے۔ آدھے سے زیادہ پینے سے کام خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ وار ایک طرف کرو تو نشانہ دوسری طرف بیٹھتا ہے۔

ایک بجے شراب خانے سے نکل کر میں بھٹی چوک آیا۔ وہاں ایک پان کی دکان سے ڈبل شہزادی پان لے کر کھایا پھر ایک سگریٹ سلگا کر پیدل ہی چل پڑا۔ ایک جگہ دیوار پر فلم قاتل حسینہ کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ پوسٹر میں ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ریوالور پکڑے نظر آ رہی تھی اور دور ایک مرد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے وہ پوسٹر دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ بھلا کمزور عورتیں ریوالور کیا چلائیں گی۔ ہم جیسے قاتلوں کو دیکھ کر ہی ان کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ جائے گا لیکن یہ فلم والے خواہ مخواہ عورت کو سپر ویمن بنا دیتے ہیں۔

میں نے اس پوسٹر پر پان کی پیک تھوک کر حقارت سے "اونہہ" کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد میرا بھی کسی ایسی عورت سے سابقہ پڑے گا۔ جیسے کہ پوسٹر میں دکھائی گئی تھی............ جی نہیں' آپ یہ نہ سمجھیں کہ جسے میں نے قتل کیا تھا اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ دراصل تصویر میں عورت کے ساتھ ریوالور دکھانے کا مطلب یہ تھا کہ عورت بھرے ہوئے پستول کی طرح خطرناک ہوتی ہے۔ ہاتھ لگاتے ہی

ٹھائیں سی بولتی ہے۔ وہ کب جوابی حملہ کرے گی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگر مجھے پہلے سے پتہ ہوتا تو میں یہاں نظر نہ آتا۔

میں آہستہ آہستہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ کوٹھی ابھی تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی اور ابھی مجھے ایک گھنٹہ ضائع کرنا تھا کیونکہ اس بیمار عورت کے لڑکے سے میں نے کہہ دیا تھا کہ دو بجے کے بعد کوٹھی کا بیرونی گیٹ اور بیڈ روم کا دروازہ کھلا رہنا چاہئے۔ جب میں وہاں پہنچا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ نوجوان میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے ساتھ کوٹھی کے چاروں طرف ایک چکر لگایا۔ زرد چاند کی روشنی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری کوٹھیاں اتنے فاصلے پر تھیں کہ کام بگڑنے پر ان کوٹھیوں کے مکین شور و غل سن کر اتنی تیزی سے نہیں آ سکتے تھے جتنی تیزی سے میں فرار ہو سکتا تھا۔

میں باہر سے مطمئن ہو کر اندر آ گیا۔ نوجوان ننگے پاؤں تھا اور میرے پاؤں میں کریپ سول کے جوتے تھے۔ پھر بھی میں دبے قدموں سے برآمدے کے فرش پر چل رہا تھا۔ نوجوان بیڈ روم کے دروازے پر رک گیا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا کھول کر آہٹ لی۔ کمرے کے اندر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی ہر چیز نیند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زیرو پاور کی دم توڑتی ہوئی نیلی روشنی میں وہ بستر پر نظر آ رہی تھی ایک سفید چادر اس پر ایسی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھی کہ سر سے لے کر آدھے جسم تک اسے چھپا رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ سرہانے رکھا ہوا تھا جس کا ایک حصہ سیلنگ فین کی تیز ہوا سے اڑ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔

اچانک ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ دوپٹے کی شرارت سے اس کی آنکھ کھل سکتی تھی۔ کمبخت اڑتا ہوا اس کے چہرے پر یوں چھا گیا تھا کہ نتھنوں میں سرسراہٹ ہوتے ہی وہ چھینک کر اٹھ بیٹھتی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا پلنگ کے قریب آیا۔ چاقو کا کلپ دبا کر اسے ایک جھٹکے سے کھولا۔ بائیں ہاتھ سے اس کے منہ کو سختی سے دبایا پھر اتنی پھرتی سے چاقو کو اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔

وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی اور میں بری طرح بوکھلا گیا۔ تڑپنے کا انداز بتا رہا تھا کہ میرا شکار بیمار نہیں ہے۔ میں دوڑتا ہوا سوئچ بورڈ کی طرف گیا۔ زیرو پاور کی روشنی نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ میں نے دوسرا بلب روشن کیا۔ سوئچ بورڈ کے ساتھ ہی دوسرے کمرے کی کھڑکی تھی۔ روشنی ہوتے ہی دوسرے کمرے کے منظر نے مجھے اور بھی بدحواس کر دیا۔ وہاں میرے ڈیڈی اوندھے پلنگ پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے چھوٹی سی میز پر

وہسکی کی بوتل اور شراب کا جام رکھا ہوا تھا۔ میز کے نیچے شائستہ کی سینڈل پڑی ہوئی تھی۔ میز کے دوسری طرف پلنگ پر ڈیڈی کے دیدے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی باچھوں سے خون رس رہا تھا۔

آں۔ ہاں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میرے ڈیڈی کو کس نے ہلاک کیا؟ ذرا ٹھہریئے مجھے پسینہ پونچھنے دیجئے............

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے ڈیڈی کو شائستہ نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ وہ کلب جانے کی بجائے میرے ڈیڈی کو اس مکان میں لے آئی تھی۔ ان کی آغوش میں اداؤں کے جال بچھائے تھے اور انہوں نے شراب کے دھوکے میں شائستہ کے ہاتھوں سے زہر پی لیا تھا۔

میں وہاں سے فرار نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے کہ میں وہاں سے بھاگتا مجھے برآمدے میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ نوجوان دروازے کو باہر سے لاک کر کے پولیس والوں کو اطلاع دینے جا رہا تھا۔ وینٹی لیٹر اور کھڑکیوں میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ دونوں دروازے باہر سے مقفل تھے اور میں چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔

بعد میں یہ نوجوان جیل میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس سے شائستہ للی کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ شائستہ نے اپنے ہونے والے داماد سے کہا تھا کہ وہ مجھے کسی طرح قاتل ثابت کرے تاکہ للی کی آنکھ کھلے۔ اس مقصد کے لئے خود شائستہ نے منصوبہ بنایا تھا۔ پھر اس نوجوان نے حمدو کو الگ سے دس ہزار روپے دیئے کہ وہ اس کی نقلی ماں کے قتل کے بزنس کو مجھ تک پہنچا دے۔ میں سوچ میں بھی نہیں سکتا تھا کہ حمدو دس ہزار کے لالچ میں مجھ سے دھوکہ کرے گا۔ وہ دوسرے قاتلوں کے پاس نہیں گیا تھا۔ محض باتیں بنائی تھیں۔ سیدھا میرے پاس آکر مجھے پھانس لیا تھا۔

ہاں آپ کہہ رہے تھے کہ اتنی زبردست سازش کرنے والی شائستہ کو بھی سزا ملنی چاہئے۔

مگر وہ تو بہت پہلے ہی اپنی بیٹی کی زبان سے موت کی سزا پا چکی تھی۔ بیٹی نے اسے بہت رلایا تھا۔ ماں نے آنسو بہائے بیٹی کی آنکھ نہ کھلی۔ ماں نے دودھ کا واسطہ دیا بیٹی کی جوانی دودھ کا چٹخارہ بھول گئی۔ اس دودھ کی زبان سے موت کی سزا سنا دی۔ وہ اسی رات خواب آور گولیاں کھا کر مر جانا چاہتی تھی۔ مگر ڈوبنے سے پہلے ہم سب کو ڈبونا چاہتی تھی۔ میرے ڈیڈی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ انہیں مار کر خود سزا سے نہیں بچ سکتی تھی۔ اسی لئے وہ میرے خنجر کی زد پر آ گئی۔ دم توڑتے وقت اس کی آنکھیں کہہ رہی

تھیں۔ "ارے اب تو اپنا لہو اچھال دیا ہے اب تو بیٹی کو قاتل کا چہرہ نظر آجائے گا۔"

وہ نوجوان میرے پاس آکر قسمیں کھاتا رہا کہ اسے شائستہ کے اس منصوبے کا علم نہیں تھا کہ وہ خود ہی زندگی سے بیزار ہو گئی ہے۔ وہ چاہتی تو بیٹی کی آنکھیں کھولنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتی تھی۔ مگر شاید اب وہ ایک خود غرض بیٹی کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ عورت اونٹ کی ذات ہوتی ہے۔ کس کروٹ بیٹھے گے' یہ پہلے سے پتہ نہیں چلتا .... اب پتہ چل گیا ہے .... ٹھہریئے' پہلے مجھے پسینہ پونچھنے دیجئے..........۔

☆------☆------☆

تگڈم

میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی مرد اپنی عورت کے قریب کسی مرد کا سایہ بھی برداشت نہیں کرتا۔
ایک ایسے مرد کی کہانی جس کی ازدواجی زندگی میں ایک جن شریک بن گیا تھا۔
وہ آدھی اس کی بیوی تھی اور آدھی جن کی محبوبہ۔

بستی میں ایک پیر صاحب آئے تھے۔ بڑے زود اثر تعویذات دے رہے تھے رمضانی کی بیوی چھ سال سے بانجھ تھی۔ پیر صاحب کا تعویذ گلے میں ڈالتے ہی ایک ہفتے کے بعد اس کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں چھیدی میاں کی گائے بھی بچہ دینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں تعویذ گائے نے پہنا تھا یا چھیدی میاں نے برکت علی نے یہ کرامات دیکھے تو اک دم سے پیر صاحب کا عقیدت مند بن کر ان کے قدموں میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے پہلا سوال کیا۔

"بابا آپ کے دربار سے دوسری آرزوئیں بھی پوری ہوتی ہیں یا آپ صرف بچے ہی دیتے ہیں؟"

بابا صاحب نے لال پیلی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"کمبخت کیا بکتا ہے۔ تعویذ کی کرامات سے بچے ہوتے ہیں تجھے کتنے چاہئیں؟"

"بابا ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔ آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں کہ جس کے اثر سے میری دکانداری چمک جائے۔ میرا نام برکت علی ہے مگر میرے کاروبار میں برکت نہیں ہے۔ میری ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔"

بابا نے پھر غصہ سے کہا۔

"کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے جب ماں بچپن ہی میں مر گئی تو تُو کیسے پیدا ہوا؟"

"میرا مطلب ہے جب میں بچہ تھا اس وقت میری ماں مر گئی تھی۔ ساری بستی والے کہتے ہیں کہ میں احمق ہوں' مجھے سلیقہ سے گفتگو کرنی نہیں آتی۔ جب میرا باپ زندہ تھا تو کاروبار خوب چلتا تھا مگر اس کے مرنے کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ میری حماقت سے دکانداری تباہ ہو گئی۔ دراصل میں احمق نہیں ہوں۔ دوسروں پر ترس کھانے والا ایک شریف آدمی ہوں۔ لوگوں پر ترس کھا کر ادھار دیتا تھا پھر ادھار دی ہوئی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ اس طرح میری دکان بالکل خالی ہو گئی۔ یہی حال رہا تو میں کچھ عرصے کے بعد فاقے کرنے لگوں گا۔ خدا کے لئے مجھے بچائیے' کوئی ایسا تعویذ دیجئے کہ میرے نصیب کا ستارہ گردش سے نکل آئے۔"

بابا صاحب کے منہ سے ایک لمبی "ہوں" نکلی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"تیرا ستارہ واقعی بڑی گردش میں ہے۔ تجھے اتنا ہی بڑا تعویذ دینا ہو گا۔ جا ابھی جا کر ایک طرف بیٹھ جا۔ میں دوسروں کے دکھ دور کرنے کے بعد تجھ سے بات کروں گا۔"

برکت علی مؤدبانہ انداز میں اٹھ کر الٹے قدموں چلتا ہوا کٹیا کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ماری پور کا ایک جاگیردار آیا اس نے آتے ہی شکایت کی۔

"بابا جی آپ نے کیسا تعویذ دیا تھا۔ اس کا اثر الٹا ہوا ہے۔ زمین کے مقدمے میں میرا بھائی جیت گیا ہے اور میں ہار گیا ہوں۔ کیا آپ نے مات کھانے والا تعویذ دیا تھا؟"

"بکواس مت کر۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اپنے مکان اور اپنے بھائی کے مکان کے درمیان اس تعویذ کو گاڑ دینا۔ وہ تعویذ دونوں کے درمیان برابر فاصلے پر ہو۔ کیا تُو نے ایسا کیا تھا؟"

"جی ہاں' میں نے ایسا کیا تھا لیکن میرے اور میرے دشمن بھائی کے مکان کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پانچ میل سے دو چار انچ زیادہ بھی ہو سکتا یا دو چار انچ کم بھی ہو سکتا ہے۔ بالکل صحیح حساب کون کر سکتا ہے؟"

بابا صاحب نے بڑی رعونت سے کہا۔

"صحیح حساب نہ کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ اگر بھائی نے مقدمہ جیت لیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تعویذ گاڑتے وقت تُو دو چار انچ بھائی کی زمین کی طرف چلا گیا تھا اسی لئے تعویذ نے تیرے بھائی پر اثر کیا ہے۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا چلا جا یہاں سے۔"

جاگیردار زیر لب بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد اور کئی طلبگار وہاں آتے رہے کچھ لوگ خوش ہو کر بابا صاحب کو نذرانے پیش کرتے رہے۔ کیونکہ ان کا کام بن گیا تھا۔ کچھ لوگ شکایتیں کرنے کے بعد منہ بنا کر وہاں سے چلے گئے۔ آخر میں ایک جوان عورت رہ گئی۔ اس نے کہا۔

"بابا جی! میں ماں بننے کے لئے آپ کے پاس سے تعویذ لے کر گئی تھی۔ کیونکہ میری سوکن بچے پر بچے دیئے جا رہی ہے اور میں نے ایک بھی جائیداد کا وارث پیدا نہیں کیا۔ میرا شوہر مجھے طعنے دیتا ہے اور ہمیشہ میری سوکن کی دلجوئی کرتا رہتا ہے۔"

بابا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہم سب جانتے ہیں۔ آگے بول کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ میں ماں بننے کے لئے تعویذ لے گئی تھی مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ میری سوکن پھر بچہ دینے والی ہے۔"

"تُو نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا؟"

"آپ کے ایک ایک حکم پر عمل کیا تھا۔ آپ نے تعویذ سرہانے رکھنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے اپنے سرہانے رکھ لیا تھا۔"

"اپنے سرہانے؟" بابا نے چیخ کر کہا۔ "تمہارے دماغ میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ اپنے سرہانے رکھو۔"

"پھر؟" اس عورت نے بوکھلا کر پوچھا۔

"پھر کیا پوچھتی ہے؟ بچہ تعویذ سے ہو گا یا تیرے شوہر سے ہو گا؟"

"ش.......... ش.......... شوہر سے.......... بلکہ دونوں سے۔"

"تو پھر دونوں کو ایک جگہ ہونا چاہئے۔ وہ تعویذ تیرے شوہر کے سرہانے ہوتا تو وہ اس پر اثر کرتا۔ پھر تیرا شوہر تجھ پر اپنا اثر دکھاتا مگر اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب ہدیہ نکال میں دوسرا تعویذ دوں گا۔"

اس عورت نے اپنے آنچل سے پانچ روپے کھول کر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیئے۔ بابا صاحب نے دوسرا تعویذ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اب اچھی طرح سمجھ گئی ہے نا؟ تعویذ تیرے شوہر کے سرہانے ہو گا۔ پھر تیرا شوہر تیرے سرہانے آجائے گا۔ اب جا یہاں سے۔"

وہ عورت وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ کٹیا خالی ہوتے ہی برکت علی پھر بابا کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ بابا نے کہا۔

"ابھی تیرے سامنے کتنے ہی لوگ آئے اور چلے گئے۔ اتنی دیر میں تُو نے یہاں رہ کر کیا سیکھا؟"

"یہی کہ تعویذ کا اثر الٹا بھی ہو سکتا ہے۔"

"تُو سچ مچ احمق ہے۔ تعویذ کا اثر الٹا نہیں ہو سکتا بلکہ تم لوگوں کی کھوپڑی الٹ جاتی ہے۔ اگر تُو نے بھی میری ہدایات پر پوری طرح عمل نہ کیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو گی۔"

"بابا صاحب! میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

بابا صاحب آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر کے لئے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کے دیدے سرخ انگارہ ہو رہے تھے۔

"میرا علم کہتا ہے کہ تیری تقدیر اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ اسے روشنی میں لانے کے لئے تجھے چلہ کاٹنا ہو گا۔ یہ ہم انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا جنات ہی یہ مشکل آسان کر سکتے ہیں۔ کیا تُو چالیس راتوں تک عمل پڑھ سکتا ہے؟"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح میرے دن پھر جائیں۔"

"تُو بھی پھر جائے گا' تیرے دن بھی پھر جائیں گے۔ مگر تجھے پڑھنے کے لئے جو بھی وظیفہ بتایا جائے اس میں ذرا بھی غلطی نہ ہو۔"

"غلطی نہیں ہو گی۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں نے مدرسے میں کبھی مولوی صاحب سے مار نہیں کھائی۔ سنا ہے کہ وظیفے کے دوران غلطی ہو جائے تو جنات طمانچے مارتے ہیں۔"

"ہاں بڑے زور سے مارتے ہیں۔ اگر طمانچے کھانے کے بعد چلہ کاٹنے والا ڈر جائے تو پھر اس کی کھوپڑی الٹ جاتی ہے اور وہ پاگل ہو جاتا ہے اور اگر سنبھل جائے اور پھر صحیح طریقے سے پڑھنے لگے تو جنات اسے معاف کر دیتے ہیں۔"

"میں بہت نڈر ہوں۔ بچپن سے اپنے باپ کے لات جوتے کھاتا آیا ہوں۔ جنات کے دو چار طمانچے مجھے نہیں ڈرا سکیں گے۔"

"تو پھر نکال ایک سو بیس روپے۔"

"ایک سو بیس روپے؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ "ریٹ کچھ زیادہ ہے۔"

"تیری مصیبتیں بھی زیادہ ہیں۔ اگر پیسے کا منہ دیکھے گا تو خوش نصیبی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔ میں کسی سے کبھی زیادہ پیسے نہیں لیتا۔ تُو نے دیکھا ہے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ صرف پانچ روپے دیتے ہیں۔ پانچ روپے کے حساب سے جوڑ لے کہ چالیس راتوں کے ایک سو بیس روپے ہوتے ہیں یا نہیں؟"

برکت نے قائل ہو کر اپنا سر ہلایا۔ اس کی جیب میں ڈیڑھ سو روپے تھے۔ وہ شہر جا کر اپنی دکان کے لئے سودا لانا چاہتا تھا تاکہ اِکا دُکا گاہک اس کی دکان سے واپس نہ جائیں لیکن اب وہ واپس جانے والے گاہکوں کے بجائے اپنی روٹھی ہوئی تقدیر کو واپس بلانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک سو بیس روپے گن کر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیئے۔ بابا صاحب نے کہا۔

"اب اچھی طرح سن لے جس جگہ چلہ کشی کرے گا وہاں کسی دوسرے کا گزر نہ ہو۔"

"نہیں ہو گا۔ میں چالیس دن کے لئے اپنی دکان بند کر دوں گا اور اسی دکان کے

فرش پر بیٹھ کر عمل کروں گا۔"

"آج سے تُو ہمیشہ پاک صاف اور باوضو رہے گا اور کسی جوان عورت کو بُری نظر سے نہیں دیکھے گا۔"

"آں........." باباصاحب کی بات سن کر وہ ہچکچانے لگا۔

"کیابات ہے۔ کیاتیری نیت میں کھوٹ ہے؟"

"نن .... نہیں اسے نہیں دیکھتا ہوں۔ مگر وہ دن میں ایک آدھ بار نظر آ جاتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"زلیخا......... وہ میرے مکان کے پیچھے رہتی ہے۔ میرے اور اس کے آنگن کے بیچ میں ایک چھوٹی سی دیوار ہے۔ دیوار میں کئی جگہ شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی شگاف سے نظر آ جاتی ہے۔"

"تمام شگافوں کو بند کردے۔"

"بند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی آواز جو سنائی دیتی ہے۔ میں کیا بتاؤں اس کی آواز میں اتنا رس ہے کہ رس ملائی میں بھی نہ ہوگا۔ اس کی آواز کانوں میں آتے ہی نگاہوں کے سامنے اس کی پوری تصویر بن جاتی ہے۔ مگر میری نیت بُری نہیں ہے۔ پر کیا کروں' وہ اتنی خوبصورت ہے کہ میں دکان کے پچھلے دروازے سے آنگن میں نکل کر پہنچتا ہوں تو میری نظریں آپ ہی آپ دیوار کی طرف بھٹک جاتی ہیں۔ وہ دیوار کے اس طرف ہو یا نہ ہو مگر خیالوں میں اک دم سے مجسم ہو جاتی ہے۔"

"یہ تو بہت بُری بیماری ہے۔"

"مگر باباجی میں نے اس کے بارے میں کبھی ایسی ویسی بات نہیں سوچی۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میری نیت بالکل صاف رہے گی۔ صرف دیکھ لینے سے تو کچھ نہیں ہوتا نا۔"

"دیکھ لینے ہی سے تو سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر انسان اندھا ہو جائے تو دعوتِ گناہ دینے والے بہت سے نظاروں سے بچ سکتا ہے۔ بہرحال میری نصیحت ہے کہ ہمیشہ اپنی نیت صاف رکھنے کی کوشش کرنا۔ ورنہ چلہ کشی کا اثر الٹا ہوگا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔"

پھر باباصاحب اسے وہ عمل بتانے لگے جو چالیس راتوں تک اسے پڑھنا تھا اور یہ بھی بتاتے رہے کہ جیسے جیسے راتیں گزرتی جائیں گی ویسے ہی ویسے عجیب و غریب قسم کے

واقعات رونما ہوتے جائیں گے۔ برکت ان کی باتیں سنتا رہا اور سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا۔

جب وہ اپنے محلے میں واپس آیا تو شیرو بدمعاش کے اڈے پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک تھانیدار بھی وہاں موجود تھا۔ زلیخا کا بوڑھا باپ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"یہ چور بدمعاش شریفوں کے محلے میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ میری بیٹی کو دیکھ کر چھیڑتا ہے۔ میں اسے گھر کی چاردیواری میں چھپا کر رکھتا ہوں تو یہ آوازیں کستا ہے۔"

تھانیدار نے اس کی باتیں سن کر کہا۔

"شیرو .... تُو نے ہم پولیس والوں کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ تجھے ہزار بار سمجھایا ہے کہ میرے علاقہ میں رہنا ہے تو بدمعاشی چھوڑ دے۔"

"بدمعاشی کیسے چھوڑوں؟ میں شریف آدمی بننے کے لئے زلیخا کا رشتہ مانگتا ہوں تو اس کا باپ ایسے گالیاں دیتا ہے جیسے میں انسان نہیں ہوں۔"

تھانیدار نے کہا۔

"یہ لڑکی والوں کی مرضی ہے' وہ رشتہ دیں یا نہ دیں۔ تُو زبردستی کرنے والا کون ہوتا ہے؟"

"میں تو زلیخا کی بھلائی کے لئے زبردستی کرتا ہوں۔ محلے کی عورتوں سے پوچھ لو کہ زلیخا کی عمر کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ تھانیدار صاحب آپ نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ جوانی ہے کہ پھٹی پڑ رہی ہے۔ آپ دیکھیں گے تو آپ کی نگاہیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

"ابے کیا بکتا ہے۔" تھانیدار نے گھنی مونچھوں کے زیر سایہ کچھ مسکراتے اور کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔ زلیخا کے ماں باپ اور محلے کی دوسری عورتیں شیرو کی زبان سے ایسی باتیں سن کر اسے گالیاں دینے لگیں۔ تھانیدار نے شیرو کے سر پر ایک چپت جماتے ہوئے کہا۔

"سالا بدمعاش ہے۔ بدمعاش ہی رہے گا۔ چل تجھے حوالات میں لے جا کر ڈنڈے جماؤں گا تو تجھے شریفوں کی عزت کرنی آ جائے گی۔"

تھانیدار نے اس کا گریبان پکڑ کر اٹھا دیا۔ شیرو کے حواری اور چمچے تھانیدار کی منتیں کرنے لگے کہ وہ شیرو استاد کو تھانے نہ لے جائے۔ مگر محلہ والوں کی مخالفت بھاری پڑی تھی۔ تھانیدار زلیخا کے باپ کو یہ کہہ کر شیرو کو تھانے لے گیا کہ اس کی بیٹی جوان ہو

گئی ہے تو وہ فوراً ہی اس کی شادی کی فکر کرے۔

برکت دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ بابا صاحب کے پاس سے آتے وقت سوچتا آ رہا تھا کہ چلہ کشی کے دوران زلیخا کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔ مگر اس واقعہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے زلیخا کے سراپا کو اور زیادہ واضح کر دیا۔

وہ سر جھکا کر اپنی دکان کے دروازے پر آیا۔ اس کے مکان اور دکان کا دروازہ ایک ہی تھا۔ دکان کے ساتھ آنگن میں اس کے سونے بیٹھنے کے لئے ایک کمرہ تھا۔ مشرق کی طرف صدیوں پرانے کسی قلعہ کی اونچی دیوار تھی جس کے سائے میں برکت کی طرح بہت سے لوگوں نے مکانات بنائے تھے۔ اس دیوار پر چڑھ کر زلیخا کو بھی اس کے آنگن میں بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

دکان میں پہنچ کر پوری دکان اور مکان کے فرش کو پانی سے دھو کر صاف کرنے لگا کیونکہ آج رات سے اسے چلہ شروع کرنا تھا۔ مگر صفائی کرنے کے دوران بھی وہ شیرو بدمعاش کو دل ہی دل میں بُرا کہہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ زلیخا کو غلیظ نظروں سے دیکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ شیرو بدمعاش کے متعلق کم اور زلیخا کے بارے میں زیادہ سوچ رہا ہے۔ اس نے جھلا کر زیر لب کہا۔

"پتہ نہیں یہ کمبخت عورتیں دنیا میں پیدا کیوں ہوتی ہیں۔ اگر عورت نہ ہوتی تو شیرو بدمعاشی کیسے کرتا۔ وہ بیچارہ حوالات میں نہ جاتا اور میں بیچارہ زلیخا کے خیال سے خالی ہو کر چلہ کشی میں مصروف ہو جاتا۔ مگر اب میں قسم کھاتا ہوں کہ زلیخا کے خیال کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دوں گا۔ وہ سالی ہے کیا چیز۔ گوشت پوست کی ایک عورت ہے۔ جیسی دوسری عورتیں ہوتی ہیں۔ ساری دنیا کی عورتوں پر لعنت ہے۔"

اس نے دل کی گہرائیوں سے لعنت بھیجی۔ پھر اسی رات سے چلہ پر بیٹھ گیا۔ شام ہی کو اس نے تمام محلے اور پڑوس والوں کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دکان چالیس دن تک بند رہے گی اور وہ راتوں کو عبادت میں مصروف رہے گا۔ لہٰذا کوئی اس کے دروازے پر دستک نہ دے اور نہ ہی اسے آواز دے۔ محلے والوں کو یہ سمجھانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ہر رات نماز عشاء کے بعد دکان کے فرش پر پالتھی مار کر بیٹھ جاتا تھا اور بابا صاحب کے بتائے ہوئے عمل کو بلند آواز سے پڑھتا رہتا۔

دو چار راتوں تک جب رات کے سناٹے میں اس کی آواز گونجنے لگی تو تمام محلے والے اس سے مرعوب ہو گئے۔ وہ راتوں کو جاگنے کے بعد دن کے گیارہ بجے تک سوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد کبھی کسی کام سے باہر نکلتا تو محلے کے لوگ اسے بڑی عقیدت سے

اور ذرا سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگتے۔ وہ سہم کر اسے دیکھتے تھے کہ برکت جنات کو قابو میں کرنے کے لئے چلہ کشی کر رہا تھا۔ محلے میں کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو اس کی ماں بچے کو برکت کے پاس لے کر آتی تھی تاکہ وہ اپنی زبان مبارک سے کچھ پڑھ کر پھونک دے۔ وہ تو ہمیشہ ہی زیر لب کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا تھا۔ بیماری سے شفا دینے والا صرف خدا ہے وہ کسی نہ کسی بہانے شفا دیتا ہے۔ برکت کا کچھ پڑھ کر پھونکنا بھی شفایابی کا ایک بہانہ بن جاتا۔ اس کے پھونکنے کے بعد کچھ بچے تو اس دنیا سے اٹھ گئے۔ جو باقی بچے ان کے ذریعے شہرت ہو گئی کہ برکت اللہ والا ہے۔

پانچ راتیں خیریت سے گزر گئیں۔ نماز عشاء کے بعد سے نماز فجر تک پڑھنے کے دوران کسی نے مداخلت نہیں کی۔ تھانیدار شیرو کو ایک دن کے لئے حوالات میں بند کرنے کے لئے لے گیا تھا لیکن پانچ دنوں تک اسے سرکاری مہمان بنائے رکھا۔ کیونکہ پچھلے ایک ماہ سے شیرو نے اپنی آمدنی میں سے تھانیدار کا حصہ نہیں نکالا تھا۔ بعد میں شاید کچھ معاملات طے ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ پانچویں دن چھوٹ کر آ گیا۔ زلیخا کے سلسلہ میں شیرو پہلے جیسا دلیر نہیں رہا تھا لیکن راتوں کو چھپ چھپ کر اس کی دیوار کے سائے میں آ کر ہولے ہولے عشقیہ گیت گنگناتا تھا۔ چور بدمعاشوں کے گلے میں رس کہاں ہوتا ہے۔ اس کی آواز ایسی بے ڈھنگی ہوتی تھی کہ برکت چلہ کشی کے دوران گڑبڑا جاتا۔ اگر وہ چلہ کشی میں مصروف نہ ہوتا تو خود ہی شیرو کے سامنے گنگنا کر اسے بتا دیتا کہ زلیخا جیسی طرح دار معشوقہ کو متوجہ کرنے کے لئے آواز میں کتنا لوچ اور کتنا درد ہونا چاہئے۔ بس اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں وہ سوچتا رہتا تھا۔ زبان پڑھنے میں مصروف ہوتی اور خیالات آنگن کی دیوار کے اس پار اڑتے رہتے تھے۔

دوسرے دن اس نے شیرو کے اڈے پر پہنچ کر اسے سمجھایا کہ وہ راتوں کو اس کی دیوار کے سائے میں آ کر زلیخا کے لئے عشقیہ گیت گنگنانا چھوڑ دے۔ شیرو نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"ارے برکت سنا ہے تو جنات کو قابو میں کرنے کے لئے چلہ کاٹ رہا ہے۔ بھئی دو چار جنات کو میرے پاس بھی بھیج دینا۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ زلیخا کو اس کے گھر سے اٹھا کر میرے اڈے پر پہنچا دیں۔"

اس کی باتیں سن کر اس کے تمام ساتھی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ برکت دبلا پتلا سا آدمی تھا اور شیرو شیر کی طرح لمبا چوڑا تھا۔ لہٰذا وہ شیرو کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے دھمکی دی۔

"دیکھ شیرو! اپنی حرکتوں سے باز آ جا۔ میں تو تجھے اب کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر جنات یہ برداشت نہیں کریں گے کہ تُو میری دیوار کے سائے میں آ کر ایک شریف لڑکی کو چھیڑے یا کسی اور طرح کی بدمعاشی کرے۔"

شیرو نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ سنو............ یہ مولوی کا بچہ جنات کو میرے پیچھے لگائے گا............ ہاہاہا............"

اس کے حواری اور اس کے چمچے بھی ہنسنے لگے۔ برکت جھنجلا کر وہاں سے واپس آ گیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب ساری دنیا کو بھول کر وہ پورے انہماک سے وظیفہ پڑھتا رہے گا۔ جب جنات اس کے تابع فرمان ہو جائیں گے تو وہ شیرو سے انتقام لے گا۔

اس دن کے بعد اس کی ساری توجہ پڑھنے پر مرکوز ہو گئی۔ وہ بلند آواز سے پڑھتا تھا۔ پڑھنے کے دوران جب وہ "یا حق" کا نعرہ لگاتا تو اس کی آواز سے سارا محلّہ گونجنے لگتا۔ مکان کی چھت ٹین کی تھی اس لئے آواز اور زیادہ گونجتی تھی اور دیر تک خاموش فضاؤں میں لرزتی رہتی تھی۔ اس طرح لوگوں کے دلوں میں عجیب طرح کی دہشت طاری ہو جاتی تھی۔

تیس راتیں گزر جانے کے بعد چلہ کشی کچھ رنگ لانے لگی۔ اکتیسویں رات کے دو بجے جب وہ جھوم جھوم کر پڑھنے میں مصروف تھا اسی وقت ٹین کی چھت لرزنے لگی۔ برکت ایک ساعت کے لئے ٹھٹک گیا لیکن اس کا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ اور زیادہ جوش و خروش سے پڑھنے لگا۔ بابا صاحب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ رفتہ رفتہ ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔

پھر دوسری رات کو ٹین کی چھت کے علاوہ بند دروازہ اور کھڑکیاں بھی لرزنے لگیں۔ اس نے پہلی بار ایک ہیبت ناک اجنبی سی آواز سنی۔

"یا حئی' یا حئی۔" وہ آواز اتنی کرخت تھی اور ایسی تیز تھی کہ خنجر کی طرح دل میں اترتی تھی اور سننے والوں کو حواس باختہ کر کے رکھ دیتی تھی۔ برکت آنکھیں بند کئے پڑھ رہا تھا۔ اس ہیبت ناک آواز سے ذرا سا سہم گیا۔ اسی وقت چٹاخ سے اس کے منہ پر ایک طمانچہ پڑا۔ وہ فرش پر الٹ گیا۔ بابا صاحب کی ہدایت اسے اچھی طرح یاد تھی۔ طمانچہ کھانے کے باوجود اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ وہ فوراً ہی پلتھی مار کر بیٹھ گیا اور زور زور سے پڑھنے لگا۔ اس حوصلے نے اس کی جان بچالی کیونکہ اب "یا حئی" کی آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ہولے ہولے کانپ رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے صبح تک پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

دوسرے دن محلے کے کتنے ہی لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے آدھی رات کے بعد برکت کے مکان سے عجیب آوازیں سنی تھیں۔ اس کے مکان کی چھت لرز رہی تھی اور کوئی جیسے دروازے اور کھڑکیوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس واقعہ سے عورتیں سہمی ہوئی تھیں۔ بچوں نے برکت کی دکان کے پاس سے گزرنا چھوڑ دیا تھا اور محلّے کے مرد بھی برکت کو اس طرح مرعوب ہو کر دیکھتے تھے جیسے جنات کی بجائے وہی لوگ اس کے محکوم بن گئے ہوں۔ شیرو نے سنا تو اس نے خم ٹھونک کر کہا۔

"وہ سالا فراڈ ہے............ 'یا حئی' خود ہی آواز بدل کر کہتا ہو گا۔ ٹین کی چھت ہلاتا ہو گا اور دروازے اور کھڑکیوں کو اپنے ہاتھوں سے جھنجھوڑتا ہو گا۔ ارے یہ سب محلے والوں کو ڈرانے کے لئے کر رہا ہے............"

محلے کے ایک بوڑھے نے کہا۔

"شیرو خدا کا خوف کر۔ کیا تُو جنات کے وجود پر یقین نہیں رکھتا ہے............؟"

"کیسا جن اور کیسا شیطان؟ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ میں کئی بار چوری کا مال چھپانے کے لئے آدھی رات کے بعد کتنے ہی قبرستانوں میں گیا ہوں وہاں بھی مجھے آج تک نہ کوئی بدروح نظر آئی نہ ہی کسی جن حضرت سے ملاقات ہوئی۔ اگر برکت سچا ہے تو آج رات میں خود ہی اس کے مکان کے پاس جا کر دیکھوں گا کہ آخر یہ تماشا کیا ہے؟"

وہ ڈینگیں مار رہا تھا۔ محلے والے ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اس روز برکت اپنے مکان سے باہر نہیں نکلا۔ پچھلی رات طمانچہ کھانے کے بعد اسے ہلکا سا بخار آ گیا تھا۔ اس لئے وہ شام تک بستر پر لیٹا آرام کرتا رہا۔ رات کو وہ مقررہ وقت پر پھر دکان میں آیا۔ فرش پر پلتھی مار کر آنکھیں بند کر لیں اور بلند آواز سے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر پھر اس دکان میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ ٹین کی چھت بولنے لگی۔ کھڑکیاں اور دروازے کھڑکنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی محلے والوں کے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھنے لگیں۔ جو لوگ سو رہے تھے وہ بھی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ سب نے ایک بار پھر "یا حئی" کی دلخراش آواز سنی۔ تھوڑی دیر بعد شیرو کی چیخ سنائی دی۔

"ہائے میں مر گیا۔ مجھے بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی چٹاخ چٹاخ کی آوازیں ابھریں۔ اس کے بعد ایک لمحہ کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کے بعد صرف برکت کی آواز ابھرتی رہی۔ وہ لہک لہک کر پڑھتا جا رہا تھا۔ محلے والوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ برکت کے مکان کے قریب جا کر شیرو کی خیریت معلوم کرتا۔ صبح نماز کے وقت ایک نمازی نے وہاں سے

گزرتے وقت شیرو کو دیکھا۔ پھر چیخ چیخ کر محلے والوں کو جمع کر لیا۔

محلے والوں نے آ کر دیکھا کہ برکت کے مکان کے مشرق کی طرف جو دیوار تھی وہ بہت اونچی تھی۔ اس کی اونچائی سے ایک مضبوط رسہ لٹک رہا تھا اور رسے کے نچلے سرے پر زمین کی طرف شیرو چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ اس کی باچھوں سے لہو رسنے کے بعد خشک ہو گیا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سہارے کے لئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مارے دہشت سے اس میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس کے حواری اور چمچے بھی اس وقت تک وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ سب اسے اٹھا کر اس کے اڈے پر لے گئے۔ کوئی اس کے سر پر پانی ڈالنے لگا۔ کوئی اسے جھنجھوڑ کر یقین دلانے لگا کہ اب اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بجا ہوئے تو وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے محلے والوں سے کہنے لگا۔

"میں نے انسان ہو کر جنات کو للکارا تھا۔ مجھے بڑے بول کی بہت بڑی سزا ملی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر واقعی جنات کا وجود ہے تو پھر میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ اس ارادے سے میں لمبا سا رسہ لے کر اس دیوار کے پاس گیا۔ دیوار کی اونچائی پر کمند ڈالنے کے بعد میں انتظار کرنے لگا۔ جب یا حئی کی آواز سنائی دی تو میں رسے کے سہارے دیوار پر چڑھنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری محنت بیکار نہیں جائے گی اگر کوئی جن نظر نہیں آئے گا تو دیوار پر چڑھ کر اور دوسری طرف جا کر کم از کم زلیخا کو ہی دیکھ لوں گا لیکن جیسے ہی میں دیوار کی بلندی پر پہنچا مجھے آنگن میں ایک قد آور سفید پوش نظر آیا۔ ستاروں کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے اتنی دور تھا کہ اس کا ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن آپ لوگ شاید یقین نہ کریں کہ اس کا ہاتھ اچانک تیزی سے لانبا ہوتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا میرے منہ پر تڑا تڑ دو طمانچے پڑے۔ رسہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں گہری پستی میں گرتا جا رہا ہوں۔ مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میں دھپ سے زمین پر گرا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔"

تمام لوگ سہمے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ کسی کی آنکھیں اور کسی کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ دوپہر کو جب برکت سو کر اٹھا تو شیرو اس کے دروازے پر گیا اور سر جھکا کر اس سے معافی مانگی۔ برکت نے فراخدلی سے اسے معاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بڑے بول کی سزا مل گئی ہے۔ اب کبھی رات کے وقت ادھر کا رخ نہ کرنا اور نہ ہی کبھی زلیخا کے بارے میں گندی باتیں کرنا۔ اب بھی اگر باز نہ آؤ گے تو خون

تھوک تھوک کر مر جاؤ گے۔"

شیرو توبہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ اس کے دل میں ایسی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ اس نے زلیخا کے دروازے کے سامنے سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ برکت مطمئن ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کا حوصلہ بھی بڑھ گیا کہ وہ اپنی چلہ کشی میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اب صرف دو راتیں رہ گئی تھیں۔ چالیسویں رات کو جنات اس کے مطیع اور فرمانبردار بننے والے تھے۔ اس رات سے پہلے جب وہ مغرب کی نماز کے بعد آنگن میں آیا تو دیوار کے شگاف سے وہ نظر آ گئی۔

اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا لیکن آنگن میں لالٹین کی روشنی تھی۔ وہ بیچ آنگن میں چٹائی بچھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ساڑھی کا آنچل اس کے شانے پر گرا ہوا تھا۔ بھرا بھرا زرخیز سینہ سانسوں کی رفتار سے قیامت کی طرح اٹھ رہا تھا اور گرم گرم آہوں کی طرح بیٹھ رہا تھا۔ گدرایا ہوا بدن ساڑھی اور بلاؤز میں اس طرح کسا ہوا تھا کہ جگہ جگہ سے ابھر کر بغاوت کر رہا تھا۔ اس نے کوئی تیز خوشبو لگا رکھی تھی۔ خوشبو کی لپٹیں دوسرے آنگن میں برکت کی سانسوں تک پہنچ رہی تھیں۔ چند لمحوں تک تو وہ سحر زدہ ہو کر سب کچھ بھول گیا۔ صرف اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر فوراً ہی اس نے لاحول پڑھ کر نظریں پھیر لیں اور سخت لہجے میں زلیخا کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ماسی! تو اپنی بیٹی کو سمجھاتی کیوں نہیں ہے؟ جوان لڑکیوں کو خوشبو لگا کر رات کے وقت آنگن میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ میں یہاں جناتی عمل میں مصروف رہتا ہوں۔ اگر تیری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو گی۔"

ماسی کے بڑبڑانے کی آواز آنے لگی۔ وہ زلیخا کو ڈانٹ رہی تھی اور اسے آنگن سے اٹھ کر کمرے میں جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تیز خوشبو کے بھبکے ختم ہو گئے۔ شاید زلیخا آنگن سے چلی گئی تھی۔ برکت مطمئن ہو کر اپنی دکان میں آ گیا۔ پھر حسب معمول فرش پر پالتھی مار کر آنکھیں بند کر لیں اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

دوسرے دن برکت بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ پچھلی رات اس نے پہلی بار آنکھیں کھول کر اپنے کمرے میں ایک سفید پوش کو دیکھا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک جیسے کفن میں لپٹا ہوا تھا اور اس کفن نما لباس سے یا حئی کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اب آج کی رات آخری رات تھی۔ آج رات شاید ایک سے زائد جنات نظر آنے والے تھے اور پوچھنے والے تھے کہ اس کی کیا خواہشات ہیں؟

جب وہ دوپہر کو گھر سے باہر نکلا تو اس نے شیرو کو دیکھا۔ وہ اپنے اڈے کے سامنے چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے برکت کو دیکھتے ہی اٹھ کر ادب سے سلام کیا اور اسے چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہہ کر خود ایک ادنیٰ ملازم کی طرح کھڑا ہو گیا۔ برکت نے پوچھا۔

"کیا حال ہے؟ شیرو! اب بھی چوری چکاری سے توبہ کی ہے یا نہیں؟"

شیرو نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔

"حضور آپ شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں پرانے تمام دھندے چھوڑ چکا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں ایک دکان کھول کر بیٹھ جاؤں۔ اللہ تعالیٰ میری نیت سے جو کچھ دے گا میں صبر و شکر سے گزارا کرلوں گا۔"

برکت سوچنے لگا۔ بعض لوگ ایک ہی ٹھوکر کھانے کے بعد کتنی جلدی سنبھل جاتے ہیں۔ ان کے دماغ سے غصہ اور غرور سب کچھ نکل جاتا ہے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ جنات میرے قابو میں آئیں گے تو میں شیرو سے انتقام لوں گا۔ مگر اب ایسے شخص سے کیا انتقام لیا جائے جو پہلے ہی راہ راست پر آگیا ہے۔ شیرو کہہ رہا تھا۔

"میں شہر جا کر کوئی کاروبار کروں گا۔ بڑی جگہ بڑا کاروبار ہوتا ہے اور بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ مگر اس بستی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں بچپن سے یہاں کی مٹی سے کھیلتا آیا ہوں۔ شہر میں دکان کھول کر وہاں اپنے دو آدمیوں کو چھوڑ دوں گا۔ ہفتے میں ایک دن یہاں سے جا کر ان سے نفع و نقصان کا حساب کرلیا کروں گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

برکت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم عزت سے کاروبار کرو گے جہاں بھی کاروبار کرو' دیانتداری سے کرو۔ یہاں کی مٹی سے مجھے بھی محبت ہے۔ اس لئے میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں کہ تم یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاسکو گے۔"

وہ شیرو کے پاس سے چلا آیا۔ وہ بستی کے جس راستے اور جس گلی سے گزرتا تھا لوگ اسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ بستی کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا کہ آج چالیسویں رات تھی۔ کل صبح چلہ مکمل ہو جائے گا۔ کل کی صبح ہونے سے پہلے ہی وہ لوگوں کی نظروں میں ایک عجیب و غریب انسان بن گیا تھا۔ ایک ایسا انسان جو جنات جیسی آتشی مخلوق کو تسخیر کرلیتا ہے۔ بستی کا چکر لگا کر جب وہ اپنے مکان کی طرف واپس آیا تو اسے زلیخا کے مکان کے دروازے کے سامنے سے گزرنا پڑا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ ہوا سے اِدھر اُدھر ہو رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا زلیخا بھری بہار کی

طرح آنگن میں کھلی ہوئی تھی۔

وہ نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ ٹھیک اس دروازے کے سامنے شیرو سے سامنا ہو گیا۔ شاید وہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ برکت کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"برکت بھائی میں نے وعدہ کیا تھا کہ زلیخا کے دروازے کے سامنے سے نہیں گزروں گا۔ مگر آپ میری مجبوری کو سمجھیں بازار جانے کے لئے یہی ایک سب سے قریبی راستہ ہے۔ اگر آپ اعتراض کریں گے تو میں یہ راستہ بھی چھوڑ دوں گا۔"

برکت نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی یہ راستہ سبھی کے گزرنے کے لئے ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آج کل شرافت سے نظریں جھکا کر چلتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

برکت یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا لیکن شیرو وہیں دروازے کے سامنے رک کر اپنے پیروں کی طرف جھک گیا کیونکہ اس کے جوتے میں کہیں کیل نکل آئی تھی۔ جہاں خوبصورت گلاب کھلتا ہے وہاں کانٹے ضرور نکل آتے ہیں۔ شریف آدمی بن جانے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ اس کے دل میں چپکے چپکے زلیخا کے حسن کا کانٹا نہ کھٹکتا ہو۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ لینے کے بعد یہ مجبوری پیش آجاتی ہے کہ انسان ڈنکے کی چوٹ پر عشق کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس رات محلے میں اچھی خاصی چہل پہل رہی۔ کتنے ہی لوگ سونے کی بجائے اپنے گھروں کے سامنے چارپائی بچھا کر بیٹھ گئے تھے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ رات گزار رہے تھے۔ کیونکہ دوسری صبح چالیس راتوں کے امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ برکت محلے والوں سے بے نیاز ہو کر وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس رات وہ بڑے جوش و خروش سے لہک لہک کر پڑھ رہا تھا۔ اس کی مستقل مزاجی بتا رہی تھی کہ شیطان بھی اسے پڑھنے کے دوران نہیں بہکا سکے گا۔ پڑھتے وقت وہ دکان کا پچھلا دروازہ کھلا رکھتا تھا تاکہ آنگن کی ٹھنڈی ہوا آتی رہے۔ آدھی رات کے بعد جنات تشریف لانے والے تھے۔ مگر آنگن سے خوشبو کے جھونکے آنے لگے۔ خوشبو آئی تو خوشبو والی بھی یاد آنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ زلیخا پھر آنگن میں آکر بیٹھ گئی ہے اور دیوار کے شگافوں سے خوشبو کے پیغامات نشر کر رہی ہے۔

پڑھنے کے دوران خوشبو سے کھلا ہوا بدن چشم تصور میں نظر آیا تو اسی وقت اس کے منہ پر طمانچہ پڑا۔ "یا حئی" کی دلخراش آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے

آنگن سے زلیخا کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ رہ رہ کر چیخ رہی تھی۔ برکت گڑبڑا کر رہ گیا۔ ایک تو طمانچے نے اس کی کھوپڑی الٹ دی تھی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھ ااور زلیخا کی چیخیں سن رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے شیرو اپنی بدمعاشی پر اتر آیا ہو۔ وہ زلیخا کو اٹھا کے لے جا رہا ہو اور زلیخا مدد کے لئے چیخ رہی ہو۔ مگر وہ اس کی مدد کے لئے نہ جا سکا۔ فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ شیطان کے بھڑکانے کا ایک انداز ہے۔ آج چلے کی آخری رات ہے۔ شیطان اسے ناکام بنانے کے لئے کتنے ہی ہتھکنڈے استعمال کرے گا۔ یہ سوچتے ہی وہ پھر سنبھل کر پڑھنے لگا۔

پڑھنے کے دوران وہ اس بات کا منتظر تھا کہ پھر "یاحیی" کی آواز سنائی دے گی اور جنات اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جائیں گے لیکن کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ دکان کی چاردیواری میں صرف اس کے پڑھنے کی آواز گونج رہی تھی اور اس کے پیچھے دوسرے آنگن میں قیامت کا شور بلند ہو رہا تھا۔ زلیخا کے ماں باپ کی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ اب زلیخا کے قہقہے بھی گونج رہے تھے۔

"ہائے ہائے' میری بچی کو کیا ہو گیا ہے؟ کبھی چیختی ہے کبھی ہنستی ہے۔ کبھی کپڑے پھاڑتی ہے' کبھی اپنے بال نوچتی ہے۔ ارے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ نہیں تو یہ اپنے آپ کو اڑا لے گی۔"

برکت کے دماغ میں تمام آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں وظیفے کے الفاظ بھی تھے اور زلیخا کے کھنکتے ہوئے قہقہے بھی تھے اور اس کے ماں باپ کی فریادیں بھی گونج رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج کامیابی کی رات اتنے سارے ہنگامے کیسے ہو رہے ہیں۔ وہ بار بار اپنے ذہن کو پڑھنے کی طرف مائل کرتا رہا۔ جنات کا انتظار کرتا رہا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا' پھر دو گھنٹے گزر گئے' پھر صبح ہو گئی۔ اس کے کمرے میں کوئی نہ آیا۔ چالیس راتوں کی پھیلائی ہوئی جھولی مرادوں سے خالی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے فرش پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب دوسری طرف زلیخا کے آنگن میں بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ تب برکت نے غصے اور نفرت سے سوچا۔ "میری ساری محنت کو مٹی میں ملانے والی یہی زلیخا ہے۔ کئی بار اسے سمجھایا کہ خوشبو لگا کر آنگن میں نہ آیا کر۔ جنات خوشبو کے شوقین ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جو جنات میرے مؤکل بننے والے تھے وہ خوشبو کی طرف بھٹک گئے ہیں اور زلیخا کے حسن پر مرمٹے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟ میں کیا کروں؟ یہ جنات بھی کیسے عاشق مزاج ہوتے ہیں۔ میں حسین تو نہیں ہوں کہ انہیں اپنی طرف واپس بلا لوں۔ واقعی اس دنیا

میں کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ انسانوں پر نہ ہی جنات پر۔ سب اپنے اپنے مطلب کے بندے ہوتے ہیں۔

☆------☆------☆

جب دن اچھی طرح نکل آیا تو وہ شکست خوردہ انداز میں فرش سے اٹھ گیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے دل پر ایسا بوجھ تھا کہ چلتے وقت اپنا وجود پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کسی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کی حالت سے اس کی ناکامی کو پڑھ لیا۔ زلیخا کے دروازے کے سامنے محلے والے جمع تھے۔ اس کے آنگن میں بھی عورتوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ برکت بھی یہی معلوم کرنے آیا تھا کہ پچھلی رات زلیخا پر کیا گزری ہے۔ زلیخا کے باپ نے اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر کہا۔

"بیٹا! تم چالیس راتوں تک کون سا عمل پڑھ رہے تھے؟ ذرا گھر میں چل کر دیکھو میری بیٹی کا کیا حال ہوا ہے۔ ہم نے اسے چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا ہے۔ بڑی مشکلوں سے نیند آئی ہے۔ جب تک جاگتی رہی۔ اپنے کپڑے پھاڑتی رہی اور بال نوچتی رہی اور قہقہے لگاتی ہوئی مردانہ آواز میں کہتی رہی۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تیرے بدن کی خوشبو نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔""

سب لوگ زلیخا کے باپ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے اور بار بار برکت کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ جن حضرت اِدھر آنے کی بجائے اُدھر کیسے چلے گئے۔ برکت نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"آج کل کی لڑکیاں کسی کی نصیحت نہیں سنتیں۔ میں نے بارہا اسے سمجھایا۔ اس کی ماں بھی اسے ڈانٹتی رہی کہ رات کو خوشبو لگا کر آنگن میں نہ سویا کرے۔ اب دیکھ لو صرف اس کا ہی نقصان نہیں ہوا۔ میری چالیس راتوں کی محنت مٹی میں مل گئی ہے۔ مجھے انعام تو کچھ نہیں ملا جنات کے ہاتھوں سے طمانچے ہی ملے ہیں۔ میں کس کے سامنے جا کر فریاد کروں؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ لوگ اسے تسلیاں دینے لگے۔ کچھ لوگ زلیخا کے باپ کو مشورہ دینے لگے۔ ان میں بستی کا ایک بوڑھا ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ لوگ پرانے زمانے کی باتیں نہ کریں۔ لڑکی پر جن نہیں آیا' وہ ہسٹریا کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ جو لڑکیاں شادی کی عمر سے آگے نکل جاتی ہیں اور کنواری بیٹھی رہتی ہیں ان پر اکثر ہسٹریا کا حملہ ہوتا ہے۔ اسے ٹھنڈی چیزیں کھانے کے لئے دی جائیں اور سر میں ٹھنڈے تیل کی مالش کی جائے۔ میں کھانے کے لئے کچھ دوائیں دیتا ہوں۔ یہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

برکت اس ڈاکٹر کو ناگواری سے دیکھنے لگا۔ محلے والوں کو بھی ڈاکٹر کی بات بُری لگی تھی کیونکہ وہ جنات کے وجود سے انکار کر رہا تھا اور کچھ پیسے کمانے کے لئے اپنی ڈاکٹری کا رعب جما رہا تھا۔ مگر زلیخا کا باپ اس وقت ڈوب رہا تھا اور ڈوبنے والا تنکے کا سہارا بھی قبول کر لیتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو گھر کے اندر زلیخا کے پاس لے گیا۔ برکت وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان میں واپس آ گیا۔ بعد میں اسے اطلاع ملی کہ زلیخا کی حالت سنبھل رہی ہے۔ وہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد پوچھ رہی تھی کہ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ جنون کی حالت میں وہ کیا کرتی رہی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد پہلے کی طرح معصوم اور مظلوم نظر آ رہی ہے لیکن شام کو اس پر پھر دورہ پڑا۔ اس بار دورہ شدید تھا۔ محلے کے دو ہٹے کٹے نوجوان اسے پکڑ رہے تھے مگر وہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں نوجوان شیرو کے ایسے جیالے آدمی تھے جو پولیس والوں کو بھی اپنی مٹھی میں کر لیتے تھے مگر زلیخا ان کی گرفت سے نکلی جا رہی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے پھر اسے چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا۔ اس بار جن اتارنے والے عامل کو بھی بلایا گیا۔ محلے کے دوسرے مرد عامل کے آتے ہی گھر سے باہر نکل گئے۔ آنگن میں صرف عورتیں رہ گئیں۔ برکت اپنے آنگن میں کھڑا ہوا تھا اور دیوار کے شگاف سے وہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ایک انگیٹھی میں عود کا سفوف ڈال کر آنگن میں خوشبودار دھواں پھیلایا جا رہا تھا۔ اس انگیٹھی کے سامنے زلیخا سر جھکائے بال بکھرائے بیٹھی تھی۔

چاروں طرف گہری خاموشی چھا رہی تھی۔ صرف عامل کے پڑھنے کی آوازیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔ جیسے جیسے اس کی آواز بلند ہونے لگی ویسے ہی زلیخا اپنا سر دھننے لگی۔ اس کی سیاہ ریشمی زلفیں اِدھر اُدھر اچھل اچھل کر لہرانے لگیں۔ پھر اس کے حلق سے آواز نکلی۔ وہ عامل سے کہہ رہی تھی۔

"یا حئی! میں نہیں جاؤں گا۔ میں چالیس راتوں سے عمل پڑھنے والے کے پاس آتا تھا۔ مگر اس کی خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میری ملکیت ہے......"

زلیخا کے حلق سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی مرد بول رہا ہو۔ حقیقتاً وہ ک
مرد کی آواز نہیں تھی بلکہ جنون کی حالت میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنگن میں بیٹ
ہوئی تمام عورتیں سہم سہم کر اپنی جگہ سمٹ گئی تھیں۔ اگربتی کی خوشبو اور عودِ
دھوئیں میں سارا ماحول دھندلا کر پُراسرار بن گیا تھا۔ عامل اپنی گرجدار آواز میں کہہ ر
تھا۔

"تجھے جانا ہوگا۔ میں بہت بڑا عامل ہوں۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے ہی جنات کے سر سے عشق کا بھوت اتار چکا ہوں۔ تُو زبردستی اسے اپنی ملکیت بنا کر اس پر ظلم کر رہا ہے........."

"میں ظلم نہیں عشق کر رہا ہوں۔" بکھری ہوئی زلفوں کے سائے سے بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ لڑکی مجھے پسند کرتی ہے' میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تُو جھوٹ کہتا ہے' یہ لڑکی انسان ہے' یہ کسی انسان سے ہی بیاہی جا سکتی ہے' تجھ سے نہیں۔"

بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کسی انسان سے اس کی شادی کرو گے تب بھی میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ اسے کہو کہ یہ آنگن چھوڑ کر دوسرے آنگن میں چلی جائے۔ تُو مجھے اپنے عمل سے تسخیر نہیں کر سکے گا' میں اس شخص کے عمل سے بندھا ہوا ہوں جو چالیس راتوں سے وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ نہ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں' نہ اس شخص کے عمل سے آزاد ہو سکتا ہوں۔"

"تُو کیا چاہتا ہے' صاف صاف بتا دے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی ساتھ والے آنگن میں چلی جائے' کیونکہ میں اس آنگن سے بندھا ہوا ہوں۔"

عامل نے گرجدار آواز میں پوچھا۔ "کیا تُو برکت علی کی باتیں کر رہا ہے۔"

"ہاں' وہ میرا آقا ہے۔ نہ میں اس کے عمل سے آزاد ہو سکتا ہوں اور نہ ہی اس لڑکی سے دستبردار ہو سکتا ہوں۔ اگر اس لڑکی کی بھلائی چاہتے ہو تو میرے آقا سے اس کی شادی کر دو۔"

یہ سنتے ہی ساری عورتیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ برکت علی جو اپنے آنگن میں کھڑا ہوا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئی تھیں کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اپنے کانوں سے سن کر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا چلہ کامیاب ہو گیا ہے۔ ایک جن اس کا محکوم بنتے ہی زلیخا جیسی حسین لڑکی کو اس سے

منسوب کر رہا ہے۔

جب توقع سے بڑھ کر انعام ملنے لگے تو مارے خوشی کے دل کی دھڑکنیں پاگل ہو جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کا شکر کس طرح ادا کرے حالانکہ شکر ادا کرنے کے لئے ایک ہی سجدہ کافی ہوتا ہے لیکن وہ مسرتوں کے ہجوم میں اس طرح بوکھلا گیا تھا کہ ایک سجدہ بھی یاد نہ رہا۔ جہاں بیٹھ گیا تھا وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کے کان آواز پر اور آنکھیں دیوار کے شگاف پر لگی ہوئی تھیں۔ زلیخا کا باپ کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنی بیٹی کی بھلائی منظور ہے' برکت بہت نیک لڑکا ہے میں زلیخا کی شادی اس سے کر دوں گا۔"

جب باپ نے رضامندی دے دی تو پھر وہ عامل کسی جن سے کیا بحث کرتا۔ وہاں بیٹھے ہی بیٹھے زلیخا اور برکت علی کی نسبت طے ہو گئی۔ اگر وہ سب راضی نہ ہوتے تب بھی کچھ عرصہ پریشانیاں اٹھانے کے بعد انہیں راضی ہونا پڑتا کیونکہ برکت اس جن کو اپنا مؤکل بنا چکا تھا۔ اسے اپنے عمل سے باندھ چکا تھا۔ دوسری طرف زلیخا اس معمول جن کو اپنی زلفوں کی زنجیر پہنا چکی تھی۔ یعنی اس شادی میں وہ معمول جن برکت کا مؤکل بن کر زلیخا کے پاس آیا تھا اور اب زلیخا کا اسیر بن کر اس کے جہیز میں برکت کے پاس جانے والا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی شادی ہو گئی۔ شادی بہت دھوم دھام سے نہیں کی گئی تھی لیکن دلہن کو خوب اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ اسے ابٹن کے بعد مہندی اور مہندی کے بعد گلاب کی خوشبوؤں میں بسایا گیا تھا کیونکہ جن صاحب خوشبو کے دلدادہ تھے۔ پھر اسے دلہن کا سرخ جوڑا پہنایا گیا۔ سہاگ کا جوڑا پہنتے وقت وہ بے خودی میں جھومنے لگی۔ باہر مردوں کو اس کی اطلاع ملی تو عامل صاحب نے آکر پردے کی آڑ میں کھڑے ہو کر کہا۔

"ہم تمہاری شرط پوری کر رہے ہیں۔ برکت سے اس لڑکی کا نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ اب تم اسے پریشان نہ کرو۔"

عامل صاحب کے کہتے ہی زلیخا نے جنون کی حالت میں جھومنا بند کر دیا۔ وہ پھر ہوش میں آ گئی تھی۔ نکاح پڑھانے کے بعد برکت اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ اس کی دکان کے ساتھ ہی اس کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ وہ اسے دلہن کی طرح سجانا چاہتا تھا لیکن سجاوٹ سے زیادہ صفائی کی ضرورت تھی کیونکہ وہاں ایک معمول جن کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ اسی لئے اس نے کمرے کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد بستر پر سفید چادر بچھائی۔ گلاب کے پھول نہیں ملے تھے اس لئے گلاب کا پانی چھڑک دیا تھا۔ جب اس نے زلیخا کو لا

کر سیج پر بٹھایا تو سانس لیتے ہوئے سرخ گلاب نے پھولوں کی کمی پوری کر دی۔

وہ سرخ گھونگھٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ اب تک وہ اسے دیوار کے شگاف سے دیکھتا رہا تھا۔ اب تک جو کچھ دیکھا تھا وہی قیامت جگانے والا سراپا اس کے سامنے تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ وہ چالیس راتوں تک کسی جن کے لئے عمل پڑھتا رہا تھا یا زلیخا کے لئے۔ انعام میں تو زلیخا ہی ملی تھی۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ وہ اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس چاند سے مکھڑے کو دیکھے جو پاس والے آنگن سے طلوع ہو کر اس کے دل کے آسمان پر چمکنے آ گیا تھا۔

وہ گھونگھٹ والی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ برکت نے پہلے اپنا دبلا پتلا سا ہاتھ اس کے مکھن جیسے ملائم ہاتھوں پر رکھ دیا۔ دل کی بے قراری اور بڑھ گئی کیونکہ اسے چھونے سے پہلے ہی خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں' میں تمہیں دیوار کے شگاف سے دیکھا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ تم چھونے سے کیسی لگو گی۔ ابھی مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے پھول کی ملائم پتی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے اس کے گھونگھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسے آہستہ آہستہ اٹھانے لگا۔ سرخ گھونگھٹ کے پیچھے سے صبح کا چہرہ روشن ہو رہا تھا' بلاشبہ ایک جگمگاتا ہوا حسن تھا کہ آنکھیں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر اس ملکوتی حسن کو دیکھ رہا تھا۔

"ہائے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تیرے جیسی حسین عورت مجھے مل جائے گی۔ ایمان سے جب تُو آنگن میں چلتی تھی تو میرے دل میں تیرے قدموں کی دھمک سنائی دیتی تھی۔ وہ شیرو تو پاگل کا بچہ ہے' تجھ پر بری نیت رکھتا تھا مگر یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تیرے جیسی حسینہ کو حاصل کرنے کے لئے راتیں جاگ کر چلہ کاٹنا پڑتا ہے.........."

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ آہستہ آہستہ جھومنے لگی۔ برکت بوکھلا سا گیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ .... یہ تجھے کیا ہو رہا ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے زلیخا کے دونوں شانوں کو تھام لیا تاکہ اس کا جھومنا بند ہو جائے مگر وہ سر کو اِدھر اُدھر جھٹکنے لگی۔ گھونگھٹ اِدھر سے اُدھر ہو کر سر سے ڈھلک گیا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگی۔

"مجھے خوشبو چاہئے اگر بتی جلاؤ' یہاں عود و عنبر کی مہک کیوں نہیں ہے؟"

وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یاد نہیں رہا تھا' میں ابھی خوشبو کا انتظام کرتا ہوں۔"

وہ بھاگتا ہوا اس کمرے کے دروازے سے نکل کر دوسرے کمرے میں گیا۔ اس کمرے کو وہ دکان کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ دکان خالی ہونے کے باوجود بالکل ہی خالی نہیں تھی' عود اور اگر بتی جیسی چھوٹی چھوٹی چیزیں موجود تھیں۔ وہ جلدی سے عود اور اگر بتی لے آیا اگر بتی سلگانے کے بعد وہ ایک انگیٹھی میں انگارے دہکانے لگا۔ تاکہ عود کا خوشبودار دھواں کمرے میں پھیل جائے۔ اس کے دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی کہ کسی طرح جلدی سے یہ ناگوار فرض انجام دے کر خوشگوار فرض ادا کرنے کے لئے دلہن کے پاس پہنچ جائے۔

اللہ اللہ کر کے اس نے کسی طرح اپنا کام انجام دیا۔ پھر ہانپتے کانپتے دوبارہ دلہن کی سیج پر آ کر بیٹھ گیا مگر دلہن ابھی تک جھوم رہی تھی۔ وہ اسے جھنجھوڑ کر پوچھنا چاہتا تھا کہ اب اس کمرے میں کیا کمی رہ گئی ہے؟ اس نے جھنجھوڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو زلیخا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ دلہن کے اس ردعمل کے لئے تیار نہیں تھا۔ چارپائی کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دلہن کا ہاتھ پڑتے ہی فرش پر الٹ گیا۔ اس وقت پتہ چلا کہ تندرستی ہزار نعمت ہے کیونکہ زلیخا صحت مند تھی اور وہ چالیس راتوں تک جاگ جاگ کر سوکھی لکڑی بن گیا تھا۔

وہ جلدی سے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ زلیخا کے ہاتھوں نے نہیں بلکہ اس کے معمول جن نے اپنی معشوقہ کے پاس سے اسے ہٹایا ہے۔ اس نے ذرا سہم سہم کر شکائت کی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ تمہاری تمام شرطیں پوری ہو چکی ہیں۔ میں نے یہاں خوشبو کا بھی انتظام کر دیا ہے' اب یہاں سے جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" زلیخا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ تم یہاں سے جاؤ۔"

"یہ کیا بیہودگی ہے؟ زلیخا میری منکوحہ ہے تم اس کمرے میں نہیں رہ سکتے۔"

"زلیخا میری ملکیت ہے۔" مردانہ قسم کی آواز نے کہا۔ "میں اُسی وقت تمہاری اطاعت قبول کروں گا جب تم زلیخا سے دستبردار ہو جاؤ گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے آج ہی بستی والوں کے سامنے نکاح پڑھوایا ہے۔

آج ہی اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں' زلیخا میری ہے یہ میرے گھر سے نکل کر کہاں
گی؟"

"یہ اسی گھر میں رہے گی تم بھی اسی گھر میں رہو گے اور میں بھی اسی گھر میں
گا۔ ہم تینوں آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ اگر تم اس مضبوط بندھن کو توڑنا چاہو
بُری طرح تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری کھوپڑی الٹ جائے گی اور تم پاگل ہو کر اپنے
پھاڑتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگتے پھرو گے۔ اگر رشتے کی اس تگڈم کو برقرار رکھو
آج ہی رات سے تم دولت مند بننا شروع ہو جاؤ گے اور ساری زندگی عیش کرتے
گے۔"

وہ سر تھام کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس کے مقابلے
انسان ہوتا تو وہ زلیخا کے لئے لڑ پڑتا۔ اس نے شیرو جیسے بدمعاش کو سیدھا کر دیا تھا مگر
جن کو اپنے راستے سے کیسے ہٹا سکتا تھا؟ وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اگر وہ زلیخا
دستبردار ہوتا ہے تو صرف ایک حسین عورت ہاتھ سے جاتی ہے مگر جن سے تا قیا
دوستی قائم رہ سکتی ہے اگرچہ جن اس کا معمول تھا لیکن اسی شرط پر اس کے حکم کی
کر سکتا تھا کہ ایک عورت ان کے درمیان فساد کا باعث نہ بنے۔

عورت تو ازل سے ہی فساد کی جڑ ہے۔ اس وقت دانشمندی یہی تھی کہ وہ اس
کی جڑ کو اپنے دل سے اتار کر پھینک دے اس نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
عجیب طرح کے محکوم ہو اپنا ہی حکم منواتے ہو مگر یاد رکھو اس کے بعد اگر تم میرے
نہیں آئے تو پھر میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

"میں تمہارے کام آؤں گا۔ جاؤ اور جہاں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا کرتے تھے وہاں بیٹھ
پھر پڑھنا شروع کر دو۔ آج جمعرات ہے' ہر جمعرات کو یہی کرنا اور آدھی رات کے
دکان کا اگلا دروازہ کھلا رکھنا۔ جو کچھ تمہیں نظر آئے اسے خاموشی سے دیکھتے رہنا۔ جب
وہ اگلا دوازہ بند ہو جائے تو پھر اطمینان سے سو جانا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ سر جھکا کر سُرخ گلاب جیسی خوبصورت دلہن کے کمرے سے نکل گیا۔ درواز
سے باہر آ کر اس نے حسرت بھری نظروں سے ایک بار زلیخا کی جانب دیکھا۔ اب وہ
جھوم رہی تھی پُرسکون ہو گئی تھی۔ عود کا خوشبودار دھواں تمام کمرے میں پھیل گیا تھا
اس لہراتے ہوئے دھویں میں وہ کبھی چھپ رہی تھی اور کبھی نظر آ رہی تھی اور چھپے
جذبے کی طرح للچا رہی تھی۔ اس دروازے کے ساتھ ہی دکان کا دوسرا دروازہ تھا۔ زلیخا
دروازہ چھوڑ کر دوسرے دروازے میں داخل ہونے کے بعد اس کی تقدیر بدلنے والی تھی

گئے یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ دولت اور خوش حالی خود بخود اس کے قدموں کو چومنے آئے
گی۔ وہ دکان میں آ کر حسب معمول فرش پر پالتھی مار کر بیٹھ گیا۔

اسے وہ بابا صاحب یاد آ رہے تھے' جن کے دیئے ہوئے تعویذ اور یاد کرائے ہوئے
وظیفے ہمیشہ الٹا اثر دکھاتے تھے۔ اگر موجود ہوتے تو وہ ان کے پاس جا کر زلیخا پر سے جن
اتارنے کا تعویذ لے آتا۔ مگر ان کے دیئے ہوئے تعویذ کی کوئی گارنٹی نہیں تھی اگر الٹا اثر
ہوتا تو جن زلیخا پر سے اتر کر اس پر سوار ہو جاتا۔ بہرحال اب بابا صاحب کے متعلق سوچنا
فضول تھا۔ وہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی دکان کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ آدھی رات ہو
چکی تھی۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ کر دھیمی دھیمی آواز میں پڑھنے لگا۔ دو گھنٹے کے بعد اس کے
وظیفے نے اپنا اثر دکھایا۔ باہر سڑک پر کھلنے والے دروازے پر اسے چند سفید پوش نظر
آئے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں کچھ اٹھائے ہوئے تھے اور یکے بعد دیگرے دکان میں داخل ہو
کر اس کے آگے پیچھے بھٹک رہے تھے۔ کچھ سامان اِدھر اُدھر کر رہے تھے اور کچھ سامان
رکھ رہے تھے۔ برکت نے فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جھوم جھوم کر پڑھنے میں
مصروف ہو گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کی دکان میں سناٹا چھا گیا ہے۔ اس نے
آنکھیں کھول کر دیکھا تو اگلا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ پھر وہ لالٹین کی زرد روشنی میں چاروں
طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔ اس کی دکان میں دنیا جہان کا سامان بھرا ہوا تھا۔ گاہکوں کی
ضرورت کی جتنی چیزیں تھیں وہ سب وہاں موجود تھیں۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر دیکھ رہا تھا۔ واقعی اس کی تقدیر بدل رہی تھی۔ دولت خود بخود اس کے قدموں میں آ
رہی تھی۔ آئندہ بھی نہ جانے اسے کیا کچھ ملنے والا تھا۔ وہ خوشی سے دوڑتا ہوا دکان کے
ایک دروازے سے نکل کر اس کے ساتھ والے دروازے پر آیا مگر دروازہ اندر سے بند
تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ شاید زلیخا گہری نیند سو گئی تھیں وہ اسے خوشخبری سنانے آیا
تھا پھر خیال آیا کہ اس کا معمول جن مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ اس لئے وہ پھر
چپ چاپ دکان میں آ کر لیٹ گیا۔ تھکن کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ وہ حیرت سے
اور مسرت سے لیٹے ہی لیٹے دیدے گھما کر اپنی دکان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی مالدار کے
پھولے ہوئے پیٹ کی طرح بھر گئی تھی۔

اسے اچانک ہی اتنی خوشیاں ملی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہ سکا۔ اذان سے پہلے
ذرا دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے ایک گاہک نے دروازے پر دستک

دی۔

"برکت چالیس دن پورے ہو گئے، تیری شادی بھی ہو گئی، اب تو دکانداری شروع کر دے۔"

وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دکان کا وہ دروازہ جو سڑک کی طرف کھلتا تھا، کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ سونے سے پہلے اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا۔ دروازے پر کھڑا ہوا گاہک حیرانی سے دکان کو دیکھ رہا تھا جو پچھلی شام تک خالی تھی اور اب مال سے بھری پڑی تھی، اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"برکت! یہ کیا تماشا ہے، اتنا مال کہاں سے آگیا؟"

برکت نے سوچا کیا جواب دے؟ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی جنات ہاتھوں میں سامان لئے کھلے ہوئے دروازے سے اندر آتے ہیں اور جب وہ دروازے کو اندر سے بند کر لیتا تھا تو آنکھ کھلنے کے بعد دروازہ کھلا ملتا تھا۔ وہ ایسے جناتی راز دوسروں کو کیسے بتا سکتا تھا۔ پھر بتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ خود ہی گاہک کی سمجھ میں آگیا کہ برکت نے چلہ کاٹ کر جنات کو اپنا تابع فرمان بنا لیا ہے۔ اب اس کی دکان میں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے؟

ایک گاہک کے ذریعے یہ خبر ساری بستی میں پھیل گئی۔ مرد عورتیں اور بچے سب ہی وہاں آ کر حیرانی سے اس دکان کو دیکھنے لگے۔ دکان کے بیچ میں برکت خوشی سے دانت نکالے یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے لوگ چڑیا گھر میں اسے دیکھنے آئے ہوں۔ گاہکوں کی بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ ہر گاہک اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے اسے اِدھر اُدھر سے آواز دے رہا تھا۔ آخر پریشان ہو کر اسے تمام گاہکوں کو ایک قطار میں کھڑا کرنا پڑا۔ بستی کے دوسرے دکاندار اسے حسد سے اور حسرت سے دیکھ رہے تھے مگر اس سے کھل کر دشمنی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی یہ سوال نہیں اٹھا سکتا تھا کہ اس کنگلے دکاندار کی دکان میں اتنا مال کہاں سے آگیا۔ ایک نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے سالے نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے۔"

دوسرے نے سہم کر کہا۔

"ارے آہستہ بول اگر اس کے حکم کی تعمیل کرنے والے جن نے سن لیا تو تیری شامت آ جائے گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "کچھ بھی ہو ہمیں اپنے کاروبار کو بچانے کے لئے اس کمبخت پر چوری کا الزام لگانا ہو گا تاکہ پولیس والے اس کے پیچھے پڑ جائیں۔ پولیس والوں کے

ڈنڈوں کے سامنے تو بڑے بڑے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سالے کا جن بھی بھاگ جائے۔"

برکت کی دکان میں جو معجزہ پیش آیا تھا اسے دیکھ کر بستی والے برکت سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔ وہاں اس کے چاہنے والے زیادہ تھے مگر کچھ کاروباری دشمن بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اسے کسی کی کیا پرواہ تھی۔ اس کی مدد کرنے کے لئے جنات کے پوشیدہ ہاتھ موجود تھے۔ صبح اٹھنے کے بعد برکت کو دوپہر تک اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ وہ ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے پر زلیخا کی خیریت معلوم کرتا، دوپہر کو اس نے گھبرا کر کہا۔

"اب ایک گھنٹے کے لئے کھانے کا وقفہ ہے، دکان بند کر رہا ہوں، تم لوگ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے گاہکوں کو دکان سے نکال کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ جب وہ آنگن میں آیا تو زلیخا .... چھپر کے نیچے چولہے کے سامنے بیٹھی کھانا تیار کر رہی تھی۔ صبح غسل کرنے کے بعد وہ ایسے نکھر گئی تھی جیسے نوخیز کلی شبنم سے تر بتر ہو کر کھِل گئی ہو۔ سبز رنگ کے لباس میں گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ چولہے کے لپکتے ہوئے شعلے اس کے رخساروں تک اپنی سرخی پہنچا رہے تھے۔ وہ محویت کے عالم میں جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھ رہی تھی اور زیر لب مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ برکت نے اسے مخاطب کیا تو وہ ایک دم سے چونک گئی اور گھبرا کر اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے کوئی اجنبی اس کے سہاگ کے آنگن میں آگیا ہو۔

"زلیخا! کیا سوچ رہی ہے؟ دیکھ آج کتنی آمدنی ہوئی ہے، پورے سات سو روپے ہیں۔ اس بستی میں آج تک کسی نے بھی سات سو روپے کی دکانداری نہیں کی ہے۔"

وہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چھوٹے بڑے نوٹ اسے دکھانے لگا۔ زلیخا نے سر جھکا کر کنکھیوں سے نوٹوں کی طرف دیکھا پھر چولہے پر سے ہانڈی اتارتی ہوئی بولی۔

"اب جا کے غسل کر لے۔ میں تیرے لئے کمرے میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

برکت منہ کھول کر اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ وہ بیوی کی طرح کھانا پکا رہی تھی۔ اس کے کھانے پینے اور نہانے کا خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے باوجود آدھی بیوی تھی اور .... آدھی جن کی معشوقہ تھی۔ ایسا تگڈمی رشتہ تھا کہ دن کو اس کی خدمت کرتی اور رات کو اس کی وہ جو نظر نہیں آتا تھا۔ برکت نے بڑی حسرت سے کہا۔

"میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ مرد اپنی عورت کے قریب کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کرتا مگر ہماری ازدواجی زندگی کا ایک تیسرا شریک آگیا ہے۔ زلیخا کیا تیرے دل میں میری محبت نہیں ہے؟"

"ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کر۔" وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا تُو تباہ ہونا چاہتا ہے۔ اس مکان میں دو کمرے ہیں۔ دکان والا کمرہ تیرے لئے ہے اور جس کمرے میں میں رہتی ہوں وہ اس کے لئے ہے۔ اگر تُو دولت کمانا چاہتا ہے تو اپنی بھلائی کے لئے اور میری بھلائی کے لئے میرا خیال چھوڑ دے۔ اگر تُو محبت کی باتیں کرے گا تو تیرا وہ معمول میرا بھی دشمن ہو جائے گا۔ کیا تُو چاہتا ہے کہ میں پھر جنون کی حالت میں اپنے کپڑے پھاڑنا شروع کر دوں۔"

اس نے جلدی سے توبہ کے انداز میں گالوں کو پیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں' میں یہ نہیں چاہتا۔ اس طرح ہم دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ دولت بھی ہاتھ سے جائے گی اور تُو بھی نہیں ملے گی مگر میں کیا کروں۔ اس وقت تجھے دیکھ کر میرا دل بے اختیار کہتا ہے کہ میں تیرا خاوند ہوں۔"

"خاوند تو ہے۔ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ میں ایک بیوی کی طرح ساری عمر تیری خدمت کرتی رہوں گی۔ تیرے لئے کھانا پکاؤں گی' تیرے آرام کا خیال رکھوں گی' تُو میری مجبوری کو سمجھتا ہے' میں اس سے زیادہ تیرے کام نہیں آسکوں گی۔"

"ہاں' میں بھی مجبور ہوں تُو بھی مجبور ہے مگر دن کے وقت ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے۔ ایک دوسرے کی چاہت کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جن کبھی تجھے چھوڑ کر کسی دوسری لڑکی پر عاشق ہو جائے۔ پھر تجھے اس سے نجات مل جائے گی۔ پھر تُو دن رات کے لئے میری بن جائے گی۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم بھی امید کے سہارے زندہ رہیں گے۔ تُو ابھی بہت پریشان نظر آرہا ہے لا یہ روپے مجھے دے اور جا کر غسل کر لے۔"

برکت نے اسے روپے دیتے ہوئے کہا۔

"تُو میری گھر والی ہے۔ میری کمائی' تیرے ہی ہاتھوں میں جائے گی۔ میں ایک لوہے کی تجوری خرید کر لاؤں گا تو اس میں پیسے رکھنا۔ ہمارے گھر میں جنات کا پہرہ ہے کوئی چوری کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

وہ زلیخا کو تمام روپے دے کر غسل کرنے کے لئے چلا گیا۔ عورت بیوی بن کر گھر

میں قدم رکھتے ہی خاوند کی کمائی کی حقدار بن جاتی ہے۔ وہ نصف شریک حیات ہونے کے باوجود رفتہ رفتہ اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے لگی۔ وہ برکت سے روز کی آمدنی لے کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی اور برکت کو صرف پان سگریٹ کے پیسے دیتی تھی۔ کبھی برکت سو پچاس کا مطالبہ کرتا تو وہ جھگڑا کرنے لگتی۔

"اتنے روپے لے کر کیا کرے گا؟ کیا ضرورت آپڑی ہے۔ مجھے بتا پھر میں دوں گی۔"

برکت بہت سی ضرورتیں پیش کرتا کہ اسے ایک دن کے لئے شہر جانا ہے اور شہر سے دکان کے لئے کچھ مال خرید کر لانا ہے۔

"دکان کے لئے کچھ خریدنا چاہتا ہے تو اپنے معمول سے پیسے طلب کر۔ ہم چھ ماہ سے دیکھ رہے ہیں کہ ہر جمعرات کی رات کو کبھی دکان کی ضرورت کا سامان پہنچ جاتا ہے' کبھی بڑے بڑے نوٹ دکان کے فرش پر پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ تیرے جنات مال سے اور نقد رقم سے تیری مدد کر رہے ہیں تو پھر مجھ سے پیسے کیوں مانگتا ہے؟"

"اس لئے مانگتا ہوں کہ دکان سے جتنے بھی پیسے آتے ہیں وہ سب تُو اپنے پاس چھپا کر رکھ لیتی ہے جو رقم ایک بار تیرے پاس چلی جائے وہ دوبارہ نظر نہیں آتی پتہ نہیں کہاں چھپا کر رکھتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایک جھلک دکھا دیا کر۔"

"دیکھ کر کیا کرے گا؟ مرد کے ہاتھ میں پیسے رہیں تو وہ دوستوں میں جا کر گلچھرے اڑاتے ہیں اگر گھر کی عورت لگام دے کر نہ رکھے تو پھر وہ فضول خرچی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ لے پچاس روپے۔"

برکت نے پچاس روپے لیتے ہوئے کہا۔

"ہمیشہ لڑ جھگڑ کر پیسے دیتی ہے۔ وہ بھی ضرورت سے کم ہوتے ہیں مگر مجھے یہ بھی اچھا لگتا ہے۔ لڑتے جھگڑتے وقت یوں لگتا ہے جیسے ہم واقعی میاں بیوی ہیں۔"

"سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی اسی لئے لڑتی جھگڑتی ہوں۔ ایسے وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اس گھر میں تنہا نہیں ہوں میرا ایک خاوند ہے جس کی کمائی میرے ہاتھوں میں رہتی ہے اور وہ مجھ سے ایک ایک پیسے کے لئے لڑتا ہے۔ اللہ اس لڑائی میں کتنی اپنائیت ہے۔"

برکت اس کی باتیں سن کر تھوڑی دیر کے لئے جن کو بھول جاتا تھا۔ زلیخا اسے سر سے پاؤں تک اپنی ہی اپنی نظر آتی۔ اس کی باتیں' اس کی چاہتیں' اس کی توجہ اور اس کی خدمت گزاری سب برکت کے لئے تھیں۔ یہ اتنی ساری مسرتیں اسے بھلا دیتی تھیں۔

برکت یہ سوچ کر صبر کرلیتا تھا کہ وہ حسینہ اس کی بیوی بننے کے بعد اس کے بالکل قر
ضرور ہے لیکن وہ اب تک اسے دیوار کے شگاف سے دیکھ رہا ہے‘ کسی دن تو وہ ج
دیوار گرے گی۔

بس وہ اسی طرح صبر و شکر سے زلیخا کو دیکھ دیکھ کر دن رات گزار رہا تھا اور
تھی کہ دن بدن پھول کی طرح کھلتی جا رہی تھی۔ ہمیشہ ہنستی کھلکھلاتی رہتی۔ بوڑ
ڈاکٹر کے خیال کے مطابق اب اس پر ہسٹریا کا حملہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر جنات کی قوم
کوئی ڈاکٹر ہوتا ہے تو وہ جن اس کا علاج کر رہا تھا۔ وہ مکمل طور سے ایک سہاگن
زندگی گزار رہی تھی۔ گھر سے باہر برکت کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ بستی والے اس
قسمت پر رشک کر رہے تھے کیونکہ وہ دولت سے کھیل رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک
تھانیدار اس کی دکان میں پہنچ گیا۔ اس نے دکان میں آتے ہی کہا۔ ”کیا حال ہے برک
آج کل تو پانچوں گھی میں ہیں۔ آخر یہ کیا تماشا ہے؟“

”یہ اللہ کی دین ہے‘ وہ اسی طرح چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔“

تھانیدار نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چھپر کس طرف سے پھٹتا ہے؟ مجھے تو کہیں سے ایک سوراخ بھی نظر نہیں آ
ہے۔“

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے.........“

”میں تمہارا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ تم یہ کہو گے کہ تم نے جناتی عمل پڑھا
اس کے نتیجے میں تمہیں یہ دولت مل رہی ہے۔ مگر پولیس والے بھی جنات سے کم نہ
ہوتے‘ میں اس وقت تمہارے سر سے جن اتارنے آیا ہوں۔ صاف صاف بتاؤ کہ یہ
چکر ہے؟“

برکت نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں‘ میں آپ کو کیا بتاؤں؟ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے اپنی آنکھوں
جنات دیکھے ہیں۔“

تھانیدار نے سخت لہجے میں کہا۔

”میں بھی تمہارے جنات کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”انہیں صرف میں دیکھ سکتا ہوں وہ کسی اور کو نظر نہیں آئیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔“ تھانیدار نے گرج کر کہا۔ ”یہاں کے چند دکانداروں نے
سے شکایت کی ہے کہ ان کی دکان کا مال تمہاری دکان میں پہنچ جاتا ہے۔“

”وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میری دکان کے سامنے جب سے ان کی دکانداری خراب
ہوئی ہے وہ مجھ سے جلنے لگے ہیں۔ اب ان کا بس نہیں چل رہا ہے تو مجھ پر چوری کا الزام
لگا رہے ہیں۔ کیا میں آپ کو چور نظر آتا ہوں؟ میں تنہا آدمی ان کی دکانوں میں جا کے
ڈاکے ڈال سکتا ہوں۔“

تھانیدار نے غصے سے آٹے کے بورے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”تم تنہا نہیں ہو۔ چوری ڈکیتی کے لئے تم شیرو سے مدد لیتے ہو اور اس سے مل کر
چوری کرواتے ہو۔ میں نے شیرو کو بھی دیکھا ہے آج کل وہ قیمتی کپڑے پہن کر اکڑتا پھرتا
ہے۔ اس کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں ہوتی ہیں اور اس کی جیب میں ہمیشہ بڑے
بڑے نوٹ نظر آتے ہیں۔ یہ سب کہاں سے آتا ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ آپ کو شیرو سے پوچھنا چاہئے۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ چور کبھی یہ نہیں کہتا کہ وہ چور ہے‘ وہ کہتا ہے کہ اس نے شہر
میں ایک دکان کھول لی ہے اور وہاں اپنے دور کے ایک رشتے کے بھائی کو بٹھا دیا ہے مگر
میں نہیں مانتا۔ میں سب جانتا ہوں۔ وہ شہر والی دکان بھی ہے۔ تم اور شیرو اس دکان کی
آمدنی کے حصے دار ہو۔“

”تھانیدار صاحب! میں تو شیرو کو دور ہی سے سلام کرتا ہوں۔ آپ جو چاہیں مجھ پر
الزامات لگائیں لیکن سچ آخر سچ ہوتا ہے مجھے جنات کی حمایت حاصل ہے۔ آپ اپنے طور
پر جو کچھ بھی کرنا چاہیں کریں۔“

”میں اپنے طور پر ہی یہاں کچھ کرنے آیا ہوں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ جنات یہاں
کب آتے ہیں؟“

”جمعرات کو آدھی رات کے بعد‘ اور آج جمعرات ہے۔“

تھانیدار نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ آج آدھی رات کے بعد میں یہاں آ کر تمہارے جنات کو سمجھ
لوں گا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی دوسرے کمرے سے زلیخا کے قہقہے سنائی دیئے۔ برکت
تھانیدار کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ زلیخا فرش پر بیٹھی جھوم رہی تھی۔
سر دھن رہی تھی اور اڑتی ہوئی ریشمی زلفوں کے سائے میں قہقہے لگا رہی تھی۔ برکت
نے فوراً ہی سب سے پہلے اگربتی سلگائی۔ اس کے بعد پوچھا۔

”کیا بات ہے‘ اتنے عرصے کے بعد زلیخا کو پھر کیوں پریشان کر رہے ہو؟“

زلیخا کی بھرائی ہوئی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

"اس خبیث کو یہاں سے فوراً نکالو۔ اگر وہ آدھی رات کے بعد یہاں آئے گا تو پھر واپس نہیں جائے گا۔"

اسی وقت دکان سے تھانیدار کی آواز آئی۔

"کیابات ہے برکت! تیری گھروالی کو کیا ہو گیا ہے؟"

برکت دوڑتا ہوا پھر دکان میں واپس آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"تھانیدار صاحب! خدا کے لئے یہاں سے چلے جایئے' میں آپ کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس میں میری گھروالی کی بھی بھلائی ہے' بعد میں آپ جو چاہیں کریں مگر خدا کے لئے اس وقت چلے جائیں۔"

تھانیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شاید تمہاری گھروالی پر جن آیا ہے۔ تعجب ہے کہ یہ جن کہاں سے آجاتے ہیں۔ بہرحال آج آدھی رات کے بعد میں ان سے نمٹ لوں گا۔" یہ کہہ کر تھانیدار وہاں سے چلا گیا۔ برکت نے جلدی سے دکان کے اگلے دروازے کو بند کیا پھر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ زلیخا بال بکھرائے فرش پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی اور یوں گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جیسے اس پر سے بوجھ اتر گیا ہو۔ برکت نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔

"زلیخا! کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دکان میں آنے والا شخص ناپاک ہے اسے فوراً یہاں سے بھگا دو۔"

"وہ تھانیدار تھا' میں نے اسے بھگا دیا ہے۔ میں تو یہی کوشش کرتا ہوں کہ کوئی گاہک بھی ناپاکی کی حالت میں میری دکان میں نہ آئے مگر وہ تھانیدار تھا اس لئے میں اسے روک نہ سکا۔ ہمارا کیا ہے اب اگر وہ دوبارہ آئے گا تو خود ہی پچھتائے گا۔"

برکت اس سے تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد دکان میں واپس آ گیا۔ دکان کا دروازہ کھولتے ہی شیرو نظر آیا۔ وہ اندر آنے لگا تو برکت نے پوچھا۔

"کیا تُو پاک صاف ہے؟ میں تمام بستی والوں کو سمجھاتا ہوں کہ وہ ناپاکی کی حالت میں یہاں قدم نہ رکھیں۔"

"میں جانتا ہوں' برکت بھائی! ایک بار تمہارے گھر کی دیوار پر چڑھتے ہوئے تمہارے جنات کے طمانچے کھا چکا ہوں۔ اب تمہاری مرضی کے خلاف یہاں قدم رکھنے کی

تگڈم O 197

مجھ میں جرأت نہیں ہے۔"

"میری مرضی یہ ہے کہ تُو میری دکان میں نہ آیا کر۔ ابھی تھانیدار یہاں آیا تھا اور تیری طرح مجھے بھی چور بنا کر چلا گیا۔"

شیرو نے دکان کے باہر ہی کھڑے ہو کر کہا۔

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں کہ وہ تھانیدار کیا کہہ رہا تھا۔ میرے پاس آکر وہ کم بخت الزام لگا رہا تھا کہ میں ڈاکے ڈالتا ہوں اور چوری کا مال تمہاری دکان میں پہنچاتا ہوں۔ میں تجھ سے کہنے آیا ہوں کہ تھانیدار نے تجھ جیسے آدمی کی توہین کی ہے اس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہئے۔ آج جمعرات ہے تمام بستی والے جانتے ہیں کہ آج کی رات تیرے پاس جنات آتے ہیں' کیا تُو تھانیدار کو ان کے ذریعے سزا نہیں دلائے گا؟ اس نے تجھے چور کہا ہے مگر غصے سے میرا خون کھول رہا ہے۔"

"شیرو' غصہ تو مجھے بھی آرہا ہے لیکن مجھ میں صبر کرنے کی عادت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنات خود ہی اس کا مزاج درست کر دیں گے۔ اب تُو یہاں سے جا۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس والے تجھے میرے ساتھ دیکھ کر پھر نئے الزامات تراشنا شروع کر دیں۔"

شیرو وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔ جب رات آئی تو وظیفہ پڑھنے کا وقت آ گیا۔ برکت کو کسی پولیس والے کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ دیانتدار تھا' لوٹ کا مال نہیں کھا رہا تھا۔ جو کچھ جنات اسے دے رہے تھے اسے وہ حلال کی آمدنی سمجھ کر قبول کر رہا تھا۔ اسی لئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس رات بھی پڑھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے ہی تھانیدار اپنے ساتھ چند مسلح سپاہیوں کو لے کر تھانے سے نکلا لیکن برکت کی دکان تک پہنچنے سے پہلے ہی چند نقاب پوشوں نے انہیں گھیر لیا۔ اس کے نتیجے میں جم کر مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ تمام سپاہی اچھے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے فائرنگ کرتے ہوئے کتنے ہی نقاب پوشوں کی لاشیں گرا دیں جو باقی بچے وہ منتشر ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کا پیچھا کرنے کے لئے سپاہیوں کو بھی منتشر ہونا پڑا۔ تھانیدار بھی ایک نقاب پوش کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ شاید بھاگنے والے کو اس کا علم نہیں تھا کہ رات کی نیم تاریکی میں تھانیدار اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا برکت کے مکان کے مشرقی حصے میں پہنچا۔ وہاں کی اونچی دیوار پر ایک بار شیرو نے کمند ڈال کر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس رات پہلے ہی کمند ڈال دی گئی تھی۔ دیوار کی بلندی سے رسہ لٹک رہا تھا۔ بھاگنے والا رسے کے سہارے تیزی سے دیوار پر چڑھنے لگا۔ وہ نصف بلندی تک پہنچا ہی تھا کہ تھانیدار نے للکار کر کہا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

مگر دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اور تیزی سے دیوار کی بلندی کی طرف جانے لگا۔ تھانیدار نے گولی چلا دی۔ اس کے ریوالور سے ایک شعلہ سا نکلا اور اوپر چڑھنے والا چیخ مار کر بلندی سے پستی کی طرف آ گیا۔ دوسری صبح ساری بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ شیرو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس کی لاش برکت کی دکان کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے لا کر رکھ دی گئی تھی۔ برکت نے اس کی لاش کو دیکھ کر نفرت سے ایک طرف تھوک دیا۔

"چور کہیں کا۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر رہتا تھا۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا دکان کے اندر آیا۔ وہاں سے گزرتا ہوا زلیخا کے کمرے کی طرف جانے لگا تاکہ اسے بھی یہ خوشخبری سنا دے کہ ایک بڑا آدمی برے انجام کو پہنچ گیا لیکن یہ بری خبر زلیخا بھی سن چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھی سسک سسک کر رو رہی تھی۔ برکت اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ چوکھٹ پر اپنی کلائی رکھے دوسرے ہاتھ سے چوڑیاں توڑ رہی تھی۔ برکت نے اس کی آہوں کے دوران اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔

"ہائے میرا جن مر گیا۔ اب وہ کبھی نہیں، کبھی نہیں آئے گا..........."

☆------☆------☆

لاولد

ایک عجیب و غریب وصیت کا قصہ جو بہت سے لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔

ایک مردِ دانا کا قصہء عجیب۔ اس کے معیار کی کسوٹی پر کوئی عورت پوری نہیں اترتی تھی۔

دولت کے حصول کے لئے کی جانے والی شرمناک سازشوں کا حال۔

چونکا دینے والے انجام کی نشتر کہانی۔

میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن اندھیرے سے ڈرتا ہوں۔ موت سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ وہ اچانک آتی ہے اور پلک جھپکتے میں قصہ تمام کر جاتی ہے۔ اندھیرے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ یہ جہاں تک پھیلا ہوتا ہے وہاں تک مجھے ان دیکھے دشمن للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے وہ چھپے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ "آؤ موت کی آنکھ مچولی کھیلیں تم ہمیں ڈھونڈ لو' ہم تمہیں ڈھونڈ لیں۔ جسے ڈھونڈ لیا جائے گا اس کا قصہ تمام ہو جائے گا۔"

میرے چاروں طرف ایسی گہری تاریکی تھی کہ ایک بجے گھر سے نکل کر پچھتا رہا تھا۔ اگر میں اُس خاتون کو ملاقات کا وقت نہ دیتا تو ایسی حماقت کبھی نہ کرتا۔ حماقت تو ہو تھی کہ میں ایک پینتیس برس کی عورت سے ملنے کے لئے رات کے ایک بجے بھٹک رہا تھا۔ رات کے ایک بجے رومانس تو ہوتا ہے مگر اتنی عمر والی سے نہیں ہوتا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی شہرت بہت سنی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت خوبصورت اور سمارٹ ہے اور اتنی چالاک ہے کہ اپنی عمر کا پتہ نہیں چلنے دیتی۔ ویسے میری عمر کا بھی پتہ نہ چلتا اگر اس تاریکی میں کہیں سے موت کا فرشتہ چلا آتا۔

اچانک ہی بھوں بھوں کی آواز سنائی دی اور میں دہشت کے مارے اچھل پڑا۔ یوں لگا جیسے کوئی دشمن کتا بن کر سامنے آگیا ہو۔ عجیب بات ہے کہ آدمی کاٹنے کو دوڑے تو اسے کمینہ کتا کہتے ہیں اور کتا اگر کاٹنے کو دوڑے تو ہم اسے کمینہ انسان نہیں کہتے۔ بہرحال یہ دیکھ کر میرا خوف دور ہو گیا کہ میں اُسی عمر والی خاتون لیلیٰ محسن کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

احاطے کے گیٹ کے پاس پہنچ کر میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی کوٹھی کے دروازے تک پھینکی' اس روشنی میں لیلیٰ کا کتا نظر آیا۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا تھا' وہ بھونک سکتا تھا مگر کاٹ نہیں سکتا تھا۔ گیٹ کے دوسری طرف کھٹکا لگا ہوا تھا۔ میں نے گیٹ کی جالی کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کھٹکے کو اٹھایا پھر اندر پہنچ کر اسے دوبارہ لگا دیا۔ کتا بھونکے جا رہا تھا' میں اس سے ذرا فاصلہ رکھ کر گزرتا ہوا اس کوٹھی کے دروازے

تک پہنچ گیا۔ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی تو رات کی خاموشی میں اندر کہیں دور گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ ایک بوڑھے ملازم نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "فرمائیے آپ کون ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "میرا نام ابن شہاب ہے۔ میں بیرسٹر لیلیٰ محسن سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے یہی وقت دیا تھا۔"

اس نے دروازے کو پوری طرح کھولتے ہوئے کہا۔ "تشریف لائیے' مالکن آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں اندر چلا گیا۔ دروازے کو بند کر دیا گیا' میں نے پلٹ کر دیکھا تو بوڑھے ملازم نے ایک کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کا اندرونی منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑی سی میز رکھی تھی اور اس پر بہت سارے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں چاروں طرف اونچی اونچی الماریاں رکھی ہوئی تھیں اور ان الماریوں سے قانون کی موٹی موٹی کتابیں جھانک رہی تھیں۔

میں لیلیٰ سے ملنے آیا تھا۔ وہ ایک دوسری میز پر رکھی ہوئی موٹی سی کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھ سے بے خبر تھی۔ یا اس نے کال بیل کی آواز سن لی تھی تو پھر میری آمد کے متعلق جان گئی تھی اور اب انجان بن رہی تھی۔ میں ذرا دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ بے شک اسے دیکھنے کے بعد اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی پچیس چھبیس برس کی عورت نظر آتی تھی۔ دوشیزہ نہیں کہوں گا کیونکہ میری معلومات کے مطابق پہلے ہی وہ شادی شدہ تھی۔ اب بیوہ ہو چکی تھی۔ عمر اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئی تھی۔ وہ ایسی تیز طرار تھی کہ مدلل بحث اور شعلہ بیانی کے باعث عدالت کا زلزلہ کہلاتی تھی۔ اس کی مخالفت میں بحث کرنے والے بیرسٹر اس سے حسد کرتے تھے اور اسے نیچا دکھانے کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔ ایسی عورت دوشیزہ نہیں کہلا سکتی تھی۔

وہ بدستور کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بولی۔ "مجھے جی بھر کر دیکھ لیا ہو تو اندر آ جاؤ۔"

میں چونک گیا۔ جلدی سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "شاید مجھے اور دیر سے آنا چاہئے تھا۔ تم بہت مصروف نظر آ رہی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم .... تم

مجھے تم کہہ کر مخاطب کر رہے ہو' جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"یوں تو تمہیں بھی جاننا چاہئے تھا کہ میں کون ہوں۔ سب سے پہلے تم نے مجھے تم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

وہ بولی۔ "آج تک مجھے کسی نے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ میرا نام لیلیٰ ہے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو' رومانی داستان اس بات کی گواہ ہے کہ لیلیٰ کو ہمیشہ تم کہا گیا ہے۔ آپ کسی نے نہیں کہا۔"

"میں نے سنا تھا کہ تم ڈھیٹ بھی ہو اور بدتمیز بھی۔"

"اگر کوئی مجھے بدتمیزی پر مجبور نہ کرے تو میں نہایت ہی شریف انسان ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔ اپنی عزت کرانے کے لئے پہلے دوسروں کی عزت کرنی پڑتی ہے۔"

وہ تھوڑی دیر تک مجھے گھور کر دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم نے مجھے بلایا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا ہے' میں قانون سے کھیلنا بھی جانتی ہوں اور قانون سے کھیلنے والوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانا بھی جانتی ہوں۔ ابھی اس الزام میں تمہیں گرفتار کروا سکتی ہوں کہ تم چوری کی نیت سے میرے گھر میں گھس آئے ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس نیک کام میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ وہ رہا تمہارا ٹیلیفون ریسیور اٹھاؤ اور پولیس کو بلا لو۔"

اس نے آگے بڑھ کر ریسیور کو اٹھایا پھر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس دوران وہ مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے ریسیور کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو' ایس ایچ او جی میں لیلیٰ محسن بول رہی ہوں۔ میری کوٹھی میں ایک چور گھس آیا ہے۔ میں نے اسے ریوالور کی زد میں لے رکھا ہے۔ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔ اسے حراست میں لے لیں' جی جی ہاں' شکریہ۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دراز کو کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا پستول نکالا پھر میرا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ "اب بولو۔ سنا ہے کہ تم بہت چالاک انسان ہو اور مصیبتوں میں گھر کر بھی اپنا بچاؤ کر لیتے ہو۔ پولیس والوں سے جھگڑا مول لیتے ہو اور ان کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہو۔ ان کے کیس کا رخ کہیں سے کہیں موڑ دیتے ہو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم اپنے اس کیس کا رُخ کس طرح موڑو گے۔"

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "پولیس والے آئیں گے نہ کوئی کیس بنے

"کیا مطلب؟"

"مطلب' یہ کہ تم جب ریسیور اٹھا کر بات کر رہی تھیں تو وہ ریسیور گونگا اور بہرہ
نہ اِدھر کی آواز اُدھر گئی نہ اُدھر کی آواز اِدھر آئی۔"

اس نے شدید حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم تو اتنی
کھڑے ہوئے ہو۔"

"بے شک میں دور کھڑا ہوں مگر نظریں بہت دُور جاتی ہیں۔ میں تمہارے پیچھے دیکھ
ٹیلی فون کا پلگ اس دیوار کے کنکشن بورڈ سے الگ ہے۔"

اس نے اپنی کرسی کے پیچھے دیوار سے لگے ہوئے کنکشن بورڈ کو دیکھا پھر اطمینان
گہری سانس لیتے ہوئے سر ہلا کر بولی۔ "ٹھیک ہے' تم حاضر دماغ ہو۔ اچھا یہ بتاؤ اگر
سچ مچ فون کر دیتی اور پولیس والے یہاں آ جاتے تو تم الزام سے کس طرح بچ سکتے
۔ کیونکہ تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں نے تمہیں یہاں بلایا
میرے پاس بہت قیمتی قانونی مسودے ہوتے ہیں اور تمہارے جیسے لوگ ایسے قیمتی
مسودوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ میں ثابت کر سکتی ہوں کہ تم یہاں چوری کی نیت
آئے تھے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے' میں کوئی ننھا بچہ نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ایک کیسٹ نکال کر اس کی طرف
تے ہوئے کہا۔ "اس کیسٹ میں تمہارے سوال کا جواب موجود ہے۔"

"اس میں کیا ہے؟"

"مجھ سے نہ پوچھو۔ کیسٹ ریکارڈر میں اسے لگاؤ اور سن لو۔"

اس نے ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ پھر اسے کیسٹ ریکارڈر لانے کے لئے کہا۔
ی دیر بعد ریکارڈر آ گیا۔ اس نے کیسٹ کو اس میں سیٹ کرنے کے بعد آن کیا۔
رے ہی لمحے میری آواز سنائی دی۔

"ہیلو' میں ابن شہاب بول رہا ہوں اور آپ کی تعریف؟"

جواب میں لیلیٰ محسن کی آواز سنائی دی۔ "میں بیرسٹر لیلیٰ محسن بول رہی ہوں۔ شاید
رے نام سے واقف ہو۔"

"جی ہاں۔ بڑا نام ہے' یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آواز بھی سن رہا ہوں۔

فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں تم سے ایک ضروری کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرا کام کر سکتے ہو؟"

"ضرور کر سکتا ہوں۔ میرا کام ہی یہ ہے۔ معقول معاوضہ ملے تو میں جان کی با کر خطرات میں کود جاتا ہوں۔ اتنا تو آپ نے سنا ہی ہو گا ورنہ کبھی فون نہ کرتیں۔"

"ہاں' میں نے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ آج رات ایک بجے کے بعد وقت بھی میری کوٹھی میں چلے آؤ۔ میں تم سے ضروری باتیں کروں گی۔"

"میں یہ سن کر حیران ہو رہا ہوں کہ آپ مجھے رات کے ایک بجے کے بعد ہیں۔ یہ ملاقات کا وقت نہیں ہوتا ہے۔"

"ہاں' میں جانتی ہوں لیکن میں ایک کیس کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں بڑی سٹڈی کرنی پڑتی ہے۔ آج میں تمام رات جاگتی رہوں گی۔ ایک بجے تک اپنا کام کر لوں گی۔ اس کے بعد تم کسی وقت بھی مجھ سے ملاقات کر سکتے ہو۔ میرا پتہ نوٹ باغِ ارم' اسٹریٹ نمبر بارہ' کوٹھی نمبر ڈی پانچ۔"

"اچھی بات ہے۔ میں نے نوٹ کر لیا ہے اور میں آپ کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق پہنچ جاؤں گا۔"

لیلیٰ نے شکریہ کہا۔ اس کے ساتھ ہی ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔ فون کا منقطع ہو گیا۔ لیلیٰ نے کیسٹ ریکارڈر کو بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "جیسا سنا تھا ویسا ہی تمہیں پا رہی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس فون کال کو ریکارڈ کیوں کیا؟ کیا تم اکثر ایسا کرتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "میرے ریسیور کے ساتھ ایک آلہ منسلک ہے۔ اس آلے کا دوسرا سرا میرے ایک چھوٹے سے کیسٹ ریکارڈر سے لگا ہوا ہے۔ میں کال ریکارڈ کرتا ہوں۔ جب باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ رکھنا ضروری نہیں ہے تو میں کیسٹ سے اسے مٹا دیتا ہوں۔ چونکہ تم نے مجھے رات ایک بجے کے بعد بلایا تھا اور یہ بات غیر معمولی تھی اس لئے میں نے اسے ریکارڈ کیا"

لیلیٰ نے کیسٹ کو ریکارڈر سے نکال کر پستول میری طرف دکھاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اس کیسٹ کی آواز کو مٹا دوں تو تمہارے پاس کیا ثبوت رہ جائے گا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شاید تم نے کیسٹ سے ابھرنے والی آواز کی کوالٹی

کیا۔ یہ اصل کیسٹ کی نقل ہے جو میرے سیف میں بند ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے قریب آئی۔ پھر مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے "شاباش' تم نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ اب میں اطمینان سے اس کیس کے متعلق گو کر سکوں گی۔"

میں نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا' پھر ہم دونوں میز کے اطراف کرسیوں پہ بیٹھ ۔ اس نے ملازم کو بلا کر چائے لانے کے لئے کہا۔ پھر اس کے جانے کے بعد بولنے "ہمارے ملک میں پرائیویٹ سراغ رسانی کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لئے تم گمنام تے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ نہ تو تمہارے پاس اپنی کار ہے نہ کوٹھی۔ کسی کرائے کے ے میں رہتے ہو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے متعلق بڑی معلومات حاصل کی ہیں جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے۔"

"میں ایک ٹیم بنانا چاہتی ہوں۔ ایسی ٹیم جس میں میں بیرسٹر رہوں' تم جاسوس رہو ر اسی سلسلے کے دو چار ذہین اور باصلاحیت افراد کو اس ٹیم میں شامل کیا جائے۔ یہ بات رے دماغ میں اس طرح پیدا ہوئی کہ اکثر کیسوں کے دوران میں یہ دیکھتی ہوں کہ جو ل مجرم ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی ہتھکنڈے سے بچ جاتا ہے۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ تا۔ بعض حالات میں مجرم کو غیر قانونی طور سے سزا دینی پڑتی ہے۔ یہ سزا قانون نہیں ے سکتا' ہم دے سکتے ہیں۔ اس مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ معاشرے کے لئے ایک نیک کام ہو گا۔ اگرچہ غیر قانونی ہو گا لیکن قانون ہمارے آڑے آیا تو میں تم لوں کی طرف سے مقدمہ لڑوں گی اور میں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں کہ ایسی کوئی بھاوے کی بات ہوئی تو میں قانون کی گرفت سے تم لوگوں کو صاف نکال لاؤں گی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو بہت اچھی پلاننگ ہے۔ اکثر پولیس والے مجھے دالت میں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ ایسے وقت مجھے اپنے لئے ایک وکیل کی ضرورت ڑتی آتی ہے۔ اب میں اس فکر سے نجات پا لوں گا۔ میرا جو بھی کیس ہو گا' اب اسے تم ہینڈل کیا کرو گی۔"

ملازم چائے لے کر آیا' پھر میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "بائی دا وے تم نے کہا تھا کہ بعض مجرموں کے آگے قانون بے بس ہوتا ہے۔ کیا قانون کی بے بسی کی وجہ یہ ہیں ہے کہ آپ جیسی قابل بیرسٹر مجرموں کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ مقدمے ایسے پہلو سے پیش کرتی ہیں کہ قانون اندھیرے میں رہتا ہے اور آپ مقدمہ جیت لیتی ہیں۔"

وہ تائید میں سرہلا کر بولی۔ "ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ میرے پاس کئی کیس آئے ہ
جن میں میرا مؤکل مجرم ہوتا ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے لیکن میں اس سے لاکھوں رو
لے کر اسے سزا سے بچا لیتی ہوں۔ بعد میں میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ جو ظالم تھا
تو دولت کے بل پر جیت کر چلا گیا اور جو مظلوم تھا اور وہ زیادہ مظلوم ہو گیا۔ میں نے ا
کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ ایسے ہی احساسات نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اپنی ایسی ایک
بناؤں۔ جس میں تمہارے جیسے باصلاحیت لوگ ہوں۔ میں ایک طرف اگر کسی مجرم دول
مند کا مقدمہ پیش کروں گی اور اسے فتح مند بھی بنا دوں گی تاہم دوسری طرف تم لو
اس کے خلاف قدم اٹھاؤ گے اور قانون سے الگ اپنی ایک ذاتی عدالت قائم کرو گے
اس میں عدالت کا کوئی کمرہ نہیں ہو گا لیکن قانون کی ایک کتاب ہو گی اور وہ دین اسا
کی کتاب ہے۔ ہم اس کی روشنی میں فیصلہ کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ جس مجرم
عدالت کے کٹہرے میں پہنچ کر بھی سزا نہیں ملتی اور جس کے متعلق ہم چشم دید گواہ ہو
گے کہ وہ مجرم ہے اور سزا کے قابل ہے تو ہم' وہ چور ہو گا تو ہاتھ کاٹیں گے۔ زانی ہو گا
اسے سنگسار کریں گے۔ جو ہماری دینی کتاب کہے گی۔ اس کے مطابق اس کا محاسبہ کر
رہیں گے۔"

"کیا ایسا کوئی مجرم ابھی نظروں میں ہے جس کا ہم محاسبہ کریں؟"

"ایک نہیں ہزاروں مجرم ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ہزاروں ہیں۔ جو راتو
رات دولت مند بن جاتے ہیں۔ یہ اچانک دولت کہاں سے آجاتی ہے؟ قانون ان
نہیں پوچھتا مگر ہم پوچھیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "پوچھنے کا طریقہ کار کیا ہو گیا؟"

وہ چائے کی پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ پینے کے بعد بولی۔ "ہم ہر دولت مند کے گھ
میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے کہ وہ دولت کہاں سے آتی ہے لیکن ایسے لوگ جو ہم جی
قانون داں سے یا تمہارے جیسے سراغ رسانوں سے ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔ جو ٹکرا جا
گا۔ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔ اس کا پوری طرح محاسبہ کریں گے اور اسے اس کی س
تک پہنچائیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "ہماری ٹیم کے اندرونی انتظامات کیسے ہوں گے۔ یعنی کہ جو لوگ
ہمارے لیے کام کریں گے یا میں خود تمہارے لیے کام کروں گا' تو کیا ہمیں تنخواہیں د
جائیں گی؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ میں کبھی تنخواہ دار ملازم
پسند نہیں کرتا۔"

وہ پیالی سے دوسرا گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔ "میں خدا کے فضل سے بہت خوش حال
ہوں۔ میری آمدنی اتنی ہے کہ تم کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ مجھے دولت کی
ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی شہرت چاہیے۔ شہرت بھی مجھے کافی مل چکی ہے۔ میں تو
صرف اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے اور چھپے ہوئے مجرموں کو ان کی سزا تک پہنچانے کے
لیے ایک ٹیم بنانا چاہتی ہوں اور اس ٹیم کے اخراجات میں اس وقت تک برداشت کرتی
رہوں گی۔ جب تک تم لوگوں کو ذاتی طور پر اپنی آمدنی حاصل نہ ہو۔ یا کوئی کیس تمہیں
نہ ملے۔ ویسے میرے پاس بہتیرے کیس پڑے رہتے ہیں۔ تم لوگ کبھی خالی نہیں بیٹھو گے
میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ٹیم کے سربراہ رہو گے۔ تم اپنی مرضی سے اپنے
کارندوں کا انتخاب کرو گے اور جو کیس تمہارے پاس آئے گا۔ اسے اپنے طور پر ہینڈل
کرو گے۔ جب کوئی الجھن پیدا ہو گی یا تم دیکھو گے کہ قانون کی گرفت میں آرہے ہو تو
پھر میں ڈھال بن کر سامنے آجاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس مقصد کے لیے ایک جگہ کی ضرورت ہو گی۔ جگہ ملے گی تو
چار دیواری اور چھت کی ضرورت ہو گی۔ جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو پولیس والے
پوچھیں گے ہم اس چھت کے نیچے کیا کر رہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ سپرہائی وے کی طرف ایک نئی بستی بسائی
جا رہی ہے۔ وہاں میں نے دو ہزار گز کے پلاٹ پر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کاٹیج بنایا ہے۔
ارادہ تھا کہ جب آبادی مکمل ہو جائے گی تو وہاں کوٹھی بنواؤں گی۔ فی الحال اس کاٹیج کو تم
استعمال کر سکتے ہو۔ وہاں تمہاری ٹیم کے ممبر تم سے ملاقات کر سکتے ہیں اور وہیں ساری
پلاننگ ہو سکتی ہے اور اس کو تم اپنا دفتر بنا سکتے ہو۔ رہ گیا پولیس والوں کا معاملہ تو تم اس
کاٹیج کے سامنے کوئی بڑا سا بورڈ آویزاں کر دینا جس سے ظاہر ہو کہ تم کوئی کاروبار کر رہے
ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کس نام سے وہاں اپنی سراغرسانی جاری رکھ سکو گے؟"

میں نے دو چار گھونٹ چائے کے پیئے کچھ دیر سوچتا رہا پھر جواب دیا۔ "میرے اس
دفتر کا نام ہو گا شہاب کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی۔"

وہ مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب یہ کہ جو مجرم قانون کے ہتھے نہیں چڑھتے ہیں ہم انہیں کلیئر (واضح) کریں
گے۔ پھر انہیں اللہ میاں کی طرف فارورڈ کریں گے۔"

وہ قہقہے لگانے لگی۔ میں نے اسے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہنستے
وقت کتنی حسین لگتی ہو۔"

اچانک ہی اس کے قہقہوں کو بریک لگ گئے۔ وہ بولی۔ "اے مجھ سے فری ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

"جس سے میرا دل لگتا ہے میں اس سے دل لگی ضرور کرتا ہوں۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔"

"میں بچپن سے بڑے سائز کی چیزیں پسند کرتا آیا ہوں۔ ایک بار بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ کسی کے ہاں مہمان کے طور پر گیا۔ میرے والدین اور میزبان وغیرہ جتنے بزرگ تھے' وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں ان کی صاحبزادی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں مجھے بڑے سائز کے جوتے نظر آئے' میں نے انہیں پہن لیا اور گرتے پڑتے کسی طرح سنبھلتے ہوئے وہاں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ میزبان نے مجھے بڑے سائز کے جوتے پہنے دیکھا تو ہنستے ہوئے پوچھا۔ "ارے یہ کس کے جوتے پہن رکھے ہیں؟" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "انکل یہ آپ ہی کے جوتے ہیں۔ باجی کے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔" میری بات سن کر وہ چونکے پھر فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی بیٹی کے کمرے میں گئے۔ جس کے جوتے تھے وہ چور پکڑا گیا۔ یہ میرا پہلا جاسوسی کارنامہ تھا۔ چونکہ آئندہ بھی چوری کا اندیشہ تھا اس لئے ہمارے میزبان نے اپنی بیٹی کی شادی اس چور سے کر دی۔"

وہ مسکرانے لگی اور کہنے لگی۔ "تمہارے بچپن کا واقعہ ختم ہو چکا ہو تو اب کام کی باتیں کی جائیں۔"

"ضرور میرے لائق کوئی اور کام کی بات ہے؟"

"ہاں' کل صبح دس بجے تم اس شہر کے بہت بڑے رئیس نثار چنگیزی سے ملاقات کرو گے۔ یہ رہا اُن کا پتہ۔"

اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔ میں اس پر لکھے ہوئے پتے کو پڑھنے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ "یہ ایک وصیت نامہ اپنی زندگی میں تیار کر چکے ہیں اور اس وصیت نامے کو تمہارے پاس امانت کے طور پر رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "میرے پاس کیوں؟ بڑے لوگ اپنی لکھی ہوئی وصیت اپنے وکیلوں کے پاس حفاظت کے لئے رکھتے ہیں۔ وصیت نامہ اصولاً تمہارے پاس رہنا چاہئے۔"

"ہاں' مگر میں یہ ذمہ داری قبول نہیں کروں گی۔ کیونکہ وہ وصیت جن لوگوں کے خلاف جاتی ہے وہ لوگ نثار احمد چنگیزی کو اکثر پریشان کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے بھی پریشان

ں گے۔ نثار احمد چنگیزی کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ دھمکیاں کون رہا ہے یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے اور تم اسی طرح معلوم کر سکتے ہو کہ اس وصیت کو امانت کے طور پر رکھ کر دشمن کو اپنے پیچھے لگا سکتے ہو۔"

"اچھا تو کل سے نثار احمد چنگیزی میرا مؤکل ہو گا۔ اس کے متعلق کچھ معلومات م کر سکتی ہو؟"

"ایک رئیس آدمی کے متعلق کیا معلومات ہو سکتی ہیں۔ وہ شرابی ہے اور بڑا عیاش ۔ آج تک شادی نہیں کی۔ میں نے اس کے وصیت نامے کا ڈرافٹ تیار کیا تھا۔ اس ت نامے سے اندازہ ہوا کہ وہ فلرٹ کرتا ہے۔ لڑکیوں کو پھانستا ہے۔ جھوٹے وعدے ا ہے۔ ان سے کھیلتا ہے۔ پھر ان سے منہ پھیر لیتا ہے اور اپنے وعدے سے مکر جاتا ۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے اس لئے میں اس کے معاملات سے دور رہنا چاہتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "اس وصیت نامے کا مضمون کیا تھا؟ یونہی کچھ خاکہ یاد ہو تو سناؤ۔"

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی۔ "وہ وصیت نامہ کسی سائرہ بانو کے حق میں ہے۔ میں لکھا ہے کہ اب سے پہلے نثار احمد نے کسی زرینہ بیگم کے نام وصیت لکھی تھی کہ احمد چنگیزی کے مرنے کے بعد زرینہ بیگم اور اس سے ہونے والی اولاد اس کی جائیداد وارث بنے گی اور اب جو سائرہ بانو کے حق میں وصیت لکھی گئی ہے اور جو وصیت ں حفاظت کے لئے دی جائے گی۔ اس میں یہی لکھا ہوا ہے کہ پہلی وصیت کو منسوخ جاتا ہے اور نئی وصیت کی رُو سے سائرہ بانو اور سائرہ بانو سے اس کی جو اولاد ہو گی وہ کی جائیداد کی حقدار ہو گی۔"

میں نے پوچھا۔ "جب وہ پہلی وصیت کو منسوخ کر رہا ہے تو باقاعدہ قانونی کارروائی تے ہوئے عدالت کے ذریعے وہ پہلی وصیت کو کیوں نہیں منسوخ کرنا چاہتا؟"

لیلیٰ محسن نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ اگر وہ زرینہ بیگم کے نام کی ہوئی وصیت کو زندگی میں منسوخ کرے گا تو زرینہ بیگم اور اس کے خاندان والے اس کے مخالف ہو ں گے اور وہ کہتا ہے کہ زرینہ بیگم کے دو چار بھائی ایسے ہیں جو غنڈے اور بدمعاش قاتل بھی ہیں۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لئے ابھی وہ کوئی قانونی کارروائی نہیں چاہتا۔ اس کی موت کے بعد نئی وصیت کی رُو سے پرانی وصیت منسوخ ہو جائے "

"وہ پرانی وصیت کیوں منسوخ کر رہا ہے؟ زرینہ بیگم کا مخالف کیوں بن گیا ہے؟"

"میں نے یہ سوال اس سے کیا تھا' اس نے جواب دیا کہ شادی سے پہلے ہی زرینہ

بیگم کے والدین نے ایک تحریری معاہدہ کیا تھا۔ اس سے لکھوایا تھا کہ شادی کے بعد زرینہ بیگم اس کے بچوں کی ماں بنے گی اور اپنے بچوں سمیت اس کی موت کے بعد اس کی دولت اور جائیداد کی وارث بنے گی لیکن شادی کے بعد زرینہ اپنے معاہدے سے پھر گئی۔ اسے اپنے حسن و شباب کو بحال رکھنے کا اس قدر خیال ہے کہ وہ اس کے بچے کی ماں نہیں بننا چاہتی۔ اس لئے وہ اسے اپنی جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہے اور اسی لئے اس نے پرانی وصیت کو منسوخ کیا ہے۔"

"اس کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ تم زرینہ بیگم کو تلاش کرو اور صداقت تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں کل صبح دس بجے چنگیزی صاحب سے ملاقات کروں گا۔"

وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "کل ایک بجے میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ پھر تمہیں سپرہائی وے کی اس نئی بستی کی طرف لے جاؤں گی جہاں میرا کاٹیج ہے۔ میں اس کی چابی تمہارے حوالے کروں گی۔ وہاں تم اپنا دفتر قائم کر لینا۔ ٹھیک ہے!"

میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے مصافحہ کرنے کے دوران پوچھا۔ "ویسے تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہی ابن شہاب۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولی۔ "شہاب تو تمہارے والد کا نام ہوا' تمہارا اپنا نام کیا ہے؟ لوگ تو ابن جلال' ابن رحیم' ابن کریم ہوتے ہیں لیکن ان کے اپنے نام بھی تو ہوتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "میں اپنا اصلی نام تمہیں بتاؤں گا تو یقین نہیں کرو گی۔"

"کیا بہت ہی خوفناک قسم کا نام ہے؟"

"نہیں' بہت ہی خوبصورت نام ہے۔"

لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔ "تو پھر جلدی بتاؤ۔"

"مجنوں۔"

یہ کہہ کر میں فوراً ہی پلٹ گیا۔ اپنے نام کا ردعمل معلوم کئے بغیر تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے سے باہر آ گیا۔

☆======☆======☆

دوسری صبح ٹھیک دس بجے میں نثار احمد چنگیزی کی کوٹھی پہنچ گیا۔ ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بتایا کہ صاحب بہادر سو رہے ہیں۔ میں ابن شہاب ہوں۔ وہ ابن رئیس تھا۔ اس لئے وہ دن چڑھے تک سوتا تھا۔ بہرحال آدھے گھنٹے انتظار کرنے کے بعد آیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "سو سوری مسٹر ابن شہاب' آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ میرا نام نثار احمد چنگیزی ہے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ وہ مجھے ڈائننگ روم میں لے آیا۔ مجھ سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا لیکن میں نے چائے پر اکتفا کیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں نے بیرسٹر لیلیٰ محسن سے کہا تھا کہ وہ کسی ایسے آدمی کو میرے پاس بھیجے جو میری وصیت کی حفاظت کر سکے۔ انہوں نے میرے سامنے آپ کا نام تجویز کیا۔ میں نے آپ کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے کام آئیں گے۔" وہ تھوڑی دیر منہ چلاتا رہا پھر بولا۔ "میں آپ کو اس کام کے پچیس ہزار روپے دوں گا۔"

میں دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "دس ہزار روپے ابھی آپ مجھ سے لے جائیں۔ باقی پندرہ ہزار میری موت کے بعد آپ کو اس وقت ملیں گے جب میری وصیت پڑھی جائے گی۔ میں نے وصیت میں لکھ دیا ہے کہ آپ کو پندرہ ہزار روپے ادا کر دیئے جائیں۔"

میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوچا۔ پتہ نہیں یہ کب مرے گا۔ میرے پندرہ ہزار روپے اٹکے رہیں گے۔ میں نے پوچھا۔ "سنا ہے کہ کچھ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔"

وہ بولا۔ "ظاہر ہے جن کے خلاف وصیت جائے گی وہ تو میرے دشمن ضرور بنیں گے۔"

"کیا آپ ایسے لوگوں کی فہرست دے سکتے ہیں جن سے آپ کو خطرہ لاحق ہے۔"

وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "فضول ہے' میں کسی پر شبہ کر کے کیا کروں گا۔ اگر کوئی مجھے چھیڑے گا۔ مجھے نقصان پہنچانا چاہے گا تو وہ خود ہی میرے سامنے آ جائے گا۔ پھر میں سب کے سامنے اس پر انگلی اٹھا سکوں گا۔"

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ کو انگلی اٹھانے کے قابل ہی نہ رکھے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "دیکھا جائے گا۔ ابھی میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ اسی لئے تو

ابھی میں نے زرینہ بیگم کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ اس سے نئے ہوئے معاہدے کو منسوخ نہیں کیا۔ موجودہ وصیت کی رُو سے سارے پچھلے معاہدے خود ہی منسوخ ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "جب میں یہاں آ رہا تھا تو ایک کار میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے یہاں کوٹھی کے سامنے سے جیسے ہی ٹیکسی سے اتر کر دیکھا تو وہ کار غائب ہو چکی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا تعاقب کیا گیا ہے۔"

نثار احمد چنگیزی نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "یقیناً تعاقب کیا گیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے دوستوں' عزیزوں' رشتہ داروں میں یہ بات پھیلا دی ہے کہ آج میں ایک شخص کو اپنا وصیت نامہ دینے والا ہوں۔ وہ وصیت نامہ اس شخص کے پاس میری موت تک محفوظ رہے گا۔"

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"ایسا کرنے کے لئے بیرسٹر لیلیٰ نے مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ دشمن آپ کا پیچھا کریں گے تو آپ ان کے پیچھے لگ جائیں گے۔"

میں تائید میں سرہلا کر خاموش رہا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مجھے اپنی خواب گاہ لے گیا۔ وہاں کا ہر کمرہ اتنے قیمتی سامان سے آراستہ تھا کہ بس آنکھیں دیکھتی ہی رہ جاتی تھیں۔ خواب گاہ کے اندر شیشے کی بڑی الماری میں شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک الماری کھول کر بریف کیس نکالا اور میرے سامنے بستر پر رکھ دیا' پھر کہا۔ "اس کی ایک چابی میرے پاس ہے' دوسری چابی بیرسٹر لیلیٰ محسن کے پاس ہے۔ تیسرا یہ بریف کیس آپ کے پاس ہو گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ بریف کیس دشمنوں کے پاس رہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ اس بریف کیس کو کھولئے' اس میں جو وصیت نامہ ہے اسے نکال کر میں اپنے لباس میں چھپا لوں گا اور اس بریف کیس میں خالی کاغذات رکھ کر لے جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ دشمن جو میرا پیچھا کر رہے ہیں وہ اس بریف کیس کو حاصل کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ اور میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے ان کے حوالے کر دوں گا۔"

"کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ وہ بریف کیس چھین کر لے جائیں۔"

اگر وہ چھین کر نہ لے گئے تو سمجھ جایئے گا کہ آپ کے وصیت نامے کی کوئی اہمیت

ں ہے۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر تائید میں سرہلا کر چابی نکالی اور بریف کیس کو کھول
۔ اس کے اندر ایک بڑا سا سربمہر لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اسے میں نے اٹھا کر اپنے کوٹ کے
ر رکھ لیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ "آپ کی موجودہ شریک حیات سائرہ بانو ان دنوں کہاں
ں؟"

وہ بولا۔ "وہ اپنے میکے صدیق آباد میں ہے۔ یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "او سوری' مجھے تو زرینہ بیگم کے بارے میں پوچھنا چاہئے۔ کیا آپ
ے ان کا پتہ بتائیں گے؟"

"لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ڈیوٹی صرف اتنی ہے کہ
رے اس وصیت نامے کو حفاظت سے رکھیں اور دشمنوں کے ہاتھ نہ لگنے دیں۔ اس کا
اوضہ آپ کو پچیس ہزار روپے ملے گا۔ پھر آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے
ے۔"

"میرا کام سراغرسانی بھی ہے اور سراغرسانی میں صرف آم ہی نہیں کھائے جاتے پیڑ
ی گنے جاتے ہیں۔ ویسے آپ کی مرضی نہ بتائیں میں زرینہ بیگم تک پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے رخصتی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مسکرا کر مصافحہ کرتے
ئے کہا۔ "آپ شاید ناراض ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو زرینہ کا پتہ بتا دیتا ہوں۔ وہ نیو
وئی کی سبز کوٹھی میں رہتی ہے۔ کوٹھی نمبر 80-L ہے۔"

میں نے شکریہ کہتے ہوئے بریف کیس کو اٹھا لیا۔ اس دوران اس بریف کیس میں
ھ خالی کاغذات بھر دیئے گئے تھے۔ وہ مجھے کوٹھی کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ پھر دور
ھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "سامنے سڑک پر اتنی چہل پہل ہے کہ نگرانی کرنے والوں کا
نہیں چلتا۔"

میں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں' میں نگرانی کرنے اور تعاقب کرنے والوں کا پتہ چلا
ں گا۔"

میں اس سے رخصت ہو کر کوٹھی کے احاطے کے باہر آیا' پھر سڑک کے کنارے
ھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر
ھ کر لیلیٰ کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ بارہ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے اور اس
نے ایک بجے ملاقات کرنے کے لئے کہا تھا۔ راستے میں میں نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا'
تنی ہی گاڑیاں آ رہی تھیں اور ہمیں اوور ٹیک کر کے گزر رہی تھیں۔ کوئی ایک رنگ

ایک ماڈل کی گاڑی مسلسل نظر نہیں آئی۔ کسی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔' مجھے بڑی مایوسی ہو رہی تھی۔

ٹھیک ایک بجے میں لیلیٰ کی کوٹھی پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولی۔ "تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "شادی سے پہلے مرد ہمیشہ وقت پر ملاقات کرنے آتے ہیں۔"

وہ مجھے گھور کر بولی۔ "شادی کے بعد اور شادی سے پہلے کا کیا قصہ ہے۔ تم فضول باتوں سے باز نہیں آؤ گے؟"

ہم دونوں کوٹھی کے باہر آئے۔ پورچ میں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا' کار اسٹارٹ کی۔ پھر ہم اس کوٹھی کے احاطے سے نکل کر سپرہائی وے کی طرف جانے لگے۔ میں نے کہا۔ "مجھے مایوسی ہو رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "اگر یہ کوئی فضول بات نہ ہو تو مجھے اپنی اس بات کا مطلب سمجھاؤ۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بریف کیس کو لینے کے لئے کوئی بھی نہیں آیا۔ کسی کو میرا پیچھا کرنا چاہئے تھا۔ میرا راستہ روکنا چاہئے تھا مگر اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ویسے میں مروت میں مارا گیا ہوں۔"

"اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"مطلب یہ ہوا کہ نثار احمد چنگیزی نے مجھے ابھی دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں رخصت ہونے تک اسی انتظار میں رہا کہ وہ مجھے رقم ادا کرے گا لیکن اس نے ادائیگی کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ میں چپ چاپ چلا آیا۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے نثار احمد چنگیزی کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ شام تک دس ہزار روپے پہنچا دے گا۔ تم میرے پاس آ کر لے جانا۔ وہ بھول گیا تھا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔ "وہ مارا۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "توبہ ہے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ہر بات کا مطلب پوچھنا پڑتا ہے' وہ مارا کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب یہ ہوا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ میں پچھلے دس منٹ سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک نیلے رنگ کی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ ذرا تم اپنی گاڑی کسی راستے پر موڑ دو۔ پھر اس راستے پر چلی آنا۔ اس طرح تعاقب کرنے والے کی

دیق ہو جائے گی۔"

اس نے میرے مشورے پر عمل کیا۔ ایک راستے پر گاڑی موڑ لی۔ پھر مختلف استوں سے گزرتے ہوئے دوبارہ اسی مین روڈ پر آ گئی۔ وہ نیلی گاڑی مسلسل ہمارا پیچھا ر رہی تھی۔ ہم جتنے راستوں پر گھومتے ہوئے آئے اتنے ہی راستوں سے وہ بھی گزرتی ہی۔ لیلیٰ نے کہا۔ "وہ آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ آ رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "میں گاڑی کے لئے کہہ رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں گاڑی چلانے والے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ "تم صرف کام کی باتیں کیا کرو۔"

"تو پھر تم ایک کام کی بات بتاؤ۔ تم نے ابھی تک دوسری شادی کیوں نہیں کی؟"

وہ ناگواری سے بولی۔ "موجودہ کیس میں میری شادی کا ذکر کیوں آ گیا۔ یہ کوئی کام لی بات ہے۔"

"بالکل کام کی بات ہے' میں اس پہلو سے بھی سوچ سکتا ہوں کہ نثار احمد چنگیزی نے جو وصیت نامہ ابھی تیار کیا ہے وہ شاید تمہارے نام ہو اور آئندہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہو۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں ہے' میں جاسوس ہوں اور میں ایک تصویر کو کتنے ہی پہلوؤں سے دیکھتا ہوں۔ کیا میرے کیس میں یہ پہلو سوچنے کے غور کرنے کے قابل نہیں ہے کہ تم نے دوسری شادی نہیں کی اور چنگیزی شادی پر شادیاں کرتا چلا آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زرینہ اور سائرہ کے بعد تیسرا نمبر تمہارا ہو۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر اس نے پوچھا۔ "کیا تم سنجیدگی سے ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بے شک میں سنجیدہ ہوں۔"

اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تم غلط سوچ رہے ہو۔ اس پہلو پر غور نہ کرو۔ میرا اس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔ اسی لئے میں نے اس کا کیس تمہارے حوالے کیا ہے۔"

ہم سپرہائی وے کی نئی آبادی میں پہنچ گئے۔ اس کا کاٹیج ایک جھیل کے کنارے تھا' بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ عاشق مزاج لوگوں کے لئے بڑا ہی رومان پرور ماحول تھا۔

میں لیلیٰ کو پھر چھیڑنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ شاید میری باتوں پر بُرا مان گئی تھی۔

اس نے پرس سے چابی نکال کر کاٹیج کا دروازہ کھولا۔ پھر مجھے کاٹیج کا اندرونی حصہ دکھانے لگی۔ وہاں ضروریات کی بہت چیزیں تھیں۔ مثلاً میز' کرسی' سونے کے لئے بستر اور پکانے کے لئے برتن وغیرہ۔ وہاں ابھی تک بجلی کی لائن نہیں آئی تھی اور نہ ہی ٹیلیفون کے تار پہنچائے گئے تھے۔ اس لئے ان چیزوں کی کمی تھی۔ اس نے کہا۔ "فی الحال کیروسین لیمپ جلا کر رات کو یہاں رہا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کون کمبخت اس اندھیری بستی میں رات کو رہے گا۔ میں دن کو آؤں گا اور دن ہی کو واپس چلا جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ یہ لو چابی۔ اب بتاؤ یہاں ابھی رہو گے یا واپس جاؤ گے؟"

میں نے کاٹیج کے دروازے کو مقفل کیا پھر واپس جانے کے لئے اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسٹیئرنگ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "بتاؤ میں تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟"

میں نے کہا۔ "نیو کالونی زرینہ بیگم سے ملنے جانا ہے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "کیا میں تمہاری کوئی ملازمہ ہوں کہ تمہیں وہاں پہنچاؤں گی۔ تم آگے کہیں گاڑی سے اتر کر ٹیکسی میں چلے جانا۔"

میں نے کہا۔ "تم انگارے چبا رہی ہو۔" اس نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے اسے آگے بڑھا دیا۔ میں نے کہا۔ "انسان حقیقت کو برداشت نہیں کرتا۔"

اس نے چڑ کر پوچھا۔ "کیسی حقیقت؟"

"یہی کہ اگر میں تمہیں حسین کہتا ہوں تو تم بُرا مانتی ہو۔ جبکہ میں تمہیں بدصورت نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی تم بدصورت ہو۔ میں تم کو جوان کہتا ہوں تو اس بات پر بھی چڑتی ہو۔ تم نے دوسری شادی نہیں کی۔ میں دوسری شادی کے متعلق پوچھتا ہوں تو وہ بات بھی تمہیں بُری لگتی ہے۔ آخر تمہیں اچھی بات کون سی لگتی ہے؟"

"یہی کہ میرے ذاتی معاملات پر گفتگو نہ کی جائے۔"

"جب عورت اپنے گھر کی ہو۔ اپنے شوہر کی ہو تو اس کے معاملات میں کوئی کچھ نہیں بولتا لیکن وہ شادی شدہ نہ ہو یا بیوہ ہو تو دوسرے مرد ضرور دلچسپی لیں گے۔ اگر میں نے چنگیزی کے متعلق تم سے کچھ کہا تو بُرا نہیں ماننا چاہئے۔ کیونکہ صرف چنگیزی ہی نہیں' مجھ جیسے نوجوان بھی تم سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں لے رہا ہوں لیکن تم تو ذرا

ذرا سی بات پر بُرا مان جاتی ہو۔ پتا نہیں تنہا کیسے زندگی گزار رہی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتی رہی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب وہ نیلی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب ہم کاٹیج پہنچے تھے تو وہ سیدھی آگے چلی گئی تھی اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ بریف کیس کو میں نے کاٹیج میں چھوڑ دیا۔ اصل مسودہ تو میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ لیلیٰ بہت زیادہ غصے میں ہے وہ مجھے کہیں راستے میں اتار دے گی لیکن میں نے حیرانی سے دیکھا کہ وہ نیو کالونی کی طرف چلی جا رہی تھی۔ شاید میری باتوں کا کچھ اثر ہوا تھا۔ یوں بھی ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ عورت خواہ کتنی ہی سنجیدہ اور خشک مزاج کیوں نہ ہو اپنے حسن کی تعریف سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ اوپر سے ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ غصے کا اظہار کرتی ہے۔ اندر سے پگھلتی رہتی ہے۔ شاید لیلیٰ کے ساتھ بھی یہی بات تھی اور اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں دونوں کان پکڑ لیتا۔

کان پکڑنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لیلیٰ بیزار کرنے والی عورت تھی۔ وہ بلاشبہ حسین اور جوان تھی لیکن میں عورتوں سے محض دل لگی کرنے اور خوش مزاجی سے وقت گزارنے کی حد تک دلچسپی لیتا ہوں۔ نیو کالونی پہنچ کر اس نے غصے سے مجھ سے کہا۔ "کیا سیٹ سے چپکے رہو گے یا گاڑی سے اترو گے بھی؟"

"گاڑی چلتی جا رہی ہے اور میرا ارادہ خودکشی کا نہیں ہے۔ ویسے جب تم یہاں تک لے ہی آئی ہو تو سبز کوٹھی بھی پہنچا دو۔ کوٹھی نمبر 80-L ہے۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا پھر کار ڈرائیو کرتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس سبز کوٹھی کے سامنے تھے۔ میں نے دروازہ کھول کے اترتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ' میں امید کرتا ہوں کہ تم میری واپسی کا انتظار کرو گی اور مجھے یہاں سے شہر پہنچا دو گی۔"

وہ بولی۔ "تم بہت زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ میرا وقت بہت زیادہ قیمتی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

اس نے کار اسٹارٹ کی' میں اس مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک بزرگ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "فرمائیے!"

میں نے کہا۔ "خادم کو ابن شاب کہتے ہیں' میں بیگم زرینہ چنگیزی سے ملنے آیا ہوں۔"

بزرگ نے کہا۔ "میں زرینہ کا باپ ہوں۔ آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہاں دروازے پر کھڑے رہ کر وجہ نہیں بتا سکتا۔ کیا آپ مجھے اندر نہیں سکتے؟"

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا' پھر اندر بلا لیا۔ میں ڈرائنگ روم آ کر بیٹھ گیا۔ پھر انہیں اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا پا کر مسکراتے ہوئے ک "مسٹر نثار احمد چنگیزی نے ایک نئی وصیت تیار کی ہے' میں اسی سلسلے میں زرینہ صاحبہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بزرگ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا کہ آپ کا اس وصیت سے اور چنگیز سے کیا تعلق ہے؟

"میرا تعلق بیرسٹر لیلیٰ محسن سے ہے۔ چونکہ اس وصیت کا ڈرافٹ لیلیٰ محسن تیار کیا ہے اور وہ ایسی بیرسٹر ہے جو ناجائز کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتی ہے' کوئی بھی کیس لینے سے پہلے اس کے متعلق تحقیقات کرتی ہے اور تحقیقات کرنے کے لئے میں ان کام آتا ہوں اور اسی کام کے سلسلے میں مَیں یہاں آیا ہوں۔"

شاید اس گھر کے دوسرے لوگ چھپ کر میری باتیں سن رہے تھے۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے ایک حسین اور نوجوان عورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ پھر بتایا کہ اس کا نام زرینہ ہے۔ وہ میرے سامنے ایک صوفے بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے حسن کی جو مختصر تعریف کی تو اسی وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا یہ زرینہ ہو گی۔ نثار احمد چنگیزی کسی ایسی ویسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی کو نہیں پھانس سکتا تھا۔ وہ بڑا زبردست شکاری تھا۔ یہ زرینہ کو دیکھ کر پتہ چل رہا تھا۔ اس پوچھا۔ "آپ کس قسم کی تحقیقات کرنے آئے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "بیرسٹر لیلیٰ محسن یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ پہلے آپ کے نام وصیت کی گئی تھی' اس وصیت کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ پھر چنگیزی صاحب نے دوسری وصیت کیوں تیار کرائی ہے؟"

زرینہ نے پوچھا۔ "کیا اس بات کا جواب چنگیزی نہیں دے سکتا تھا؟"

"نہیں' وہ تو آپ کا پتا بھی نہیں بتا رہے تھے۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچ ہوں۔"

"وہ جھوٹا اور فریبی ہے۔"

"آپ کو کب پتہ چلا کہ وہ جھوٹا یا فریبی ہے۔ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد؟"

"مجھے شادی سے پہلے ہی کسی حد تک علم ہو چکا تھا کہ چنگیزی پر اعتبار نہیں کیا جا ۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے کسی اور سے شادی کی تھی اور اسے طلاق دی تھی۔ اق دینے کی وجہ اس وقت ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔ میرے والدین نے چنگیزی کو مجبور کیا اگر میں اسے پسند ہوں اور وہ مجھے اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہے تو پہلے سے ایک ری معاہدہ ہونا چاہئے کہ جب میں اس کی شریک حیات بنوں گی اور اس کے بچے کی بنوں گی تو اپنے بچوں سمیت اس کی دولت اور جائیداد کی حقدار بنوں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "اچھا تو معاہدہ بھی ہو گیا اور شادی ہو گئی۔"

"جی ہاں شادی ہو گئی۔ دو برس تک مجھے اولاد نہ ہوئی۔ وہ وقتاً فوقتاً میرے کانوں یہ بات پھونکتا رہا تھا کہ اگر بچہ نہ ہوا تو وہ دوسری شادی کر لے گا۔ میں پریشان رہنے ۔ اسے بار بار سمجھانے لگی کہ یہ ضروری نہیں کہ شادی کے سال دو سال بعد بچہ ہو۔ ض گھروں میں پانچ دس برس کے بعد بھی بچے ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ اتنی جلدی بچوں کی ورت بھی کیا ہے۔ مگر ایک سچی بات کہتی ہوں آپ بُرا نہ مانیں۔ مرد بڑے ہرجائی تے ہیں۔ عورت کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے وقت جب میں خود کو بانجھ ھ رہی تھی کہ اچانک ہی اللہ نے میری گود بھر دی۔ میں نے ایک خوبصورت بچی جنم ۔ جب میں ماں بن گئی تو اس کے تیور بدل گئے۔ اب وہ اس بات پر اعتراض کرنے لگا اسے لڑکی ذات پسند نہیں ہے۔ مجھے لڑکا پیدا کرنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔ اللہ نے چاہا لڑکا بھی ہو جائے گا۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہے لیکن اس کے سر پر تو ایک اور شادی کا بھوت سوار تھا۔ لہٰذا اس نے چپکے سے ایک اور شادی کر لی۔ ں تو ایک برس کے بعد پتہ چلا کہ کوئی سائرہ بانو اس کی شریک حیات بنی ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کی اجازت کے بغیر وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی؟"

"میں قانونی کارروائی کیا کرتی۔ آخر وہ میرا شوہر ہے۔ میری بچی کا باپ ہے۔ میں ے عدالت میں بلاتی تو خود بھی عدالت میں دنیا والوں کو منہ دکھانا پڑتا۔ میری بچی پر اس کا ا اثر پڑتا۔ اس لئے میں خاموش رہی۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' عورتیں ان حالات میں مجبور ہو جاتی ہیں اور ہر کی دوسری شادی کو سر جھکا کر خاموشی سے تسلیم کر لیتی ہیں۔"

زرینہ نے کہا۔ "لیکن میں بھی ضدی ہوں۔ جب سے اس نے دوسری شادی کی ہے' میں نے اس کی طرف رُخ بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا ہے۔ صرف

بچی کے لئے اپنے حقوق طلب کروں گی۔ اس کی طرف سے ماہانہ اخراجات ملتے ہیں۔ میں خاموش ہوں لیکن جب دولت اور جائیداد کی بات آئے گی تو وہ مجھے اور میری بیٹی کو ملے گی۔ اس کا تحریری معاہدہ میرے پاس موجود ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر سائرہ بانو سے بھی اولاد ہوئی تو؟"

وہ بولی۔ "یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔ جب ادھر سے بھی اولاد ہوگی تو جائیداد برابر تقسیم ہوگی۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری بچی کو اس کے باپ کی طرف سے جتنا بھی ملے اتنا ہی بہت سمجھ کر ہم خاموش ہو جائیں گے۔"

بزرگ نے پوچھا۔ "بیٹے کیا تم ہمیں یہ بتانا پسند کرو گے کہ دوسری وصیت میں، دوسری بیوی اور اس کے ہونے والے بچوں کے لئے کتنی جائیداد لکھی ہوئی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اس وصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آج مجھے ایک بریف کیس دیا گیا تھا کہ میں اسے کسی محفوظ جگہ رکھ دوں اور اس بریف کیس میں جو وصیت نامہ ہے۔ اسے چنگیزی صاحب کی موت کے بعد کھولا جائے۔ اس کی ایک چابی چنگیزی صاحب کے پاس ہے۔ دوسری چابی بیرسٹر لیلیٰ کے پاس ہے۔ بریف کیس مجھے دیا گیا ہے یعنی میں چابی کے بغیر اسے کھول نہیں سکتا۔"

انہوں نے پوچھا۔ "جب ابھی بریف کیس دیا گیا ہے تو وہ کہاں ہے؟"

"میں نے اسے اپنے کاٹیج میں رکھا ہے۔"

زرینہ نے کہا۔ "ابا جان آپ ایسی باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا ہمیں صحیح جواب ان سے نہیں مل سکتا۔ ہمیں تو صرف چنگیزی ہی بتا سکتا ہے اور ہاں مسٹر شہاب یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی کہ شادی کے بعد مجھے چنگیزی کی فطرت کا علم ہوا یہ پتہ چلا کہ مجھ سے پہلے اس نے جس عورت سے شادی کی تھی اس کے ہاں بھی ایک بچہ ہوا تھا اور وہ بچے سے بیزار ہو کر اس عورت کو طلاق دے چکا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے شادی ہوئی۔ جب میں بچے کی ماں بنی تو وہ پھر کسی دوشیزہ کی تلاش میں مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور سائرہ بانو سے شادی کرلی۔ اب میں پھر پیش گوئی کرتی ہوں کہ اگر سائرہ بانو بھی بچے کی ماں بنی تو پھر وہ کسی چوتھی بیوی کے پاس جائے گا۔ وہ صرف بچہ نہ ہونے پر دھمکیاں دیتا ہے۔ بچہ ہو جائے تو اپنی عورت کو باسی سمجھ کر منہ پھیر لیتا ہے۔ لعنت ہے ایسے مرد پر۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک شخص تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ پھر مجھے دیکھتے ہی ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ میں نے بھی کرسی پر سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا اور وہ بریف کیس وہی

جسے میں کاٹیج میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا تھا۔ پھر اسی تیزی سے
لتے ہوئے ڈرائنگ روم کو عبور کر کے کسی اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے
اتھ ہی وہ بزرگ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ زرینہ تنہا رہ گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے
ئے کہا۔ "میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا ہے۔ بہرحال مجھے آپ کی زبانی چنگیزی کی
لیت معلوم ہوگئی ہے۔ میں ابھی جا کر بیرسٹر لیلیٰ محسن تک یہ معلومات پہنچا دوں گا۔"

میں اس سے باتیں کرتا ہوا مکان سے باہر آیا۔ وہ مجھے اپنے مکان کے گیٹ کے باہر
ک چھوڑنے کے لئے آئی تو میں نے حیرانی سے دیکھا۔ لیلیٰ وہاں اپنی کار میں بیٹھی ہوئی
ری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی زرینہ سے مسکرا کر کہا۔ "آج
پ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ جتنی حسین ہیں
ہی آپ کا دل بھی خوبصورت ہوگا اور آپ بڑی خوبصورت باتیں کرتی ہیں۔"

زرینہ میرے منہ سے اچانک ہی اپنی تعریفیں سن کر ذرا جھینپ رہی تھی۔ ذرا
شان ہو رہی تھی۔ اگر اسے ناگوار گزر رہا تھا تو وہ میرے منہ پر اعتراض نہیں کر سکتی
ں کیونکہ ابھی نئی وصیت والی بات بیچ میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ان حالات میں مجھے ناراض
ں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "آپ کو میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ پھر کبھی
ں گا تو تفصیل سے باتیں ہوں گی۔"

اتنا کہتے ہی مجھے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو کار ایک
کے سے آگے بڑھی تھی اور لیلیٰ اسے ڈرائیو کرتی ہوئی دور نکلتی جا رہی تھی۔ میں نے
از دی۔ "لیلیٰ سنو تو، کہاں جا رہی ہو، مجھے بھی لے چلو۔"

لیکن وہ میری آواز سے دور ہوتی چلی گئی۔ زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے تو
ہی بیرسٹر صاحبہ تھیں؟"

"جی ہاں، یہی تھیں۔ اب مجھے پیدل جانا ہوگا۔"

"یہ تو ناراض ہو کر گئی ہیں، مگر کیوں؟"

"وجہ نہ پوچھیں۔ آپ عورت ہیں، خود ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"اوہ، آئی سی۔" وہ ہنسنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "بائی دا وے، وہ صاحب کون ہیں جو ابھی کمرے میں بریف کیس
، کر آئے تھے؟"

"وہ میرے بڑے بھائی جان ہیں۔ اچھا میں چلتی ہوں، خدا حافظ!"

وہ پلٹ کر اپنے مکان کے اندر جانے لگی۔ میں اس گلی سے گزرتا ہوا مین روڈ کی

طرف جانے لگا۔ لیلیٰ کو اپنا منتظر پا کر خوشی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کا سفر طے ہو جائے گا لیکن میرے مذاق کا برا مان کر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر زرینہ سے دلچسپی اس لئے ظاہر کی تھی کہ لیلیٰ کو عقل آ جائے اور میرے رومانوی مذاق کو کبھی سنجیدگی سے دل میں نہ بٹھا لے۔

اس گلی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچتے ہی میں ٹھٹک گیا' وہاں تھوڑی دور لیلیٰ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس پر اثر انداز ہو رہا تھا اور وہ میرے رومانی مذاق کو سنجیدگی سے دل میں بٹھا رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنے دونوں کان پکڑے۔ مگر میں کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ زندہ دلی کا مظاہرہ کئے بغیر باز نہیں آتا۔

میں کار کے پاس پہنچ کر دروازہ کھولنے کے بعد اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "عورتوں کا مزاج سمجھ میں نہیں آتا۔ تم غصہ دکھا کر آ گئی تھیں۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب ٹیکسی نہ ملی تو پیدل مارچ کرنا ہو گا۔ مگر تم نے واقعی ثابت کر دیا کہ تم عمر میں بڑی ہو۔ اپنے چھوٹوں کا خیال رکھتی ہو۔"

وہ ابھی تک غصہ دکھا رہی تھی' منہ سے کچھ نہ بولی۔ کار کو اسٹارٹ کیا پھر ایک جھٹکے سے آگے بڑھتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگی۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے کہا۔ "کسی بڑی دکان کے سامنے گاڑی روک دینا ایک تالا خریدنا ہے۔"

"میں تمہیں کسی ٹیکسی سٹینڈ کے پاس اتار دوں گی۔ وہاں سے تم جہنم میں چلے جانا۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ہمیں اسی سپرہائی وے کی نئی آبادی میں جانا ہے۔ ہمارے کاٹیج کا تالا توڑ دیا گیا ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا' پھر ونڈ سکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے اس بات کی اطلاع کہاں سے مل گئی کہ ہمارے کاٹیج کا تالا توڑا گیا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "جب تم اس گلی میں موجود تھیں اور کار کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں' تم نے کسی آدمی کو دیکھا جو بریف کیس اٹھائے زرینہ کے مکان میں داخل ہوا تھا۔"

"میں وہاں کار میں بیٹھی ونڈ سکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ کسی کی آہٹ سن کر میں نے سر گھما کر دیکھا تھا۔ اس وقت ایک شخص زرینہ کے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔ شاید وہ بریف کیس پکڑے ہوئے تھا۔"

"وہ بریف کیس وہی ہے جسے نثار احمد چنگیزی نے میرے حوالے کیا تھا اور اس میں وصیت نامہ رکھا ہوا تھا۔"

یہ سنتے ہی اس نے کار کو ایک لمبی بریک لگاتے ہوئے دور جا کر اسے روکا' پھر بولی۔ "تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ وصیت نامہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ تم کس قسم کے جاسوس ہو۔ تم بالکل احمق ہو۔ مجھے تمہارے بارے میں بہت ہی غلط رپورٹ ملی تھی۔"

"تم بیرسٹر ہو یا پٹاخہ؟ ذرا سی چنگاری دکھاتے ہی پٹاخ پٹاخ بولنے لگتی ہو۔ آگے بھی تو سنو کہ کیا ہوا۔"

وہ ایک جھٹکے سے بولی۔ "سناؤ۔"

"اس بریف کیس میں خالی کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے دیکھا' پھر کہا۔ "میں اب تم پر یقین نہیں کر سکتی۔ اگر اس بریف کیس میں خالی کاغذات رکھے ہوئے ہیں تو وصیت نامہ کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ اب مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں آئے گا۔ مجھے وہ وصیت نامہ دکھاؤ۔"

"ایسے نہیں' تم میری ایک معمولی شرط مان لو گی تو میں دکھاؤں گا۔"

"اگر تمہاری شرط معمولی ہو گی تو مان لوں گی' چلو دکھاؤ۔"

میں نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر وصیت نامہ کا لفافہ نکالا اور اسے دکھا دیا۔ اس نے لفافہ لے کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر مطمئن ہو کر اسے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے کہا۔ "اب شرط پوری کرو۔"

"کیا شرط ہے؟"

"میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے بڑے ہی میٹھے انداز میں کہا۔ "ذرا سا مسکرا دو۔"

وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔

یوں ہنستے بولتے وقت نثار احمد چنگیزی میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ زرینہ کے بیان کے مطابق وہ کچھ زیادہ ہی چالاک معلوم ہوتا تھا۔ اس نے زرینہ سے پہلے بھی کسی لڑکی سے شادی کی تھی اور جب بھی وہ کسی کو بیوی بناتا تھا اور وہ اس کے بچے کی ماں بن جاتی تھی تو وہ اس عورت سے بے زار ہو کر کسی دوسری کی طرف رخ کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اب سائرہ بانو تک چلا آیا تھا۔ سائرہ بانو کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اور پتہ نہیں

شاید ابھی جاری ہو اور سائرہ بانو بھی اس کی فہرست سے نکل گئی ہو۔

☆======☆======☆

شام کو جب میں دوبارہ لیلیٰ کی کوٹھی میں گیا تو چنگیزی کی طرف سے میرے دس ہزار روپے آ گئے تھے۔ میں نے وہ رقم وصول کرتے ہوئے لیلیٰ سے پوچھا۔ "کیا تم نے سائرہ بانو کو دیکھا ہے؟"

"نہیں مجھے اپنے قانونی بکھیڑوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ میں اپنے مؤکلوں کے خاندان والوں سے ملاقات کرتی رہوں۔"

"میں آج صبح کوٹھی میں گیا تو وہاں کوئی عورت نظر نہیں آئی۔ کیا سائرہ بانو چنگیزی کے ساتھ نہیں رہتی؟"

"میں یہ بھی نہیں جانتی۔ اس سلسلے میں چنگیزی سے پوچھا جا سکتا ہے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر ریسیور کو کان سے لگا کر رابطہ قائم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کسے فون کر رہی ہو؟"

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "چنگیزی سے بات کرنا چاہتی ہوں' ابھی پوچھ لوں گی کہ سائرہ بانو اس کے ساتھ رہتی ہے یا کہیں اپنے میکے وغیرہ گئی ہے اور اس سے پہلی عورت کا بھی نام اور پتا معلوم کروں گی۔ کیوں ٹھیک ہے؟"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ دوبارہ کریڈل پر انگلیاں رکھ کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ "فون شاید انگیج ہے۔ میں پھر کوشش کرتی ہوں۔" اس نے دو چار بار کوشش کی لیکن رابطہ قائم نہیں ہوا۔ وہ ریسیور رکھتے ہوئے بولی۔ "وہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی ریسیور اٹھانے والا نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "چنگیزی کو اس وقت گھر میں ہونا چاہئے۔"

لیلیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم بہ حیثیت جاسوس یہ یقین سے کہہ رہے ہو کہ اسے گھر میں ہونا چاہئے۔"

"بالکل' وہ شرابی ہے۔ شام کے وقت اسے پینے کی عادت ہے۔ اس لئے اسے گھر میں ہونا چاہئے۔"

لیلیٰ نے پوچھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اسے پینے کی عادت ہے' وہ شغل کے طور پر پیتا ہو گا۔"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں اس کی خواب گاہ میں جا چکا ہوں۔ بڑی بڑی الماریاں شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی ہیں۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عادی ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ وہ گھر میں پیئے۔ ہو سکتا ہے کہ باہر کہیں جا کر.........."

یہ کہتے کہتے وہ رک گئی' پھر بولی۔ "ہاں' ہمارے ہاں تو شراب پر پابندی ہے۔ پارک اور کلبوں میں اس کی ممانعت ہے۔ یقیناً جو لوگ عادی ہیں وہ شام کو گھر میں بیٹھ کر پیتے ہوں گے۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اندازہ نہیں یقین سے کہا ہے۔ دیکھو اس وقت میری جیب بہت گرم ہے۔ میں تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کھلانا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم ابھی یہاں سے چلیں۔ ذرا گھومیں گے' پھریں گے' تفریح کریں گے اور راستے میں چنگیزی کی کوٹھی بھی جائیں گے اور اس سے چند اہم سوالات کے جواب حاصل کریں گے۔ اس کے بعد پھر ہم کسی ہوٹل میں جائیں گے۔ بولو منظور ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں' یہ زبردستی کی دعوت نہ کرو۔ دعوت کرنے والے دو چار دن پہلے سے Infoam کرتے ہیں۔"

"وہ تکلف والی دعوت ہوتی ہے۔ میں تو بے تکلفی سے مدعو کرتا ہوں۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

وہ تیار ہونے کے لئے خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے اس کا انتظار کرنے کے لئے ٹی وی کو آن کر دیا۔ اس وقت سکرین پر سگریٹ کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا۔ اتنا پُرکشش اشتہار تھا کہ سگریٹ پینے کو جی.......... للچانے لگا۔ میں نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا پھر ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لگانے لگا۔ دو چار کش لگانے کے بعد سکرین پر منظر بدل گیا۔ اب وزارتِ صحت کی طرف سے اس خطرے سے آگاہی دی جا رہی تھی کہ سگریٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے اور اس سے پھیپھڑوں کا سرطان ہو جاتا ہے۔ میں نے فوراً ہی سگریٹ بجھا دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی پھر ایک پروگرام ایسا دکھایا گیا جو کسی سگریٹ کمپنی کے تعاون سے پیش کیا جا رہا تھا۔ پروگرام کے درمیان سگریٹ کا پھر وہی اشتہار تھا۔ میں نے پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا کہ کس بات پر عمل کیا جائے۔ وزارت صحت کی بات پر یا سگریٹ کا اشتہار دکھانے والوں کی بات پر۔ اگر سگریٹ پینا صحت کے لئے نقصان دہ ہے تو پھر سگریٹ پینے والے شیروں سے کیسے لڑ جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کیسے چڑھ جاتے ہیں۔ یہ پالیسی سمجھ میں نہیں آئی کہ برائی کی ترغیب بھی دی جا رہی تھی اور برائی سے روکا بھی جا رہا تھا۔

لیلیٰ ایک گھنٹے کے بعد اس قدر بن سنور کر سامنے آئی کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ وکالت کا

پیشہ جاری رکھنے والی ایک عورت سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اس نے اتنی خوبصورتی سے سنگھار کیا تھا اور اتنے سلیقے سے ساڑھی پہنی تھی کہ نظریں بار بار اس کا طواف کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس کے جلوے سے محو ہوتے ہوئے اس کی تعریفیں کیں۔ وہ تھوڑی دیر تک شرماتی رہی اور مجھ سے نظریں چراتی رہی۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور کہا۔ ”تمہارا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

☆======☆======☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے Sea Beach ہوٹل کی طرف جانے سے پہلے ہم نثار احمد چنگیزی کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ہماری کار پورچ میں جاکر کھڑی ہوئی۔ میں نے کار سے اتر کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ پھر انتظار کرنے لگا لیکن کوئی نہیں آیا۔ میں نے دوسری بار پھر بٹن کو دبایا۔ اس وقت تک لیلیٰ کار سے اتر کر میرے پاس آگئی تھی۔ اس نے دستک دینے کے لئے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر میں نے آواز دی۔
”مسٹر چنگیزی، کیا آپ گھر پر موجود ہیں؟“

ہم نے جواب کا انتظار کیا۔ مگر پوری کوٹھی میں خاموشی چھائی رہی۔ لیلیٰ نے آواز دی۔ ”کیا یہاں کوئی ملازم موجود ہے؟“

جواب میں پھر خاموشی رہی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”لیلیٰ میرے تجربات مجھے وارننگ دے رہے ہیں کہ یہاں خطرہ ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ اپنے پرس سے رومال نکالو اور جہاں ہاتھ رکھو اس جگہ کو رومال سے صاف کر دیا کرو۔“ بہت محتاط ہو کر ہم اندر داخل ہوگئے۔

اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ میں نے بھی رومال نکال لیا تھا۔ پھر ہم بہت محتاط انداز میں کوٹھی میں داخل ہوئے اور دبے قدموں چلتے ہوئے پہلے ڈرائنگ روم کو عبور کیا۔ اس کے بعد پھر اس ڈائننگ روم میں گئے۔ جہاں صبح میں نے چنگیزی کے ساتھ چائے پی تھی۔ وہاں سے ہم چنگیزی کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچے۔ وہ دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ اندر ٹی وی پر آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی انگریزی کا پروگرام جاری تھا، میں نے دیوار سے لگ کر سر کو ذرا آگے بڑھا کر دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ کمرہ پہلے تو خالی نظر آیا پھر ایک کرسی پر چنگیزی بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کی پشت نظر آ رہی تھی اور وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے لیلیٰ کا ہاتھ تھام کر اسے آواز دی۔
”مسٹر چنگیزی! کیا آپ بہت نشے میں ہیں؟ ہم نے کال بیل کا بٹن دبایا، کئی بار آوازیں دیں لیکن آپ کی طرف سے جواب نہیں ملا۔“

یہ کہتے ہوئے میں لیلیٰ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا لیکن چنگیزی جوں کا توں اس کرسی پر بیٹھا رہا۔ ہم اس کی پشت کی طرف تھے تب میرا ماتھا ٹھنکا جو وارننگ میرے دماغ نے میرے تجربات نے پہلے دی تھیں وہ درست نظر آ رہی تھیں۔ میں فوراً ہی لپک کر چنگیزی اور ٹی وی کے درمیان پہنچا۔ تب میں نے دیکھا کہ چنگیزی بالکل ساکت بیٹھا ہوا تھا' اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' وہ پلکیں نہیں جھپکا رہا تھا' اسے ایک نظر دیکھتے ہی پتہ چل گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ اگر میں اسے ذرا بھی ہاتھ لگاؤں گا تو وہ ایک طرف ڈھلک جائے گا یا کرسی سے لڑھک جائے گا۔

میری نظریں تیزی سے اس خواب گاہ کے اندر دوڑنے لگیں۔ اِدھر اُدھر میں نے متلاشی نظروں سے دیکھا' کوئی نظر نہیں آیا.......... بالکل سناٹا تھا اور اس وقت چنگیزی کی لاش کے سوا اس کمرے میں صرف میں لیلیٰ کے ساتھ تھا۔ ٹی وی آن تھا۔ اس سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کی موت واقع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ جس نے بھی اسے ہلاک کیا ہے وہ بڑی جلد بازی میں ٹی وی کو کھلا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ورنہ قتل کرنے والا شور وغل سے گھبراتا ہے۔ ٹی وی کی آواز کم از کم ضرور کر دیتا۔

چنگیزی کے سامنے شراب کی ایک بوتل میز پر کھلی رکھی تھی۔ ایک گلاس لڑھکا ہوا تھا۔ اس گلاس سے شراب بہہ کر میز پر آئی تھی پھر میز پر بہتی ہوئی قالین پر گر رہی تھی اور ابھی تک وہ شراب آہستہ آہستہ ٹپکتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ گلاس ایک آدھ منٹ پہلے میز پر لڑھکا ہے اور شراب اب تک بہہ رہی ہے۔

لیلیٰ حالات کو تقریباً سمجھ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ چنگیزی میرے باقی پندرہ ہزار روپے ادا کرنے میں اتنی جلدی کرے گا۔"

لیلیٰ کی بھنویں تن گئیں۔ "اس نے پوچھا کیا مطلب' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ چنگیزی کا وعدہ یہ تھا کہ باقی پندرہ ہزار روپے اس کی موت کے بعد مل جائیں گے اور اب مجھے وہ رقم دو چار روز میں مل جائے گی۔ اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو ہجے کر کے سمجھا دوں کہ یہ مر چکا ہے۔"

وہ بولی۔ "یہاں سے فوراً واپس چلو۔"

"پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ یہ اپنی مرضی سے مرا ہے یا کسی نے مارا ہے۔"

"کیوں خواہ مخواہ اس معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہو۔ چپ چاپ چلے چلو۔"

"نہیں لیلیٰ! یہ میرا فرض ہے کہ میں حقیقت معلوم کروں۔ اگر اسے کسی نے قتل کیا ہے تو ہمیں قاتل تک ضرور پہنچنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر میں چنگیزی کے قریب گیا اور اسے ہاتھ لگائے بغیر دور ہی سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ اس کی گردن دیکھی تو پتہ چلا کہ کسی نے اس کی گردن پر ہاتھ بھی نہیں رکھا ہے یعنی اس کا گلا بھی نہیں گھونٹا گیا ہے۔ تب میرا خیال شراب کی طرف گیا۔ کیا کسی نے زہر ملایا ہے اور یہ زہریلی شراب پی چکا ہے؟

پھر میری نظر ایک گوشے میں رکھی ہوئی اس بڑی الماری کی طرف گئی جس سے چنگیزی نے بریف کیس نکال کر مجھے دیا تھا۔ وہ الماری کھلی ہوئی تھی اور اس کا سامان باہر الٹا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے جلدی جلدی میں تلاشی لی ہے۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھ کر الماری کے پاس پہنچا اور دور ہی سے کسی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔ اچانک مجھے ایک پرانی ڈائری نظر آئی۔

میں نے وہ ڈائری اٹھالی۔ پھر جلدی جلدی اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحے پر ایک عورت کا نام اور پتہ نظر آیا۔ میں نے وہ ڈائری لیلیٰ کو دیتے ہوئے کہا۔ "تم اس عورت کا نام اور پتہ نوٹ کر لو اور دیکھو کہ شاید دو چار عورتوں کے نام اور پتے اور مل سکیں۔ میں ذرا دوسری طرف توجہ دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں شراب کی الماری کے پاس گیا۔ وہ الماری بند تھی۔ اس کے پاس ہی قالین پر ایک بڑا سا کارٹن رکھا ہوا تھا جس میں شراب کی بوتلیں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی یہ نیا مال اس کے پاس آیا ہے اور اسی میں سے وہ ایک بوتل نکال کر پی رہا تھا۔ میں وہاں سے پلٹ کر نثار احمد چنگیزی کے پاس آیا۔ اس کے سامنے میز پر وہ بوتل کھلی ہوئی رکھی تھی۔ اس کا ڈھکنا میز پر ہی الٹا ہوا تھا۔ میں نے رومال سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ پھر روشن بلب کے قریب لے جا کر اسے دیکھنے لگا۔ بہت غور سے دیکھنے پر اس ڈھکنے کے اوپر ایک بہت ہی مہین سوراخ نظر آیا جیسے کہ وہ سوراخ سوئی کے ذریعے کیا گیا ہو۔

میں نے اس ڈھکن کو واپس کھولی ہوئی بوتل کے پاس میز پر رکھ دیا۔ میں بہت محتاط تھا کہ وہاں کسی بھی چیز پر ہماری انگلیوں کے نشانات نہ پڑیں اور اگر وہاں کسی کی موجودگی ظاہر ہو تو ہم پر کوئی شبہ نہ کر سکے کہ ہم وہاں بڑی دیر تک مصروف رہے تھے۔ میں نے اس کارٹن کے پاس جا کر نئے مال میں سے ایک بوتل رومال سے پکڑ کر اٹھالی اور اسے

بھی بلب کے سامنے لے جا کر روشنی میں دیکھنے لگا۔ بہت غور سے دیکھنے پر اس کے ڈھکن میں بھی ایک مہین سوراخ نظر آیا۔ میں نے اسے واپس رکھ کر دوسری اور تیسری بوتلیں اٹھائیں۔ ہر بوتل میں مجھے ویسا ہی سوراخ نظر آیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سرنج کے ذریعے ان بوتلوں میں یا تو زہر بھرا گیا ہے یا پھر جو لوگ مال سپلائی کرتے ہیں انہوں نے سرنج کے ذریعے شراب میں دوسری چیزوں کی ملاوٹ کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ چیزیں شراب میں مل کر زہر بن گئی ہوں۔ اب سوچنے کے لئے کئی باتیں تھیں کہ کارٹن میں جتنی شراب رکھی ہوئی تھی وہ سب کی سب زہریلی تھی اور اگر وہ زہریلی نہیں تھی تو کسی نے دانستہ اس شراب میں زہر ملایا تھا جو کہ چنگیزی کے سامنے اس وقت رکھی ہوئی تھی۔

لیلیٰ نے میرے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔ "دو عورتوں کے نام اس میں ملے ہیں۔ ایک زلیخا اور دوسری زیبی۔ ان کے علاوہ زرینہ اور سائرہ بانو کا بھی ذکر ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "سائرہ بانو کے متعلق اگر کوئی کام کی بات لکھی ہو تو بتاؤ۔"

"ہاں۔ ایک ہفتہ پہلے والی تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ سائرہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے اور ایک ہفتے بعد یعنی کل کی تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ وہ سائرہ کے لئے بہت بے چین ہے اور اس نے اسے ٹیلیگرام دیا ہے کہ جلد واپس چلی آئے۔ میں نے ڈائری کو رومال سے صاف کر کے وہیں الماری کے پاس پھینک دیا ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اب ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہئے اور کسی طرح پولیس تک یہ خبر پہنچا دینا چاہئے کہ ان کی سرگرمی کے لئے ایک لاش یہاں تیار ہے۔"

ہم دونوں اس کمرے سے نکلتے وقت بھی محتاط تھے کہ ہماری انگلیوں کے نشانات کہیں رہ نہ جائیں۔ جہاں جہاں شبہ تھا اس جگہ کو رومال سے صاف کرتے ہوئے ہم کوٹھی سے باہر آ گئے۔ اپنی کار میں بیٹھے پھر اسے اسٹارٹ کر کے کوٹھی سے دور ہوتے چلے گئے۔

لیلیٰ نے کہا۔ "میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ یہ سارا کھیل زرینہ کا ہے۔"

"میں تمہارے یقین کی وجہ پوچھوں گا۔"

"وجہ یہ ہے کہ زرینہ کا بھائی ہمارے کاٹیج سے وہ بریف کیس اٹھا کر لے گیا تھا۔ بریف کیس کھولنے کے بعد انہیں فضول سے کاغذات ملے ہوں گے جس پر وہ بہت زیادہ جھنجلائے ہوں گے۔ انہیں وصیت نامے کی تلاش ہے۔ اسی جھنجلاہٹ میں انہوں نے یہاں آ کر چنگیزی کی الماری کی پوری تلاشی لی۔ سارا سامان باہر نکال کر پھینک دیا لیکن انہیں یہاں بھی وصیت نامہ نہیں ملا اور ایسا کرنے کے لئے سب سے پہلے انہوں نے چنگیزی کو راستے سے ہٹایا۔ اس کام میں براہِ راست زرینہ کا ہاتھ ہو سکتا ہے یا پھر یہ سب

کچھ اس کے بھائی نے کیا ہے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تمہارا اندازہ درست ہو سکتا ہے۔"

اس نے ضد کی۔ "اندازہ نہیں یقین کہو۔"

"تمہیں یقین ہو سکتا ہے مجھے تو نہیں ہے کیونکہ ابھی ہماری فہرست میں تین اور عورتوں کے نام بھی ہیں۔ سائرہ بانو، زلیخا اور زیبی۔"

وہ بولی۔ "سائرہ بانو کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے کہ موجود وصیت اس کے حق میں ہے۔ رہ گئی زلیخا تو اسے جیسا کہ زرینہ نے بتایا طلاق ہو چکی ہے۔ اب یہ زیبی کون ہے، یہ دیکھنا ہے تم کب تک اس کے متعلق معلومات حاصل کرو گے؟"

"اب تو رات ہو گئی ہے، میں کل صبح ہی اس پتے پر جاؤں گا۔ میں ذرا قریبی تھانے میں ٹیلی فون کر دوں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک قریبی ٹیلی فون بوتھ کے قریب کار روک دی۔

لیلیٰ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہاں کے تھانے کا نمبر معلوم ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرا دماغ ایک ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے۔ اس دماغ میں اس شہر کے تمام پولیس اسٹیشنوں اور پولیس کے تمام افسروں کے ٹیلی فون نمبر نقش ہیں۔"

یہ کہہ کر میں کار سے باہر نکلا۔ پھر ٹیلی فون بوتھ کے اندر جا کر میں نے قریبی پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا۔ اپنی آواز بدلی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بتا دیا کہ باغِ ارم، سٹریٹ نمبر بارہ، کوٹھی نمبر ڈی فائیو میں نثار احمد چنگیزی مردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس کا ٹیلی فون نمبر بھی بتا دیا۔ مجھ سے دوسری طرف سے پوچھا جا رہا تھا کہ میں کون ہوں لیکن میں نے جواب دینے کے بجائے ریسیور کو ہینگر سے لٹکا دیا اور بوتھ سے باہر نکل آیا۔ پھر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور اسے آگے بڑھا دیا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تک ہم دونوں نے بہت اچھا وقت گزارا۔ تفریح کے لئے سمندر کے کنارے بھی گئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھام کر دور ٹھنڈی ریت پر ٹہلتے بھی رہے۔ ایک بجے کے قریب لیلیٰ مجھے میری رہائش گاہ کے سامنے چھوڑ کر چلی گئی۔ جب میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچا تو ملازم میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "صاحب تھانے سے دو بار فون آ چکا ہے۔ کوئی انسپکٹر مولا بخش صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جیسے ہی آپ آئیں تو ان سے فون پر بات کر لیں۔"

مجھے کوئی گڑبڑ معلوم ہوئی۔ انسپکٹر مولا بخش میرے دشمنوں میں سے تھا۔ ایک بار مجھے عدالت تک گھسیٹ چکا تھا اور وارننگ دی تھی کہ آئندہ میں پولیس والوں کے

معاملے میں مداخلت نہ کروں۔ اگر کبھی میں ان کے درمیان آیا تو وہ مجھے کسی نہ کسی کیس میں ملوث کرکے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے گا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور اس کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد رابطہ قائم کیا۔ وہ جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا' جب میری آواز سنی تو بولا۔ "اچھا تمہاری تفریح ختم ہو گئی۔ بہت بڑی چڑیا پھانسی ہے۔"

"ہاں' مجھ سے بڑی ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں۔ آپ کے حکم کے مطابق میں نے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا ہے۔"

"بات بدلنے کی کوشش نہ کرو۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی دولت مند عورت سے اب تک کتنا وصول کر چکے ہو اور اسے کس طرح پھانس لیا ہے کہ وہ بناؤ سنگھار کرکے تمہارے ساتھ گھومنے بھی نکلتی ہے۔ ہم تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پتھر میں جونک کیسے لگ گئی۔ وہ تو بڑی ہی خشک مزاج عورت ہے۔ عدالت میں اور بیرسٹروں کی سوسائٹی میں یہی کہا جاتا ہے۔ تم نے اسے کیسے پگھلا دیا۔"

"انسپکٹر صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ صرف کام کی بات کریں۔"

"تو کام کی بات سنو۔ آج تمہاری وہ بیرسٹر سولہ سنگھار کرنے کے بعد تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے نکلی تھی۔ اس نے اپنی چوٹی میں ایک سونے کی کلپ لگائی تھی' وہ کلپ اس وقت میری مٹھی میں ہے۔"

"تعجب ہے کہ وہ کلپ آپ کی مٹھی میں کیسے آ گئی؟"

"ایسے کہ اس لاش کا معائنہ کرنے کے دوران جب میں نے اس کمرے کی چھان بین شروع کی تو الماری کے سامنے پڑے ہوئے بہت سے سامان کے پاس وہ کلپ بھی پڑی ہوئی تھی۔"

میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ اس کمبخت کی مٹھی میں ہماری ایک کمزوری آ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اس جیولر کو جانتا ہوں جہاں سے لیلیٰ محسن زیورات خریدتی ہیں' میں وہاں اس بات کی تصدیق کرلوں گا کہ سونے کی یہ کلپ بیرسٹر لیلیٰ نے اسی جگہ سے خریدی تھی۔ اب بتاؤ کیا بولتے ہو؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بولنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ آپ تو ایک بہت ہی پرانے تجربہ کار پولیس انسپکٹر ہیں۔ جیسا چاہیں' ہمیں ویسا نچا سکتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بس یہی کہ مل بانٹ کر کھانا چاہئے۔ تم سچ سچ بتاؤ کہ اب تک بیرسٹر صاحبہ سے کتنا وصول کر چکے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "آج پہلی بار میں نے دس ہزار روپے وصول کئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پانچ ہزار مجھے دے دو۔"

"اگر میں نہ دوں تو!"

"تو اس لاش کی رپورٹ کے ساتھ وہ سونے کا کلپ بھی پیش کیا جائے گا۔ عدالت میں تمہاری محبوبہ ایک ملزمہ کی حیثیت سے حاضر ہو گی۔ اگر اس سے ہمدردی ہے' اسے بچانا چاہتے ہو تو سودا کرلو۔ یہ سمجھ لو کہ جب وہ پھنسے گی تو تمہیں بھی پھنسائے گی کہ تم بھی اس کے ساتھ اس لاش کے پاس موجود تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب یہ بتائیے کہ آپ جیسے بعض پولیس والے حرام کیوں کھاتے ہیں؟"

اس نے جواباً ایک تگڑی سی گالی دی۔ میں نے کہا۔ "بعض پولیس والے پیدائشی گالیاں سیکھ کر آتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ شریف آدمیوں کو بھی تھانے میں بلا کر گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی جواں مردی تو نہیں ہے۔"

اس نے میری مردانگی کو بھی گالی دی۔ میں نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب ہماری بہت بڑی کمزوری آپ کے ہاتھ آ گئی ہے۔ آپ ایسا کریں وہ سونے کی کلپ لے آئیں' میں ابھی آپ کو پانچ ہزار روپے دے دوں گا۔"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ اسی لئے ہم گالیاں دیتے ہیں۔ دیکھو نا گالیاں دیتے ہی کیسے سیدھے ہو گئے۔ فوراً ہی سودے پر راضی ہو گئے۔ ٹھیک ہے' میں ابھی آ رہا ہوں۔ میری رقم تیار رکھو۔ اگر کوئی دھوکے بازی ہوئی تو یاد رکھنا میرا نام مولا بخش ہے۔ ایک بار تمہیں عدالت تک پہنچا چکا ہوں۔ دوسری بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاؤں گا۔ میں آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بھی ریسیور رکھ کر کیسٹ ریکارڈ کو ٹیلی فون سے الگ کیا پھر اس کیسٹ کو ریوائنڈ کرنے لگا۔ اس دوران میں نے لیلیٰ سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ وہ سونے کے لئے جا رہی تھی۔ ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ جب میری آواز سنی تو خوشی سے کھل کر بولی۔ "تم سوتے وقت بھی مجھے یاد کر رہے ہو۔"

"ہاں' ہمیں مولا بخش نے یاد کیا' میں تمہیں یاد کر رہا ہوں۔"

"یہ مولا بخش کون ہے؟"

"وہی جس کے پاس تمہاری سونے کی کلپ رہ گئی ہے۔"

وہ ایک دم سے چپ ہو گئی' جیسے سناٹے میں آ گئی ہو۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولی۔

"میں سمجھ گئی ابھی میں یہاں آ کر اپنے زیورات اتار رہی تھی تو سونے کی کلپ نہیں ملی' میں سمجھ رہی تھی کہ وہ کہیں سمندر کے کنارے گر گئی ہو گی۔"

"نہیں لیلیٰ وہ انسپکٹر مولا بخش کی مٹھی میں گر پڑی ہے۔ اب وہ کمبخت ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔ بڑی سی رقم ادا کرو ورنہ لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ وہ کلپ بھی پیش کر دی جائے گی۔"

"وہ بکواس کر رہا ہے۔ ہم اسے ایک پیسہ نہیں دیں گے۔ میں جس جیولر کے پاس سے زیورات خریدتی ہوں' وہ میرے انکل ہیں۔ میں انہیں ابھی بتا دوں گی اور سمجھا دوں گی کہ اگر کوئی بھی اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے آئے تو یہ کہہ دیں اس کا کوئی تعلق ان کی بھتیجی لیلیٰ محسن سے نہیں ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی سوچو کہ ہمارے اس قدر محتاط رہنے کے باوجود سونے کی ایک کلپ وہاں گر پڑی۔ کیا ہزار احتیاط کے باوجود ہماری انگلیوں کے نشان کہیں رہ نہیں سکتے۔ ہم سے کوئی دوسری بھول نہیں ہو سکتی؟"

"ہاں' اگر ہم اندیشہ دل میں پیدا کریں تو ہزاروں بھول کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔"

"لیلیٰ یہ سوچنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم سے ایک بھول ہوئی ہے تو مجھ سے بھی کوئی بھول ہو سکتی ہے۔ یا تم سے بھی وہاں ایک کے بعد دوسری بھول ہوئی ہو گی۔ ہمیں اس بات سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ جب غلطی ہوتی ہے تو پتا نہیں چلتا کہ کیسے ہو رہی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد اس کا علم ہوتا ہے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہمیں بڑی رشوت دے کر اس کا منہ بند کرنا ہو گا۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دانشمندی بھی یہی ہے کہ بات کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے یہیں ختم کر دیا جائے۔"

"وہ کتنی رقم مانگ رہا ہے؟"

میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "وہ دس ہزار روپے کا مطالبہ کر رہا ہے اور اس سے ایک پیسہ بھی کم لینا نہیں چاہتا۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیس بھی بہت بڑا ہے۔ تم بیرسٹر ہو' جب تمہارے پاس مؤکل آتے ہیں تو تم کیس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اپنے مقدمہ لڑنے کا بھاؤ بتاتی

ہو۔ بس اسی طرح دوسرے شعبوں میں بھی ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح دس ہزار روپے لا کر اس کے منہ پر مار دوں گی۔"

"تمہیں رقم ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے' کیا میرے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں۔ کیا میں تمہارے لئے دس ہزار روپے قربان نہیں کر سکتا۔"

"ایسا نہ کہو شہاب! آج ہی تو تمہیں دس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی ہے اور آج ہی تم وہ سارے کے سارے پیسے میرے لئے ضائع کرو گے۔ اس میں سے بھی تم بہت کچھ خرچ کر چکے ہو۔"

"میرے بینک میں اور بھی رقم ہے' میں وہ دس ہزار روپے ادا کر دوں گا۔ تم غیروں کی طرح باتیں نہ کرو اور اگر تم نے مجھے اپنا نہیں سمجھا تب تم کل صبح دس ہزار روپے ادا کر دینا۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ وش یو گڈ نائٹ۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے آ کر بتایا کہ انسپکٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا۔ "انہیں اندر بھیج دو۔"

دوسرے ہی لمحے میں انسپکٹر مولا بخش مسکراتا ہوا ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا نچاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کہا۔ "آیئے' تشریف لایئے' میں آپ کو ایک کیسٹ سنانا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہی میں نے کیسٹ ریکارڈ کو آن کر دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ کیسٹ میں اپنی آواز سنتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور توجہ سے اس گفتگو کو سننے لگا۔ جو تھوڑی دیر پہلے میرے اور اس کے درمیان ہو چکی تھی۔ جب فون پر ہونے والی باہمی گفتگو ختم ہو گئی تو مولا بخش نے دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر غصے سے بولا۔ "اچھا تو تم نے چالاک بننے کی کوشش کی ہے۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "اس کوشش میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتایئے؟"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ناولوں کے سراغرسانوں کی طرح فون میں ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرتے ہو گے۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ میں نے فون پر ایسی باتیں کیں۔ مگر یہ مت بھولو کہ میں تمہیں کسی دوسرے طریقے سے بھی پھانس سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جب بھی پھانسنے کا ارادہ ہو تو یہ یاد کر لیجئے گا کہ آپ کی یہ سودے بازی میرے پاس ریکارڈ ہے۔ میں ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کر سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے رشوت طلب کر رہے تھے۔ میں نے دینے سے انکار کیا۔ اس لئے آپ مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کر رہے ہیں۔"

"میں تمہارے خلاف ثبوت پیش کروں گا۔"

"میں سننا چاہوں گا وہ ثبوت کیا ہیں؟"

"وقت آنے پر بتادوں گا۔"

"ٹھیک ہے وقت آنے پر میں بھی اپنا بچاؤ کرلوں گا۔ فی الحال تو وہ سونے کا کلپ یہاں میز پر رکھ دیجئے۔"

اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر میرا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہیں گولی مار سکتا ہوں۔ اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو یہ کیسٹ میرے حوالے کردو۔ میں اپنی کمزوری کسی کے پاس نہیں چھوڑتا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! اگر مجھے گولی مارنا ہے تو کوئی دوسرا ریوالور لے کر آئیے۔ یہ تو سرکاری ریوالور ہے۔ اس کی گولی جب میرے جسم سے نکلے گی تو آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آپ پولیس مقابلے میں مجھ سے مقابلہ کررہے تھے۔ لہٰذا مجھے گولی ماردی۔ پھر یہ کہ میرے ہاتھ میں بھی کوئی ہتھیار ہونا چاہئے۔ ابھی تو آپ نے یہ پورا ڈرامہ ترتیب نہیں دیا ہے' پھر آپ دوسرے پولیس والوں کی طرح پولیس مقابلے کا ڈرامہ کیسے کھیل سکیں گے؟"

اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر سونے کی کلپ نکالی' پھر اسے میرے آگے میز پر پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا کہ میں نے کہا۔ "ذرا ٹھہریئے ایک بات سن لیجئے۔ جب کبھی بیرسٹر لیلیٰ محسن آپ سے لین دین کے متعلق پوچھے تو آپ کہہ دیجئے گا کہ آپ نے اس سونے کی کلپ کے عوض دس ہزار روپے لئے ہیں۔"

وہ شدید حیرانی سے چیخ کر بولا۔ "دس ہزار روپے' میں نے تو تم سے پانچ ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا۔"

"تمہارا مطالبہ ہوچکا ہے۔ یہ میرا مطالبہ ہے' لیلیٰ محسن سے اور میں یہ رقم لیلیٰ سے نہیں لوں گا لیکن دس ہزار روپے کا احسان کروں گا۔ یہ احسان کسی دوسرے وقت میرے کام آئے گا۔"

وہ مجھے گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ "تم بہت کمینے ہو۔"

میں نے عاجزی سے کہا۔ "جناب! آپ ہی لوگوں سے سیکھتا ہوں۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دوسری صبح میں زلیخا کے پتے پر پہنچا۔ اس کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک صاحب باہر نکلے۔ میں نے کہا۔ "میں زلیخا صاحبہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "اچھا وہ جو اسکول ٹیچر یہاں رہا کرتی تھی۔ وہ تو اب نہیں ہے' کسی دوسرے مکان میں منتقل ہوگئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ ان کا پتا بتا سکتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب! میں تو نیا کرایہ دار ہوں۔ اوپر مالک مکان رہتے ہیں ان سے آپ دریافت کرلیں۔"

میں نے زینے کے پاس لگے ہوئے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خاتون باہر نکلیں۔ میں نے ان سے زلیخا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا۔ "وہ تو ہمارے ہاں آٹھ برس تک کرایہ دار کی حیثیت سے رہی۔ ان کا ایک لڑکا بھی تھا۔ جب یہاں وہ کرایہ کا مکان لینے آئی تو اس نے بتایا کہ اس کا شوہر باہر گیا ہوا ہے۔ دو سال بعد آئے گا۔ دو سال کے بعد ہم نے پوچھا تو وہ رونے لگی۔ کہنے لگی کہ اس کی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں رہ گیا ہے۔ میں نے اس پر ترس کھایا اور اسے بغیر شوہر کے اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔ وہ اسکول میں جاکر بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے پتا چلا کہ اس کا شوہر اسی شہر میں رہتا ہے اور اس نے اسے طلاق دے دی۔ مجھے اس کے جھوٹ پر غصہ آیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ یہ مکان خالی کردے ورنہ میں تھانے پولیس کے چکر میں الجھادوں گی اور وہ مفت میں بدنام ہوگی۔ اسکول کی ملازمت سے بھی جائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "اچھا تو وہ یہاں سے چلی گئی۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں یہاں سے وہ تقریباً چار ماہ پہلے گئی ہے۔"

"کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ وہ کہاں مل سکتی ہے؟"

"ہمیں تو کچھ پتا نہیں ہے' ہم نے تو اس سے یہ نہیں پوچھا کہ پھر کس مالک مکان کو بے وقوف بنانے جارہی ہے۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔"

میں مایوس ہوکر واپس جانے کے لئے پلٹ گیا۔ اسی وقت ایک رکشہ اس مکان کے سامنے آکر رکا۔ اس رکشے سے انسپکٹر مولا بخش اتر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی غصے سے منہ بنایا پھر اس خاتون سے دریافت کیا کہ یہ شخص آپ سے کیا پوچھ رہا تھا۔

خاتون نے مجھے شبہے کی نظر سے دیکھا پھر بولی۔ "یہ میری ایک کرایہ دار زلیخا کے متعلق دریافت کررہے تھے۔ وہ عورت چار ماہ پہلے میرے یہاں کرایہ دار تھی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے۔ یہاں تو ہمارا اب ایک نیا کرایہ دار ہے۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "تو آپ زلیخا کا نیا پتا نہیں جانتی ہیں؟"

خاتون نے انکار میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے زلیخا کے متعلق سوالات کئے۔ خاتون نے وہی جواب دیا جو میں سن چکا تھا۔ انسپکٹر مولا بخش نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔ میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے رکشے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! صاف کیوں نہیں کہتے کہ تھانے سے یہاں تک آئے ہیں اور یہاں سے جہاں تک جائیں گے وہ تمام کرایہ میری جیب سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ ورنہ بے چارا رکشے والا مفت میں مارا جائے گا۔"

وہ رکشے کے قریب آ کر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "میں یہاں آنے میں ذرا دیر کر گیا۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے میں زرینہ کے یہاں گیا تھا۔ وہاں پتا چلا کہ کل تم اس کے پاس گئے تھے۔ اب یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی پہلے پہنچ گئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ زیبی نام کی کسی لڑکی کے پاس بھی تم پہنچ چکے ہو گے اور اب یہاں سے جانے والے ہو گے۔ دیکھو میں سمجھاتا ہوں کہ میرے کیس میں ٹانگ نہ اڑاؤ مجھے کچھ کرنے دو۔"

"آپ کچھ نہ کریں۔ بہت کچھ کریں۔ میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ تلخی سے بولا۔ "شکریہ، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ انسپکٹر ساجد جب تمہاری مدد لیا کرتا تھا تو ہمارے افسران اسے طعنے دیا کرتے تھے کہ اس میں اپنی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ تمہارے کاندھے پر اپنی بندوق رکھ کر چلاتا ہے۔ اسی لئے اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیا تم میرا بھی تبادلہ کرانا چاہتے ہو۔"

"اگر آپ کو میرے تعاون کی ضرورت نہیں تو میں کیا کروں۔ میں تو ہر حال میں ابھی زیبی سے جا کر ملاقات کروں گا۔"

"لیکن تم کیوں اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟ تم اس معاملے میں کیوں پڑ رہے ہو۔ نثار احمد چنگیزی کے قتل سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میرا نہیں بیرسٹر لیلیٰ محسن کا تعلق ہے۔ مقتول چنگیزی لیلیٰ محسن کا مؤکل تھا اور لیلیٰ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں اور معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ مجھے بنایا ہے۔ اب آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو ہر حال میں ابھی زیبی کے پاس جاؤں گا۔"

وہ بولا۔ "میں پہلے اس سے ملوں گا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے میں اس سے ملوں گا۔ آپ نے ضد کی تو ہم دونوں کے درمیان ریس لگے گی۔ ہم میں سے جو بھی پہلے زیبی کے پاس پہنچ جائے۔ دیکھ لیجئے کہ آپ کے

پاس رکشہ ہے اور میرے پاس ادھر اس گلی کے موڑ پر وہ ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔"

اس نے دور کھڑی ہوئی ایک کار کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے کار خرید لی ہے؟"

میں نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔ "ہاں، یہ مجھے بیرسٹر لیلیٰ محسن نے خرید کر دی ہے۔ قسطیں بعد میں ادا کرتا رہوں گا۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ سمجھ گیا کہ رکشہ اس کار سے مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے، میں ان سپاہیوں کو رکشہ میں بھیج دیتا ہوں۔ وہ لوگ زیبی کے مکان تک پہنچ جائیں گے، ہم دونوں اس کار میں چلیں گے۔ دونوں ایک ساتھ پہنچیں گے اور میں سوالات کروں گا تم سنتے رہنا۔ تم سوالات کرو گے تو میں سنتا رہوں گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ ہوئی نا کام کی بات، سپاہیوں کو رخصت کر دیجئے۔"

اس نے سپاہیوں کو رخصت کر دیا۔ پھر میرے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس موڑ پر جانے لگا جہاں کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم جب تک اس کار کے قریب پہنچے اس وقت تک وہ اسٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھتے ہوئے ہم سے دور ہوتی چلی گئی۔ انسپکٹر نے چونک کر کبھی میری طرف اور کبھی اس کار کی طرف دیکھا۔ پھر گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ "جھوٹے مکار میں تم سے نمٹ لوں گا۔ تم نے جھوٹ بول کر میرے آدمیوں کو یہاں سے روانہ کر دیا۔ اب دوڑ، دوڑ، دوڑ........."

"اب میں آپ کو ٹیکسی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔ ہم دونوں ساتھ جائیں گے اور ساتھ زیبی کے مکان میں پہنچیں گے اور ایک ساتھ اس کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔"

اس نے غصے میں تلملاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور نہ ہی تمہیں وہاں جانے دوں گا۔ دیکھتا ہوں کون ٹیکسی والا یا رکشہ والا تمہیں وہاں لے کر جاتا ہے۔ اس شہر کے تمام ٹیکسی ڈرائیور اور رکشہ ڈرائیور مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"انسپکٹر صاحب آپ خواہ مخواہ مجھے دشمنی پر مجبور کر رہے ہیں۔ ابھی پچھلی رات کی بات ہے کہ بھول گئے کہ وہ کیسٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کیسٹ کے ذریعے آپ تبادلہ نہیں ہو گا۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے چھٹی ہو جائے گی۔"

آدھے گھنٹے کے بعد ہم دونوں زیبی کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد زیبی کی والدہ تشریف لائیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "فرمائیے انسپکٹر

صاحب! میرے گھر میں کیسے آنا ہوا؟"

انسپکٹر مولا بخش نے بتایا کہ نثار احمد چنگیزی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ چونک گئیں۔ ذرا گھبرا گئیں۔ ذرا پریشان ہوئیں۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا لیکن اس سے صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا کہ قتل کی بات سن کر صحیح ردعمل کیا ہوا ہے۔ وہ بولیں۔ "اگر نثار احمد چنگیزی کا قتل ہوا ہے تو آپ مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہیں؟"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مقتول چنگیزی سے آپ لوگوں کا کیا تعلق تھا؟"

وہ بولیں۔ "ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر نہیں تھا تو ہونے والا تھا۔"

انہوں نے ذرا گہری نظروں سے مجھے دیکھا' پھر بولیں۔ "ہاں تعلق ہونے والا تھا۔ چنگیزی صاحب میری بیٹی کا رشتہ مانگ رہے تھے۔ پہلے تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سوچ کر جواب دوں گی۔ سوچنے کی مہلت لے کر میں نے ان کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ ان کی ایک بیوی ہے جس کا نام سائرہ بانو ہے۔ جب میں نے چنگیزی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ اپنا دکھڑا رونے لگے۔ کہنے لگے کہ سائرہ بانو ان کی ہم مزاج نہیں ہے اور وہ جلد ہی اسے طلاق دینے والے ہیں۔ اس پر میں نے پوچھا تو میاں میری بیٹی سے شادی کرنے کے بعد اسے طلاق کب دو گے؟" یہ کہہ کر وہ ذرا چپ ہوئیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ "پتا نہیں اس نے میری بیٹی پر کیا جادو کیا تھا۔ وہ اس کے گن گاتی تھی اور اسی سے شادی کرنے کے لئے ضد کرتی تھی۔ میں اس کی ضد سے مجبور ہو گئی' میں نے چنگیزی صاحب سے کہا کہ مہر کی رقم دس لاکھ روپے ہو گی۔ منظور ہے تو بارات لے کر آ جانا۔ دس لاکھ کی بات سن کر وہ سٹپٹایا' ہچکچایا' پھر بولا۔ دس لاکھ تو بہت ہوتے ہیں۔ میں نے کہا طلاق دے کر عورت کو چھوڑنے والے کے لئے دس لاکھ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ جو شریفانہ طور پر ہمیشہ بیوی بنا کر رکھے۔ اس کے سامنے مہر کی اہمیت ایک پیسے کی بھی نہیں ہوتی۔ تم اچھی طرح سوچ لو جس دن دس لاکھ روپے مہر کے ادا کرنا چاہو تو پہلے اپنی بیوی کو طلاق دینا۔ اس کے بعد بارات لے کر میری بیٹی کو بیاہنے کے لئے آنا۔ میری یہ بات سن کر وہ چلا گیا تھا۔ اس نے بعد میں میری بیٹی سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی سائرہ بانو کو طلاق دے گا اور اسے دلہن بنا کر لے جائے گا لیکن وہ آج تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اب آپ لوگ اس کے قتل کی بات سنا رہے ہیں' مجھے یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا مقتول چنگیزی نے زیبی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے نام کوئی

وصیت نامہ لکھ رہا ہے' جس سے آگے چل کر اسے فائدہ پہنچے گا؟"

زیبی کی والدہ نے کہا۔ "ہاں زیبی نے مجھے آ کر بتایا تھا۔ وہ بہت خوش تھی لیکن میں نے کہا میں تمہاری طرح نادان نہیں ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ایک مرد شادی سے پہلے وصیت نامہ لکھ کر کیا کرے گا۔ یہ تو سراسر بے وقوف بنانے والی بات ہے۔ یا جو گھرانے ان باتوں کو نہیں سمجھتے ہیں اور دولت کی چمک دمک دیکھتے ہیں۔ وہ وصیت نامہ کی بات سن کر خوش ہو جاتے ہیں یا پھر تحریری معاہدے کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی خوش رہے۔ میں پوچھتی ہوں بھلا اتنا سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیدھے سادے انداز میں مہر کی رقم باندھ دی جائے اور اس کے بعد نکاح پڑھا دیا جائے۔ دس لاکھ روپے میں نے اسی لئے کہے تھے کہ میری بیٹی کی زندگی کے لئے ایک ضمانت کے طور پر یہ رقم رہے گی اور چنگیزی کے لئے یہ رقم بوجھ بنی رہے گی۔ اس زمانے میں مہر کی تگڑی رقم کی وجہ سے ہی میاں بیوی کے رشتے مضبوط رہتے ہیں۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا آپ اس قتل کے سلسلے میں کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں کہ کون ایسا کر سکتا ہے؟"

وہ بولیں۔ "جنہیں مقتول چنگیزی کے جھوٹے وعدوں اور قسموں پر اور اس کے وصیت ناموں پر یقین ہو گا۔ وہی ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ اپنا فائدہ اور نقصان معلوم کرنے کے لئے ہمیں نہ تو اس کی دولت سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس سے کوئی تعلق تھا۔ اگر ہونے والا تھا تو وہ نہیں ہوا۔ اس لئے ہمارا اس سے کوئی ناطہ نہیں ہے اور آپ لوگوں کو اس سلسلے میں ہم سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہئے۔"

ان کی باتیں سن کر ہم دونوں ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آ گئے۔ چنگیزی کی بیوہ سائرہ بانو اپنے میکے والوں کے ساتھ آ گئی تھی۔ چنگیزی کی کوٹھی میں ماتم بپا تھا۔ کچھ عورتیں اندر رو رہی تھیں اور سائرہ بانو کے میکے کے کچھ مرد باہر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش واپس آ گئی تھی۔ سائرہ بانو کے رشتہ دار تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔ اس وقت ان سے کوئی سوال کرنا مناسب نہ تھا۔ اس لئے میں اپنی رہائش گاہ واپس چلا آیا۔

☆======☆======☆

دوسری صبح لیلیٰ کے پاس پہنچا۔ وہ ہائی کورٹ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میرے ساتھ سائرہ بانو سے ملنے نہیں چلو گی؟"

وہ بولی۔ "میں بہت مصروف ہوں۔ تمہارے ساتھ تفریح میں پرسوں رات میں نے

خاصا وقت گزارا ہے۔ اپنا کام نہیں کر سکی تھی جس کی وجہ سے مصروفیت اور بڑھ گئی ہے۔ اگر جلد ہی فرصت ملی تو میں تم سے رابطہ قائم کروں گی۔"

میں اس کے پاس سے چنگیزی کی کوٹھی پہنچا۔ وہاں ماتمی سکوت چھایا ہوا تھا۔ سائرہ بانو کے ماموں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میں نے کہا۔ "میں سائرہ بانو سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "میری بھانجی پردہ نشین ہے۔ وہ آپ سے براہِ راست گفتگو نہیں کرے گی۔ آپ مجھ سے سوالات کریں۔ جن سوالات کے جواب میں نہیں دے سکوں گا وہ میں اپنی بھانجی سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کی بھانجی کو چنگیزی صاحب کی ہلاکت کے سلسلے میں کن لوگوں پر شبہ ہے؟"

وہ بیزار ہو کر بولا۔ "یہ گھسا پٹا سوال ہم سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ کل رات ایک انسپکٹر صاحب ہمارا سر کھاتے رہے۔ بڑی مشکلوں سے ان سے پیچھا چھڑایا۔ بھئی ہم کیا بتائیں۔ جن لوگوں کو چنگیزی صاحب کی وصیت سے نقصان پہنچا تھا اور وہ دولت حاصل نہیں کر سکے تھے ان لوگوں ہی نے یہ ہلاکت کا سامان کیا ہو گا۔"

"کیا آپ لوگوں کو یقین ہے کہ مقتول کی وصیت سے آپ کی بھانجی کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

"جی نہیں، ہمیں پورا یقین ہے کیونکہ وہ اپنی سابقہ بیوی زرینہ بیگم سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ صرف طلاق نہیں دی تھی، میری بھانجی سے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ہم مزاج تھے، خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ لہٰذا یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ چنگیزی صاحب میری بھانجی کے خلاف کوئی وصیت لکھیں گے۔ ویسے آپ نے ابھی اپنا تعارف کرایا تھا کہ آپ بیرسٹر لیلیٰ محسن کے اسسٹنٹ ہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ انہوں نے وصیت میں کیا لکھا ہے؟"

میں نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، وہ وصیت نامہ ایک لفافے میں بند ہے اور وہ لفافہ سربمہر ہے۔ اسے ہم میں سے کوئی نہیں کھول سکتا۔"

"بیرسٹر لیلیٰ محسن تو کھول سکتی ہیں۔"

میں نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "ہاں کھول سکتی ہیں لیکن جب تک قاتل کا سراغ نہیں ملے گا اس وقت تک وہ لفافہ ایک راز بنا رہے گا۔ کیونکہ جب تک وہ راز بنا رہے گا اس وقت تک وہ قاتل بے چین رہے گا۔ اس لفافے تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور

س کی یہی غلطی ہمیں اس کے پاس پہنچا دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ دشمنوں سے تو اس لفافے کو چھپانا چاہئے لیکن میری بھانجی تو مقتول ہنگیزی کی شریک حیات تھی اور اب اس کی بیوہ ہے۔ مقتول کی دولت جائیداد اور اس کی یک ایک چیز پر میری بھانجی کا حق ہے میری بھانجی قانوناً اس لفافے کو کھول کر دیکھنے کا حق رکھتی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "یقیناً وہ اس بات کی حقدار ہے لیکن ابھی نہیں، جب تک اتل گرفت میں نہ آئے۔"

اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "آخر کیوں؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ ایک وارث جانتا ہے کہ ساری دولت اور بائیداد اسے ہی ملے گی۔ اس کے باوجود وہ قتل کرتا ہے تاکہ مقتول کی دولت جلد سے بلد اس کے ہاتھ آ جائے۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا آپ میری بھانجی پر یا ہم میں سے کسی پر بہ کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "آپ اتنا غصہ نہ دکھائیں، جب کسی کا قتل ہوتا ہے تو اس کے عزیز بشتہ دار، اپنے پرائے، دوست یا دشمن کوئی بھی شبہے سے بالاتر نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ سکون ہو کر باتیں کریں۔"

وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اور زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔ کوئی کام کی ت ہو تو آپ کریں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے لئے شاید کام کی بات یہی ہو گی کہ اس وصیت نامہ کو آپ لوں کے سامنے کھول دیا جائے اور یہ ابھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جانے سے پہلے میں نے کہا۔ "میری ایک بات کا جواب دے یں۔ اس کوٹھی میں اتنا سناٹا کیوں ہے، کیا چنگیزی صاحب کے رشتہ دار یہاں نہیں ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "چنگیزی صاحب کے رشتہ دار کل آئے تھے اور کل ہی واپس بلے گئے۔ اب یہاں عورتوں میں صرف میری بہن اور بھانجی ہیں، مردوں میں میں ہوں ر کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"شکریہ!" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن لیلیٰ نے مجھے بتایا کہ شام کو سائرہ بانو کی والدہ اس سے ملنے آئی تھیں ر کہہ رہی تھیں کہ وصیت نامے کے متعلق انہیں کچھ بتایا جائے۔ سائرہ بانو اس کے

ساتھ نہیں تھی۔ پتا چلا کہ اسے سخت صدمہ پہنچا ہے' وہ غم سے نڈھال ہے' گھر سے نہیں آ سکی۔ دوسری بات یہ کہ سائرہ بانو دوسری صبح اپنے میکے چلی جائے گی کیونکہ وہاں پولیس والے آ کر خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔ ابھی وہ کسی کے سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔"

میں نے لیلیٰ سے پوچھا۔ "تم نے وصیت کے متعلق کیا جواب دیا۔"

وہ بولی۔ "اور کیا جواب دوں گی۔ میں نے کہہ دیا کہ وصیت نامہ تمہارے پاس رکھا ہوا ہے۔ چونکہ اس وصیت نامے کو رکھنے میں جان کا خطرہ ہے۔ کوئی مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے' اس لئے چنگیزی صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اسے ابن شہاب کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ سن کر اس کی والدہ واپس چلی گئیں لیکن جانے سے پہلے اپنا ایڈریس دے گئی ہیں تاکہ وصیت نامہ کھولتے وقت انہیں بلا لیا جائے۔"

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر مقتول چنگیزی کے نمبر ڈائل کئے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ قائم ہوا تو میں نے دوسری طرف سے سائرہ بانو کے ماموں کی آواز پہچان لی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا کہ پچھلے دن ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ میری بھانجی اور بہن یہاں سے جا چکی ہیں۔ میں اس کوٹھی میں تنہا اس لئے رہ گیا ہوں کہ کوٹھی کی نگرانی بھی کرنی ہے اور پولیس والوں کو جوابات بھی دینے ہیں۔ آپ کس سوال کا جواب چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "بس اسی سوال کا جواب چاہئے تھا کہ چنگیزی کی بیوہ یہاں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر وہ جا چکی ہیں تو آپ سے باتیں کرنا فضول ہے۔"

اس نے کہا۔ "دیکھئے ریسیور رکھنے سے پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ لوگ کب تک قاتل کو گرفتار کر لیں گے۔ کیونکہ اس وصیت نامے کو ہمارے سامنے جلد سے جلد کھولنا چاہئے۔ ہم سائرہ بانو کی سوکن اور اس کے خاندان والوں سے ڈرتے ہیں کہ وہ کوئی چال نہ چلیں۔"

"آپ کا اشارہ کیا زرینہ کی طرف ہے؟"

اس نے کہا۔ "اور کس کی طرف ہو گا۔ وہ بہت مکار عورت ہے۔"

میں نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خبردار' آپ زرینہ کو ایسے الفاظ میں یاد نہ کریں۔ وہ میری بہترین دوست ہے۔ ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتا۔"

دوسری طرف سے چیخ کر پوچھا گیا۔ "کیا وہ آپ کی دوست ہیں؟ آپ دونوں میں

گہرے تعلقات ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری بھانجی کو آپ کی طرف سے بھی خطرہ ہے۔ آپ اس وصیت نامے میں کوئی ہیرا پھیری کر سکتے ہیں۔"

"آپ بکواس کر رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ریسیور رکھ دیا۔

لیلیٰ مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ان لوگوں کو الجھانے کے لئے اور ان لوگوں کے درمیان سے قاتل کو ڈھونڈ لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک کے خلاف دوسرے کو بھڑکایا جائے۔ اب سائرہ اور اس کے تمام خاندان والے یہ سن کر بے چین ہوں گے کہ میرے اور زرینہ کے تعلقات کچھ رازدارانہ قسم کے ہیں۔ لہٰذا میں وصیت نامے میں زرینہ کی خاطر ہیرا پھیری کر سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے شرارت سے لیلیٰ کو آنکھ ماری۔ وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ "ایسا اوچھا پن نہ کیا کرو۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ تم کیوں اپنے آپ کو کسی زرینہ وغیرہ سے وابستہ کرتے ہو۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے زرینہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' میں زرینہ بول رہی ہوں۔ بیرسٹر لیلیٰ محسن سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ بیرسٹر لیلیٰ محسن کا ہی فون ہے اور میں ابن شہاب بول رہا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "مسٹر شہاب ٹھہر جایئے۔ فون لیلیٰ صاحبہ کو نہ دیجئے' میں آپ ہی سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے' بات کریں۔"

اس نے کہا۔ "آپ اس روز آئے تو میں آپ کے شایانِ شان نہ تو گفتگو کر سکی اور نہ ہی کوئی خاطر تواضع کر سکی۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

"کوئی بات نہیں آپ کام کی بات کریں۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ وصیت نامہ میرے خاوند نے آپ کے حوالے کیا ہے' میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس میں میرا اور میری بچی کا کتنا حصہ ہے۔"

"افسوس کہ میں اس وصیت نامے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ مجھے جس طرح ملا تھا میں نے اسے اسی طرح چھپا کر رکھ دیا ہے۔ جب تک قاتل گرفتار نہیں ہو گا اس وقت تک وہ وصیت نامہ نہیں کھولا جائے گا۔ ویسے آپ کو اتنی بے چینی کیوں ہے؟"

"مجھے بے چینی اس لئے ہے کہ میں اپنی اولاد کا مستقبل بہتر بنانا چاہتی ہوں۔ ہر

بیوی یہی چاہتی ہے کہ جب اس کا شوہر دنیا میں نہ رہے تو اس کی اولاد کے لئے مستقبل میں کچھ ہو سکے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے' مقتول چنگیزی نے اپنی سابقہ بیوی اور بچی کے لئے جائیداد میں سے ضرور کچھ حصہ رکھا ہو گا۔ ویسے سائرہ بانو بھی بہت بے چین ہے اور وصیت نامہ دیکھنے کی ضد کر رہی ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ میرے ان سے بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ میں انہیں بھی سمجھا رہا ہوں کہ وہ ضد نہ کریں لیکن آپ تو جانتی ہی ہیں کہ تعلقات کیسے ہوتے ہیں۔ یہ انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ مقتول چنگیزی نے مجھے وصیت نامہ دے کر اچھا نہیں کیا۔ میں آزمائش میں پڑ گیا ہوں۔"

دوسری طرف سے زرینہ کی آواز سنائی دی۔ "اچھا تو سائرہ سے آپ کے قریبی مراسم ہیں۔ یہ بات مجھے معلوم نہ تھی۔ سنا ہے کہ وہ میکے چلی گئی ہے۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہاں' مجھے اس کے میکے تک روز دوڑ لگانی پڑتی ہے۔ نہ جاؤں تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔"

دوسری طرف سے فوراً ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھا تو لیلیٰ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "خوب تم عورتوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا جانتے ہو۔"

☆======☆======☆

چالیس دن گزرنے کے بعد زلیخا کا ایک خط بیرسٹر لیلیٰ محسن کے نام آیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ اسے نثار احمد چنگیزی کی موت کا جب علم ہوا تو وہ شدید صدمات کے باعث بیمار ہو گئی تھی اور اب چالیس دنوں کے بعد خط لکھ رہی ہے تاکہ اگر وصیت نامے کے مطابق نثار احمد چنگیزی نے اپنی سابقہ بیوی زلیخا اور اس کے بچے کو یاد کیا تو اسے فلاں پتے پر اطلاع دی جائے۔

زلیخا کا پتہ ملتے ہی میں اس کے پاس پہنچا۔ اس نے جب اپنی داستان سنائی تو وہ دوسروں کی داستان سے مختلف نہیں تھی۔ اسے بھی زرینہ کی طرح چنگیزی نے شادی کرنے کے بعد چھوڑ دیا تھا اور طلاق نہیں دی تھی۔ اسے سمجھا دیا تھا .... کہ اگر زرینہ کے خاندان والے اس سے دریافت کریں تو وہ یہی کہہ دے کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ اس نے شوہر کی خوشی کی خاطر اور اس کی عزت رکھنے کی خاطر اس کے سمجھانے کے مطابق یہ مشہور کر دیا تھا کہ اسے طلاق ہو گئی ہے۔ ورنہ وہ ابھی تک چنگیزی کی محبت

کو سینے میں دبائے زندہ تھی۔

☆======☆======☆

دو ماہ اور گزر گئے۔ ایک رات جب میں اپنے گھر میں نہیں تھا تو کسی نے میرے گھر کی تلاشی لی۔ صبح جب میں آیا تو میرے دونوں کمروں کا سامان اِدھر اُدھر الٹا پڑا تھا۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں۔ دراز باہر نکلے ہوئے تھے۔ فائلیں الٹ پلٹ ہو گئی تھیں۔ ایسی بے ترتیبی تھی جیسے مجرموں نے بڑے اطمینان سے ایک ایک چیز کی تلاشی لی ہو۔ ظاہر تھا کہ تلاشی لینے والے وصیت نامہ تلاش کر رہے ہوں گے۔

میں نے اپنا وہ گھر چھوڑ دیا۔ رہائش کے لئے اس کاٹیج میں چلا آیا جو لیلیٰ نے مجھے دیا تھا۔ ایک رات میں اور لیلیٰ دو بجے تک تفریح میں مصروف رہے۔ جب احساس ہوا کہ بہت رات گزر چکی ہے تو لیلیٰ نے کہا۔ "اب تم اتنی دور سپر ہائی وے کی طرف کہاں جاؤ گے' میری کوٹھی میں چلو وہاں کسی بیڈ روم میں رات گزار لینا' صبح چلے جانا۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔ "بیڈ روم میں نیند کہاں آئے گی۔ سنا ہے پہلی رات جاگتے جاگتے گزر جاتی ہے۔"

وہ گھور کر بولی۔ "زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو۔ میری کوٹھی میں کئی بیڈ روم ہیں' میں تمہیں کہیں بھی دھکا دے دوں گی۔"

ہم اس کوٹھی میں پہنچے تو وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ اندر ویسی ہی بے ترتیبی تھی۔ جیسی میری رہائش گاہ میں پائی گئی تھی۔ بیرسٹر لیلیٰ محسن کے گھریلو دفتر کی دل کھول کر تلاشی لی گئی تھی۔ تمام فائلوں کو الٹ پلٹ رکھ دیا گیا تھا۔ لیلیٰ یہ منظر دیکھتے ہی سر تھام کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ "اف میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ اب ان فائلوں کو درست کرنے میں ہفتوں لگ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اب آئندہ کوئی تلاشی نہیں لے گا جو لوگ تلاشی لے کر گئے ہیں انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ تمہارے گھر میں بھی وہ وصیت نامہ نہیں ہے۔ اب اس کاٹیج کی باری ہے جہاں میں رہتا ہوں۔"

☆======☆======☆

نثار احمد چنگیزی کی ہلاکت کو پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ ایک رات بڑی بارش ہو رہی تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں کاٹیج میں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر ابھی نئی آبادی تھی۔ دور دور کے مکانوں میں کچھ لوگ آباد تھے۔ میں تنہا اپنے کاٹیج میں بیٹھا ایک فائل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک ہی بارش کے شور میں مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی

دی۔ میرا وہ کاٹیج لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ دیواریں بھی اور فرش بھی لکڑی کے تختوں کی تھیں۔ اسی لئے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر اچانک ہی کوئی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "کون ہے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے دروازہ کھول کر اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ باہر سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ "دروازہ کھولو' خدا کے لئے جلدی دروازہ کھولو' ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دروازے کو کھولا۔ ایک عورت لڑکھڑاتی ہوئی اندر آئی۔ میں نے دوسرے ہی لمحے دروازے کو بند کر دیا۔

میں نے دروازے کی طرف سے گھوم کر دیکھا۔ وہ لکڑی کی دیوار سے منہ لگائے کھڑی ہوئی تھی اور اس بُری طرح ہانپ رہی تھی جیسے اپنی برداشت سے باہر نہ جانے کتنا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا ہو۔ میں نے پوچھا۔ تم کون ہو' کہاں سے آ رہی ہو' اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

میرے سوال کرنے پر وہ آہستہ آہستہ دیوار کی طرف سے پلٹ کر میرے روبرو ہو گئی۔ تب میں نے دیکھا۔

وہ ماں بننے والی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو پکڑ کر ہانپتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں کے ایک زچہ خانے میں تھی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں آج صبح ہونے سے پہلے ماں بن جاؤں گی۔ یہ میرے درد و کرب کی رات ہے لیکن آنے والی صبح میرے لئے خوشیوں کا پیغام لائے گی۔ میری بدنصیبی کہ ایسے ہی وقت وہ قاتل میرے پاس پہنچ گیا۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون قاتل؟"

اس نے کہا۔ "وہی جس نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔ اب وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرا یہ ہونے والا بچہ اس کا ہے۔ لہٰذا جب میں اس بچے کو جنم دوں گی تو وہ اسے اٹھا کر لے جائے گا۔"

وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگی۔ اس کے چہرے سے درد و کرب کے آثار صاف ظاہر تھے۔ میں نے پوچھا۔ "آخر وہ کون قاتل ہے' تمہارا نام کیا ہے' تمہارا شوہر کون ہے' کچھ بتاؤ تو سہی؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیٹ کو پکڑ رکھا تھا اور تکلیف کی زیادتی سے وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں کو تھام لیا۔ اگر میں ذرا

بھی دیر کرتا تو وہ فرش پر گر پڑتی۔

میں اسے سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میرا پلنگ بچھا ہوا تھا' میں نے اس پر اسے لٹا دیا۔ مگر اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر زچگی اس گھر میں ہو گئی تو میرا سارا بستر خراب ہو جائے گا اور میں کسی دائی کے فرائض انجام دے سکوں گا یا نہیں۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ مجھے الجھا رہی تھیں۔ میں نے اس سے پھر پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ کچھ بتاؤ؟"

وہ اپنے سر کو کبھی دائیں کبھی بائیں تکیے پر مار رہی تھی اور تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ میری بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ کراہتے ہوئے بولنے لگی۔ "وہ قاتل آ گیا ہے۔ وہ میرے بچے کو مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔"

میں نے اس کے دونوں شانوں کو تھام کر دوبارہ لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم فکر مت کرو' میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

وہ میرے ایک ہاتھ کو جھٹک کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ "نہیں میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ مجھے کہیں چھپا دو۔ یہاں کہیں چھپنے کی جگہ ہے؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی' اس کمرے میں اوپر مچان بنا ہوا تھا۔ اس مچان پر چڑھنے کے لئے لکڑی کی ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔

میں نے اوپر مچان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں بہت سا فضول سامان رکھا ہوا ہے تم وہاں کہاں چھپ سکو گی۔ تمہارے چھپنے کے لئے جگہ بنانی ہو گی۔ پھر یہ کہ میں تمہارا محافظ ہوں' گھبراؤ نہیں میرے پاس ریوالور ہے' میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھی کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا۔ وہ سیڑھی کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ضد کرنے لگی کہ اوپر مچان میں جا کر چھپ جائے گی۔

میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے' میں اوپر جگہ بنا کر تمہیں فوراً وہاں پہنچا دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جانے لگا۔ ابھی آدھا زینہ طے کیا تھا کہ دوسرے کمرے سے ایک دھماکے کی آواز آئی جیسے کوئی چیز ٹوٹی ہو۔ کوئی کھڑکی توڑ کر اندر آ گیا تھا لیکن اس وقت میں سمجھ نہیں سکا۔ عورت کی ایک زبردست چیخ سنائی دی۔ چیخ سن کر یہی سمجھ میں آیا کہ زچگی ہو گئی ہے۔

بات کچھ اور تھی۔ اس کاٹیج کی ایک کھڑکی کی چٹخنی کمزور تھی' ہوا کے جھونکوں سے

اور کمزور ہو گئی تھی۔ اسے آنے والوں نے کھول لیا تھا۔ آنے والے دو تھے۔ ایک باقاعدہ لباس میں تھا۔ فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا صرف لنگوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوتے ہی صوفے کے پاس گئے' صوفے پر ایک چرمی بیگ رکھا ہوا تھا۔ فلیٹ ہیٹ والے نے اس چرمی بیگ کو اٹھا لیا۔ اس کے پاس ہی وہ گنجا آدمی صرف لنگوٹ پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ میں نے فوراً ہی سیڑھی پر سے چھلانگ لگائی' فرش پر آیا۔ پھر وہاں سے دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس وقت تک وہ چرمی بیگ اٹھا کر کرسی کے پاس جا رہا تھا۔ ننگے اور گنجے آدمی نے اچانک ہی میری طرف چھلانگ لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' اس کی زوردار لات میرے سینے پر پڑی۔ مجھے ایسے ہی لگا جیسے ہتھوڑے سینے پر لگے ہوں۔ میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ وہاں سے کھلے ہوئے ادھورے دروازے پر گر پڑا۔ میرے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر کہیں چلا گیا تھا۔

ہیٹ والا شخص چرمی بیگ لے کر کھڑکی کے راستے بھاگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر نکل تو گیا لیکن گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا تو وہ بیگ واپس کمرے میں آ کر گرا۔ اسے لینے کے لئے وہ دوسری بار کمرے کے اندر آیا۔ اس وقت ٹھائیں سے گولی چلی۔ وہ اپنے ایک شانے کو پکڑ کر جھک گیا۔ پھر جھکتا ہی چلا گیا۔ فائرنگ ہوتے ہی وہ گنجا آدمی فضا میں غوطہ کھاتا ہوا کھڑکی سے باہر چلا گیا۔ پھر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس زخمی آدمی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ تبھی پیچھے سے للکارنے کی آواز آئی۔ وہ حاملہ عورت کہہ رہی تھی۔ "خبردار میری مرضی کے بغیر کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ میں تمہیں بھی گولی مار دوں گی۔"

میں نے پلٹ کر حیرانی سے دیکھا اس نے میرا ریوالور دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا اور مجھے نشانے پر لے کر کہہ رہی تھی۔ "اس بیگ میں سے وہ لفافہ نکال کر میرے حوالے کرو جو کہ چنگیزی نے تمہیں دیا ہے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں کوئی بھی ہوں' وہ لفافہ میرے حوالے کر دو۔"

دوسری طرف سے اس زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں بتاتا ہوں' یہ سائرہ بانو ہے۔"

"سائرہ بانو۔" میں نے پلٹ کر اس عورت کو حیرانی سے دیکھا۔

وہ بولی۔ "ہاں میں سائرہ بانو ہوں۔ میں نثار احمد چنگیزی کی بیوی ہوں۔ وہ وصیت

نامہ میرے حوالے کر دو۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس لفافے میں کیا ہے۔ یہ صرف میں جانتی ہوں۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ میں نے اسے باتوں میں الجھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ اس لفافے میں وصیت نامہ نہیں کوئی اور چیز ہے۔"

"ہاں' جو کچھ بھی ہے اس کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اس چرمی بیگ کو کھول کر لفافہ میرے حوالے کر دو۔"

میں نے پوچھا۔ "تم لوگوں نے آخر یہ کیسے سمجھ لیا کہ چنگیزی کا دیا ہوا لفافہ اس چرمی بیگ میں ہو گا۔"

اس زخمی نے دوسری طرف سے کراہتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری غیر موجودگی میں اس کاٹیج میں دو تین بار تلاشی لے چکے ہیں۔ ہمیں کہیں سے بھی وہ لفافہ نہیں ملا۔ یہ چرمی بیگ آج پہلی بار دیکھا ہے تو یہی خیال گزرا کہ اس میں وہ لفافہ ضرور ہو گا۔"

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اس لفافے کو اپنے ساتھ لئے پھروں۔ میں نے اسے بینک کے لاکر میں رکھا ہوا ہے۔"

سائرہ بانو نے تکلیف سے چیختے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے سامنے اس بیگ کو کھولو' میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس میں کیا ہے۔"

میں ان کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک حاملہ عورت دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی' دوسری طرف ایک زخمی گولی کھا کر کراہ رہا تھا۔ اس زخمی نے کہا۔ "سائرہ میری بات مانو اور مسٹر شہاب کو اپنے اعتماد میں لے لو۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے ہمارا سمجھوتہ ہو جائے۔ ہم تینوں مل کر سوچیں گے کہ آئندہ چنگیزی کی دولت اور جائیداد میں سے کس کو کتنا حصہ ملنا چاہئے۔"

وہ درد سے نڈھال ہو کر بولی۔ "تم جھوٹے بے ایمان ہو۔ میں تم پر بھروسا نہیں کروں گی۔ تم میرے بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔"

"سائرہ یہ تمہاری زیادتی تھی' تم خود ایمان سے کہو' یہ بچہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی ہے۔ ہم دونوں کا ہے۔ مگر تم ہو کہ بچے کے باپ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے باتوں میں نہ الجھاؤ۔ میں کہتی ہوں اس بیگ کو کھولو مسٹر شہاب میں تین تک گنتی ہوں اگر تم نے اس بیگ کو کھول کر مجھے نہ دکھایا تو میں گولی مار دوں گی۔"

میں بیگ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ گننے لگی۔ "ایک .... آہ۔"

وہ گنتی بھی جا رہی تھی اور کراہتی بھی جا رہی تھی۔ "دو .... آہ۔"

تیسری بار وہ کراہتے ہوئے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میری طرف لیکن وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی گولی چلا سکتی ہے لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے لمحہ مجھے ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

میں الٹے قدموں چلتا ہوا سائرہ بانو کے قریب پہنچا۔ پھر کن انکھیوں سے اس ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ میں نے اسے فوراً اٹھا لیا۔ اسی وقت وہ زخمی بھی آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا اسی ریوالور کے قریب پہنچنے کوشش کر رہا تھا۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں مسٹر اب تم اس کرسی بیٹھ جاؤ اور میرا وہ لیٹر پیڈ لے کر اس میں اپنی داستان لکھو کہ کس طرح سائرہ بانو تعلقات قائم ہوئے اور تم لوگوں کی پلاننگ کیا تھی؟"

وہ عاجزی سے گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مسٹر شہاب میری حالت بہت خراب مجھے زخم لگا ہے اور گولی اندر رہ گئی ہے۔ میں تکلیف سے مرا جا رہا ہوں۔ مجھے پہلے امداد پہنچائیں۔ گولی نکالنے کا انتظام کریں۔ پھر میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں مسٹر پہلے تم تکلیف سے اسی طرح تڑپتے ہوئے کراہتے ہو۔ اپنی داستان لکھو گے اس کے بعد میں تمہیں ہسپتال پہنچاؤں گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ یہ جلد سے جلد ہو تو تم میرے حکم کی تکمیل جلد سے جلد کرو۔"

وہ ایک ہاتھ سے میز کا سہارا لے کر فرش پر سے اٹھا۔ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر پیڈ اور قلم بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم جو کچھ لکھتے جاؤ اسے اونچی آواز میں بو بھی جاؤ تاکہ سائرہ بھی سنتی رہے کہ تم کیا لکھ رہے ہو۔"

مجھے یاد آیا کہ ایک چھوٹا کیسٹ ریکارڈر نیچے والی دراز میں رکھا ہوا ہے' میں اسے نکالا پھر اس کے اندر لگے ہوئے کیسٹ کو ریوائنڈ کرنے کے بعد اسے آن کر دیا۔ سیکنڈ کے بعد وہ شخص لکھتے ہوئے بولنے لگا۔ "میرا نام جمشید ہے۔ سائرہ میری دور رشتہ دار ہے۔ یہ نثار احمد چنگیزی کے بچے کی ماں بننا چاہتی تھی لیکن جب چار بر گزرنے لگے تو اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر کوئی اولاد نہ ہوئی اور چنگیزی نے اولاد لئے دوسری شادی کر لی تو پھر اس کا حق مارا جائے گا۔ شادی سے پہلے سائرہ بانو مجھ محبت کرتی تھی لیکن دولت کے لالچ میں اس نے چنگیزی سے شادی کر لی تھی۔ پھر ا

میری ضرورت پڑی تو ہم پھر ایک ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی سائرہ کے پاؤں بھاری ہو گئے لیکن جس بات کے لئے وہ ضد کر رہی تھی' یعنی ماں بننا چاہتی تھی' ایک بچے کو جنم دے دینا چاہتی تھی۔ اب اسی بات سے گھبرانے لگی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ شاید چنگیزی کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا ہے یا اسے شبہ ہے۔"

میرے پیچھے سے سائرہ بانو کی آواز آئی۔ وہ بول رہی تھی۔ "جمشید جب تم میری بے حیائی کی داستان لکھ رہے ہو اور تحریر کے ذریعے میرے بچے کو ناجائز ثابت کرنا چاہتے ہو تو پھر سچی بات یہ بھی لکھ دو کہ تم نے میرے شوہر کو قتل کیا تھا۔"

جمشید نے کہا۔ "ہاں' مگر اس قتل کے منصوبے میں تم بھی شریک تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر چنگیزی مارا جائے یا کسی طرح اس دنیا سے اٹھ جائے تو اس کی تمام دولت اور جائیداد ہمارے بچے کو ملے گی۔ ہم اس دولت پر عیش کریں گے۔ مجھے یہ منصوبہ فائدہ مند نظر آیا اور میں نے اس پر عمل کیا۔ تم نے مجھے بتایا کہ وہ کس طرح شام کو بیٹھ کر شراب پیتا ہے اور کس طرح اس کی بوتل یا گلاس میں زہر ملا دیا جائے تو اس کا قصہ تمام ہو جائے گا۔"

ان دونوں نے آپس میں لڑنے کے دوران ایک دوسرے کا بھید کھول دیا۔ جمشید اس سے لڑتا بھی جا رہا تھا اور میرے آگے گڑگڑاتا جا رہا تھا کہ اسے فوراً ہی طبی امداد پہنچائی جائے۔ میں سنگدل بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "پہلے پوری داستان لکھ دو۔ اپنے دستخط کر دو۔ پھر میں تمہیں فوراً ہی ہسپتال پہنچاؤں گا۔" آخر اس نے کسی طرح اپنی داستان مکمل کی۔ اس کے نیچے اپنے دستخط کئے۔ پھر ایک دم سے نڈھال ہو کر میز پر اوندھا ہو گیا۔ میں نے ان کاغذات کو اپنے قبضے میں لیا پھر اس کو اِدھر اُدھر سے ہلا کر دیکھا اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے سائرہ بانو کی طرف دیکھا وہ اپنے بچے کو ایک بازو میں سمیٹ کر فرش پر گھسٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔ تمام فرش پر خون پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف جمشید کے شانے سے بہتا ہوا لہو میری میز پر پھیل رہا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

میں نے اس بچے کو اور اس کے ماں باپ کو کس طرح ہسپتال پہنچایا اور پولیس والوں نے اس سلسلے میں کیا کچھ کہا۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اصل داستان کا یہ پہلو تشنہ رہ گیا تھا کہ اس لفافے میں کیا تھا جو کہ چنگیزی نے مجھے دیا تھا کیونکہ سائرہ بانو کہہ چکی تھی

کہ اس میں وصیت نامہ نہیں ہو گا بلکہ کوئی اور چیز ہے۔

یہ بات میں نے لیلیٰ کو بتائی۔ لیلیٰ نے کہا۔ "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہم لفافہ کھولیں گے تو ہمیں حقیقت کا پتا چل جائے گا لیکن لفافہ حقداروں کے سامنے کھولنا چاہیئے۔"

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے زلیخا اور زرینہ کو اطلاع دی کہ وہ دوسرے دن بیرسٹر لیلیٰ محسن کی کوٹھی میں آ جائیں تاکہ ان کے سامنے وصیت نامہ پڑھا جائے۔ سائرہ بانو قانون کی گرفت میں تھی۔ لیلیٰ نے اپنی ضمانت پر اسے دوسرے دن بلایا۔ ان تینوں عورتوں کے ساتھ ان کے رشتہ دار بھی چلے آئے۔ ان سب کے سامنے وہ لفافہ کھولا گیا۔ لفافے میں کتنے ہی کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے ایک خط میرے نام تھا۔ چنگیزی نے لکھا تھا۔ "مسٹر شہاب میرے یہ تمام کاغذات صرف زلیخا' زرینہ اور سائرہ بانو کی موجودگی میں پڑھے جائیں۔ اگر کوئی غیر ضروری شخص ہو تو اس سے معذرت چاہی جائے۔ اگر یہ تینوں عورتیں چاہیں گی تو ان کاغذات کو سن لینے کے بعد باہر جا کر اپنے رشتہ داروں سے ان کا ذکر کریں گی۔ ورنہ میں چاہتا ہوں کہ ان تینوں کے علاوہ کاغذات پڑھتے وقت اور کوئی نہ ہو۔"

میں نے چنگیزی کے اس خط کو بلند آواز سے پڑھا تھا۔ وہاں لیلیٰ کے ڈرائنگ روم میں تمام لوگ موجود تھے۔ کتنے ہی لوگوں نے برا سا منہ بنایا۔ لیلیٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "زلیخا' زرینہ اور سائرہ بانو میرے ساتھ میرے دفتری کمرے میں آ جائیں۔ ہم وہیں ان کاغذات کو پڑھیں گے اور انہیں سنائیں گے۔"

وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھ گئیں اور اپنے رشتہ داروں سے کچھ نہ کچھ کہہ کر انہیں تسلیاں دے کر ہمارے ساتھ لیلیٰ کے خاص کمرے میں آ گئیں۔ اس کمرے کے دروازے کو اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ پھر میں نے دوسرے کاغذات نکال کر پڑھنا شروع کئے۔ "میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں ایک عیاش آدمی ہوں۔ ایک بھنورا ہوں۔ جو کلی کلی' پھول پھول اور چمن چمن اڑتا پھرتا ہے لیکن دنیا میں جتنے بھی عیاش مرد ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں عیاش نہ ہوں۔ ان کی وفادار بیویاں ہوں۔ اپنے مرد کے سوا کسی دوسرے کا منہ نہ دیکھیں اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ پہلے میں نے زلیخا کو اپنایا۔ ہمارا تین برس تک ساتھ رہا۔ اس دوران میں اس کی وفا کو آزماتا رہا۔ تین برس کے بعد میرے بارہا ضد کرنے پر وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ میں اس سے دل برداشتہ ہو کر زرینہ کی طرف مائل ہوا۔ زرینہ کے ساتھ بھی کم از کم چار سال گزارے' چوتھے سال جب وہ

ی بچے کی ماں بن گئی تو میں نے اسے چھوڑ کر سائرہ کی طرف رُخ کیا اور اسے اپنا لیا۔ ن برس سائرہ بانو کے ساتھ گزرے' پھر یوں ہوا کہ میں اسے بھی اکثر یہی کہتا تھا کہ مجھے بچے کی خواہش ہے اور یہ بات اس کے دماغ میں ڈالتا رہتا تھا کہ اگر بچہ نہ ہوا تو میں بچے ی خاطر ایک اور شادی کر لوں گا۔ پتہ نہیں سائرہ بانو بچہ کی ماں بنے گی یا نہیں لیکن رات ں نے نشے کی حالت میں سائرہ بانو کو اپنی اصلیت بتا دی کہ میں کبھی بچے کا باپ نہیں بن تا۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ میں ہر سال اپنا چیک اپ کراتا ہوں اور ہر سال ڈاکٹری پورٹ یہی ہوتی ہے کہ میں بانجھ ہوں اور کبھی بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔ ان عورتوں ی گود میں جو بچے ہیں وہ دولت کے حصول کی خاطر لالچ کے اندھیرے سے حاصل کئے ئے بچے ہیں۔ بے شک میں عیاش ہوں۔ ہرجائی ہوں لیکن ان عورتوں سے بھی پوچھا ئے کہ یہ خود کیا ہیں۔ تالی .... دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے ی بجتے ہوئے دیکھتا آ رہا ہوں۔ دوسری صبح ہوش میں آنے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ا کہ میں نے پچھلی رات سائرہ بانو سے اپنی اصلیت اگل دی ہے۔ یہی سوچ کر میں اپنی روداد لکھ رہا ہوں اور وصیت نامے کے ساتھ تمام ڈاکٹری سرٹیفکیٹ منسلک کر رہا ں۔ یہ تقریباً دس برس کے سرٹیفکیٹ ہیں اور یہ دس سرٹیفکیٹ ہیں جو اس بات کا ت ہیں کہ میں کسی بھی بچے کا باپ نہیں ہوں۔

پتہ نہیں میری زندگی کتنی ہے' میں کب مرجاؤں اور جب مرجاؤں گا تو اللہ تعالیٰ ، حضور مجھے اپنے گناہوں کا حساب دینا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں ناہوں کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر لوں اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں ان بچوں سے نیکی وں جن کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ماؤں کا ہے یا ان مردوں کا ہے جو ان بچوں کے بنے اور پھر اپنا منہ چھپاتے پھرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن لوگو! تمہیں تمہاری ماؤں کے نام سے پکارا ئے گا۔ شاید اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بدکار عورتوں کو بھی قیامت ، دن شرمندہ نہیں کرنا چاہتا یا وہ اولاد کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لئے انہیں ان کی ں کے نام سے پکارا جائے گا۔ پھر میں خدا کا ایک ناچیز بندہ ہوں' میں اپنی زندگی میں ان توں کو یا ان عورتوں کے بچوں کو کس طرح بدنام کر سکتا ہوں۔

یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان تمام بچوں کو میرا نام ملے گا۔ یہ تمام بچے ے نام سے پرورش پائیں گے اور یہ تمام کے تمام میری جائیداد اور دولت کے برابر حقدار ہوں گے۔

میں بیرسٹر لیلیٰ محسن اور مسٹر شہاب سے درخواست کرتا ہوں کہ وصیت نامہ ان تین عورتوں کے سامنے پڑھنے کے بعد میرے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور میری اس روداد کو جلا کر خاک کر دیں تاکہ اس بات کا ثبوت نہ رہے کہ میں اپنی زندگی میں بانجھ رہا تھا۔

میں ان عورتوں کو بھی سمجھاتا ہوں کہ اب تک جو غلطی ہو چکی ہے اس پر مٹی ڈالیں اور اپنے بچوں کو میرا نام دے کر میری دولت اور جائیداد پر پرورش پانے کے لئے چھوڑ دیں اور خود کہیں کسی دوسری جگہ شادی کر کے شریفانہ زندگی گزاریں۔

ابھی وصیت نامہ پڑھنا باقی تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا' ہمارے سامنے تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تینوں کے سر پر آنچل تھے۔ تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور تینوں کی آنکھیں شرم سے بھیگی ہوئی تھیں۔

☆======☆======☆

بدست خود

دولت ہمیشہ سے انسان کی کمزوری رہی ہے۔ یہ جتنی بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔

ایک سیدھے سادے نوجوان کا قصہ۔ اس کے لئے دولت مصیبت بن گئی تھی، اپنوں کا خون سفید ہو گیا تھا۔

اس نازک وقت میں اس کی ذہین بیوی نے اس کو اس گرداب سے نکالا۔

انسان جو چاہتا ہے' وہ نہیں پاتا اور جسے نہیں چاہتا' اُسے پالیتا ہے۔ تقدیر ایسے ہی مذاق کیا کرتی ہے جیسے مخلص میاں سے کر رہی تھی۔

مخلص میاں اسم با مسمیٰ تھے۔ شاید اُن کی والدہ کو یقین تھا کہ وہ بڑے ہو کر خلوص کا پیکر ثابت ہوں گے۔ اس لئے اُن کا نام مخلص میاں رکھ دیا تھا۔ اُن کی والدہ مریم بیگم کو ایک دن اچانک یہ اطلاع ملی کہ اُن کی ایک سوکن بھی ہے۔ اُس کا نام بانو بیگم ہے اور بانو بیگم نے مخلص میاں کے مقابلے میں ایک بیٹا پیدا کیا ہے جس کا نام جابر میاں ہے۔ مریم بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ اُنہیں اپنے شوہر پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اپنی محبت اور خدمات کو عبادت کے مقام پر لا کر اپنا تمام خلوص اُن پر نچھاور کرتی تھیں مگر اب اُنہیں پتہ چل گیا تھا کہ اس دنیا میں خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

جب دل پر ایسی چوٹ لگی تو اُنہوں نے سوچا کہ اپنے بیٹے کا نام بدل دیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ مخلص میاں بھی ماں کی طرح خلوص کا پیکر بنیں اور خلوص میں مارے جائیں لیکن مخلص میاں کے والد نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بیگم! یہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تم سے دوسری شادی کی بات چھپائی۔ اگر تم بیٹے کا نام بدل دو گی تو وہ متبادل نام مجھے ہمیشہ اپنی غلطی کا احساس دلاتا اور کچوکے لگاتا رہے گا۔ مخلص میاں اچھا نام ہے۔“

باپ کو یہ نام پسند تھا۔ مریم بیگم اُسے بدل نہ سکیں۔ ویسے دل میں ٹھان لیا کہ بیٹے کو بالکل ہی مخلص یا گاؤدی نہیں بنائیں گی۔ اُسے موجودہ دَور کی کچھ مکاریاں بھی سکھائیں گی لیکن بات وہی تقدیر کے مذاق کی ہے۔ انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ مریم بیگم اپنی سکیم پر عمل کرنے سے پہلے ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مخلص میاں پرورش پانے کے لئے سوتیلی ماں کے سائے میں آ گئے۔ بانو بیگم نے اُنہیں سگی اور اولاد کی طرح کلیجے سے لگا لیا کیونکہ مریم بیگم اپنے حصے کی جائیداد مخلص میاں کے نام لکھ کر گئی تھیں۔ بانو بیگم نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا۔ ”سنتے ہیں جی! یہ دونوں بچے میری دو آنکھیں ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ دونوں میں سے کوئی کبھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو سکے۔“

شوہر نے خوش ہو کر کہا۔ ”بیگم! تمہارے خیالات اور نیک ارادوں سے دوسری سوتیلی ماؤں کو سبق سیکھنا چاہئے۔“

بانو بیگم نے کہا۔ ”ضرور سیکھیں گی مگر جابر میاں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”اے آپ تو بالکل ہی معصوم بن رہے ہیں۔ مخلص میاں دس برس کی عمر میں ہی پانچ لاکھ کی جائیداد کے مالک بن گئے ہیں۔ جب خاندان والے ایسی باتیں کرتے ہیں تو جابر میاں مفلس اور کنگال بچوں کی طرح میری گود میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ دیکھئے میں حاسد نہیں ہوں۔ اللہ .... مخلص میاں کو اور دے مگر میں انصاف چاہتی ہوں۔“

”بیگم! مخلص میاں کو اُن کے نانا کی جائیداد ملی ہے۔ میں نے نہیں دی ہے۔“

”دے تو سکتے ہیں۔ اولاد کا دل رکھ سکتے ہیں۔ کیا جابر میاں آپ کی اولاد نہیں ہیں؟“

”بھئی میرے مرنے کے بعد دونوں ہی جائیداد کے حقدار ہوں گے۔“

”مریں آپ کے دشمن مگر میرے اور آپ کے بعد جائیداد برابر تقسیم ہو گی۔ اُس کے بعد بھی مخلص میاں کو پانچ لاکھ کی برتری حاصل رہے گی۔ میں کسی کی برتری اور کسی کی کمتری نہیں' صرف برابر کا انصاف چاہتی ہوں۔“

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی سے جابر میاں کے نام پانچ لاکھ کی جائیداد لکھ دوں۔“

”ہاں' جب میں سوتیلی ہو کر لاکھوں روپے کی ممتا مخلص میاں کو دے رہی ہوں تو آپ سگے ہو کر جابر میاں کو کچھ نہیں دے سکتے؟“

”دے سکتا ہوں مگر صرف جابر میاں کو دوں گا تو رشتے دار کیا کہیں گے؟“

”انصاف کہیں گے۔“

”نہیں۔ دنیا اِسے تمہارا سوتیلا پن کہے گی۔“

”سرتاج! ماں سوتیلی نہیں ہوتی۔ باپ کی ناانصافیاں بچوں کی ماں کو ایسا سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ ناانصافی نہیں مصلحت ہے۔“

وہ غصے سے باہر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد بانو بیگم اپنی ناکامی پر پیچ و تاب کھاتی رہیں۔ جی میں آیا کہ مخلص میاں کی پٹائی کر کے اپنا غصہ اتاریں مگر وہ اپنے شوہر

تے زیادہ مصلحت اندیش تھیں۔ اپنی نند کو آتے دیکھ کر مخلص میاں کو اپنے پاس بٹھا کر چومنے لگیں۔ نند نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا بات ہے بھابی! بھائی جان بڑے غصہ میں باہر گئے ہیں؟"

"اے غصہ تو اُن کی ناک پر رہتا ہے۔ خواہ مخواہ کا انصاف لے بیٹھے کہ جابر میاں کے نام پانچ لاکھ کی جائیداد لکھیں گے تاکہ دونوں بچے یکساں جائیداد کے مالک رہیں۔"

نند نے کہا۔ "یہ تو واقعی انصاف ہو گا۔"

"کیا خاک انصاف ہو گا' مخلص میاں کو اُن کے نانا کی جائیداد ملی ہے۔ اگر جابر میاں کو اپنے باپ سے ایک پیسہ بھی ملے گا تو مخلص میاں کو.......... بھی ایک پیسہ ملنا چاہئے۔ باپ کی جائیداد پر دونوں بھائیوں کا برابر حق ہے۔"

"آفرین ہے بھابی! آپ جو ممتا اور انصاف مخلص میاں کو دے رہی ہیں' وہ شاید سگی ماں سے بھی نہ ملتا.........."

نند بڑی دیر تک اپنی بھابی کا قصیدہ پڑھتی رہیں' پھر اپنی آٹھ برس کی بچی رضوانہ کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر آ گئیں۔ باہر آتے ہی رضوانہ نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "امی! یہ ممانی جان بہت جھوٹ بولتی ہیں۔ میں چھپ چھپ کر ساری باتیں سنتی رہتی ہوں۔"

رضوانہ کی ماں نے آہستگی سے کہا۔ "چپ رہ لڑکی! اِس گھر میں جو ہوتا ہے ہونے دے۔ میں بیوہ ہوں تُو یتیم ہے۔ اگر بھابی نے تیری باتیں سن لیں تو ہمیں گھر سے نکال دیں گی۔"

رضوانہ مخلص میاں سے دو برس چھوٹی تھی مگر بہت ہی ذہین تھی۔ اُس کا ننھا سا دماغ اُس گھر کی سیاست کو سمجھ تو نہ سکا تھا' البتہ جھوٹ اور سچ کو کسی حد تک سمجھنے لگا تھا۔ اُس کی ماں بیٹی کی ذہانت سے گھبراتی تھی اِس لئے اُسے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

بانو بیگم کو بعد میں احساس ہوا کہ شوہر سے دن کے وقت انصاف نہیں مانگنا چاہئے۔ ایک جھوٹی یا سچی روایت کے مطابق جس طرح سکھوں کا دماغ دن کے بارہ بجے بیکار ہوتا ہے اسی طرح اکثر مردوں کا دماغ رات کو بیڈ روم میں کسی کام کا نہیں رہتا۔

رات کو بستر پر آتے ہی بانو بیگم نے شوہر کی گردن پر تیز چھرے کی طرح اپنی گوری گوری باہیں رکھ دیں۔ "سنئے جی!"

بکرا کتنا ہی تگڑا ہو۔ اپنی مدافعت کے لئے چھرے تلے تڑپتا ہے۔ بالآخر ہار جاتا ہے۔ جب بکر عید کی وہ رات گزر گئی تو بیچارے شوہر نے وکیل کے سامنے کے کاغذ پر جابر

کے نام پانچ لاکھ کی جائیداد لکھ دی۔

☆======☆======☆

مخلص میاں جوانی میں سراپا مخلص بن کر اُبھرے۔ پندرہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بانو بیگم نے مخلص میاں کو شریف' ایماندار اور سعادت مند بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہیں دینی تعلیم دی۔ اپنے بیٹے کو مشنری سکول سے ڈگری کالج تک پہنچایا۔ مخلص میاں کو مسجد کا راستہ دکھایا۔ جابر میاں کو کلبوں کے آداب سکھائے تاکہ تاجروں اور سرمایہ داروں سے دوستانہ مراسم ہوں اور وہ دولت کمانے کے ڈھنگ سیکھتا رہے۔

فی زمانہ یہی سوتیلا پن ہے کہ آدمی کو دین و ایمان کی اُس انتہا تک پہنچا دیا جائے کہ وہ صنعتی دور کی بے ایمانیوں اور لوٹ کھسوٹ کو سمجھنے کے قابل نہ رہے۔ صابر اور شاکر بن کر رہ جائے۔ بانو بیگم نے یہی کیا۔ بس ایک غلطی اُن سے ہو گئی۔ وہ یہ کہ رضوانہ کی شادی مخلص میاں سے کر دی۔

اُنہوں نے اپنے طور پر دانشمندانہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی دولت مند لڑکی بہو بن کر آئے اور مخلص میاں کو ایمان کی دولت سے زیادہ سکہ رائج الوقت کی دولت کے فوائد بتانا شروع کر دے۔ اُن کی معلومات کے مطابق رضوانہ جیسی یتیم لڑکی اُن کے ٹکڑوں پر پلی تھی۔ اُن کی تابعدار تھی۔ آنکھ ملا کر باتیں نہیں کرتی تھی۔ صرف پانچ ہزار دین مہر کے عوض اُسے بہو بنا لیا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی ہاتھ پاؤں نکالتی تو پانچ ہزار دے کر اُس کی چھٹی کرائی جا سکتی تھی۔ کیونکہ مخلص میاں مخلصانہ حد تک سوتیلی ماں کے سعادت مند تھے۔

رضوانہ بچپن ہی سے ذہین تھی۔ اپنی ممانی جان کی ہیرا پھیری کو رفتہ رفتہ سمجھتے ہوئے اُن کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح فرمانبردار گائے کہلانے لگی تھی۔ بھولنے والے بھول جاتے ہیں کہ گائے اپنی مدافعت کے لئے سینگ مار سکتی ہے۔

شادی کی پہلی رات وہ دلہن بنی سہاگ کی سیج پر بیٹھی تھی۔ مخلص میاں دولھا کے روپ میں آئے تو دلہن کے روبرو گھبرائے ہوئے سے تھے۔ وہ بڑی اچھی باتیں کرتے تھے ور انہوں نے موقع محل کے مطابق چند محبت بھرے کلمات بھی یاد کر لئے تھے مگر بند کمرے میں دلہن کے قریب پہنچتے ہی سب کچھ بھول گئے۔ کھڑے رہ کر تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر پلنگ کے کنارے یوں بیٹھے جیسے دلہن نے اعتراض کیا تو فوراً کھڑے ہو جائیں گے۔

ذرا دیر بعد جرأت سے کام لیتے ہوئے بولے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا بولوں؟ اگرچہ دن رات اس گھر میں تم سے باتیں کرتا رہا مگر آج تم کوئی دور کی چیز لگ رہی ہو۔ ہاں یاد آیا۔ امی نے کہا تھا کہ گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے یہ انگوٹھی پہنا دینا۔"

انہوں نے شیروانی کی جیب سے انگوٹھی نکال کر اُسے پہنانے کے لئے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ رضوانہ بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "آپ ممانی جان کے کہنے سے انگوٹھی پہنا رہے ہیں؟"

"آں' ہاں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولے۔

"آپ ممانی جان کے کہنے سے دلہن کا منہ دیکھیں گے؟"

"نہیں۔ میرا اپنا دل بہت چاہتا ہے کہ تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھوں۔ ایمان سے میں آپ کو بچپن سے چاہتا ہوں۔ جوانی میں اور زیادہ چاہنے لگا مگر منہ سے بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ منہ دکھا دیجئے نا؟"

"اُوں ہونہہ۔"

"بھئی انکار کی وجہ؟"

"آپ میرے مجازی خدا بن کر نہیں' ممانی جان کے محکوم بن کر آئے ہیں۔"

"بخدا یہ بات نہیں ہے۔ آج تو ہم آپ کے محکوم ہیں اور آپ حسن کی ملکہ........."

"جھوٹ۔ میں آپ کو محکوم نہیں حاکم بنانا چاہتی ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے' میں تعمیل کروں گی مگر ایک شرط ہے۔"

"جلدی سے فرماؤ۔ تمہارا مکھڑا دیکھنے کے لئے ہمارے اندر پتہ نہیں کیا کیا ہو رہا ہے۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولنے لگی۔ "آج کی رات ہم دونوں کے لئے اہم ہے۔ آج سے میں اپنی آخری سانس تک آپ کے لئے اپنی ہستی مٹانے والی ہوں۔ آج سے رضوانہ نام کی لڑکی صرف آپ کے نام سے پہچانی جائے گی۔ اِس کے بدلے آپ مجھے کیا دیں گے؟ کیا سونے کی صرف ایک انگوٹھی؟"

"آں نہیں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔"

"آپ کا سب کچھ ممانی جان کی تجوری میں بند ہے۔ آج کی رات آپ جھوٹے وعدے نہ کریں۔"

"بھئی امی کے خلاف نہ بولو۔ میں پسند نہیں کرتا۔"

"میں ان کے خلاف نہیں ہوں۔ صرف اپنے لئے انصاف مانگ رہی ہوں۔ کیا بیوی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ کیا میں آپ سے اپنی وفا کے بدلے وفا اور خدمات کے بدلے مستقبل کا تحفظ نہیں مانگ سکتی؟"

"ہاں ضرور مگر ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔"

"یہ سہاگ رات بھی ہے اور حساب کی رات بھی ہے۔ آج حساب نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہو سکے گا۔"

"ہاں۔ اتنا تو میں سمجھتا ہوں کہ آج کی رات ایک خوشگوار مستقبل کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ بولو کیا چاہتی ہو؟"

"صرف ایک وعدہ کہ میں اپنے اور آپ کے مستقبل کے لئے جو معقول بات کہوں ی۔ اس پر آپ عمل کریں گے۔"

مخلص میاں نے انگوٹھی پہناتے ہوئے وعدہ کیا۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے ھونگھٹ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ یوں تو گھونگھٹ کے پیچھے وہی چہرہ تھا جسے وہ بچپن سے یکھتے آ رہے تھے مگر اُبٹن سے نکھارا ہوا چہرہ چاند ہو گیا تھا۔ کاجل کی دھار پر آنکھیں مار ماڑ پر اُتر آئی تھیں۔ ابرو کمان ہو گئے تھے۔ لب ہائے خنداں کی مقناطیسیت کو انہوں نے پہلی بار اتنے قریب سے سمجھا تھا۔ چہرے کی اجلی رنگت پر حیا کے گلاب کھِل رہے ے اور زیورات کا سونا دمک رہا تھا۔ مہندی کی مشرقی خوشبو اور یو ڈی کلون کی مغربی شبو کے خاموش ہنگامے برپا تھے۔ دلہن کو اسی لئے سولہ سنگھار کرایا جاتا ہے کہ وہ سولہ ؛ سے حملے کرے اور دولھا صرف شاعرانہ فقرے ادا کرتا رہ جائے۔

مخلص میاں سحرزدہ ہو کر اُس کے چہرے پر جھک گئے۔ سپاہی کو ہتھیار ڈالنے کے بعد ج کے حضور جھکنا ہی پڑتا ہے۔ تب رضوانہ نے بڑی پیار بھری سرگوشی میں کچھ کہا۔ وہ بڑا کر بولے۔ "آں نن نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رضوانہ خاموشی سے ذرا الگ ہو گئی۔ مخلص میاں کا اضطراب بڑھ گیا۔ ابٹن سے لے ہوئے بدن کے پسینے میں ایسی مسحور کن مہک تھی کہ اُن پر نشے کی سی کیفیت طاری ئی تھی۔ وہ نشہ پھر اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر پھر جھک گئے۔ رضوانہ نے ۔ چٹکی بھر قرار دیا۔ اُس کے بعد بے قرار کرنے والی ادا دکھائی گئی۔ ہوتا یہی ہے' پہلے ہیں نہیں کی گرادن کر رہے تھے پھر دلہن کی نہیں نہیں نے دیوانگی تک پہنچایا تو انہوں تھک ہار کر ہاں کہہ دی۔

بکر عید کی وہ رات گزر گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن ولیمے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رضوانہ اُس روز بھی دلہن کی طرح سجی بنی رہی۔ تیسری صبح ناشتے کی میز پر رضوانہ نے اپنے تمام زیورات اتار کر بانو بیگم کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”ممانی جان! اتنے سارے زیورات میں نہیں پہن سکتی۔ آپ انہیں اپنے سیف میں رکھ لیں۔“

بانو بیگم نے کہا۔ ”اے بیٹی! ابھی تم نئی دلہن ہو۔ رشتے داروں کے ہاں سے ابھی دعوتیں ملیں گی۔ تمہیں یہ پہن کر جانا ہوگا۔“

”جب کہیں جانا ہوگا تو آپ سے مانگ کر پہن لوں گی۔“

بانو بیگم دل میں خوش ہوئیں۔ اُن کے یقین کے مطابق رضوانہ اُس گھر میں کنیز بن کر رہنے والی لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ بولیں۔ ”تمہارے کمرے میں بھی سیف ہے اُس میں رکھ لو۔“

”ممانی جان! زیورات اور روپے پیسے گھر کے بزرگوں کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔ میں آپ کا ہر حکم مان سکتی ہوں مگر اتنی بڑی ذمے داری نہیں سنبھال سکتی۔“

بانو بیگم کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ مخلص میاں سر جھکائے ناشتے سے دو دو ہاتھ کرنے میں مصروف تھے۔ جابر میاں نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امی! ہم رضوانہ کو بچپن سے جانتے ہیں۔ اس بیچاری نے کبھی ایک ہزار روپے کے نوٹ ایک ساتھ نہیں دیکھے۔ یہ تیس ہزار کے زیورات کیسے سنبھال سکے گی۔ آپ ہی اپنے پاس رکھ لیں۔“

بانو بیگم نے اپنی کمر سے چابیوں کا گچھا نکال کر رضوانہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ بیٹی! تم اپنے ہاتھوں سے رکھ دو۔ رکھنے اور پھر نکالنے کی ذمے داری تو سنبھال سکتی ہو نا؟“

اِس مذاق پر سب ہنسنے لگے۔ رضوانہ چابیاں لے کر بانو بیگم کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ وہ لوگ ناشتہ کرنے کے دوران اُس کے گن گانے لگے۔ بانو بیگم نے کہا۔ ”مخلص میاں! میں نے بہت سوچ سمجھ کر رضوانہ کو تمہاری دلہن بنایا ہے۔ وہ بہت ہی سمجھدار اور سعادت مند ہے۔ تمہیں تو عقل سے واسطہ نہیں ہے۔ کم از کم اُس کی باتیں سمجھا کرو اور اُس کا دل رکھنے کے لئے اُس کی باتیں مان جایا کرو۔“

”جی امی!“ وہ سر جھکا کر بولے۔ ”میں آپ کی باتوں پر عمل کروں گا۔“

ناشتے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا۔ جابر میاں نے چونک کر کہا۔ ”امی! یہ

رضوانہ ابھی تک نہیں آئی۔ تجوری کے پاس کیا کر رہی ہے؟“

بانو بیگم ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں۔ تیر کی طرح اپنے بیڈ روم کی طرف گئیں۔ اُن کے پیچھے مخلص میاں اور جابر میاں بھی تھے۔ وہاں رضوانہ آئرن سیف کے سامنے کھڑی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ بانو بیگم نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”تم ابھی تک یہاں کیا کر رہی ہو؟“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”ممانی جان! میں آپ سے پوچھنا بھول گئی تھی کہ یہ تجوری کیسے کھلتی ہے۔ میں اب تک تمام چابیاں آزما چکی ہوں۔“

ان لوگوں نے دیکھا۔ زیورات کی گٹھری تجوری کے پاس رکھی ہوئی تھی اور رضوانہ سچ مچ تجوری کھولنے میں ناکام رہی تھی۔ اپنی دولت کے تحفظ کا یقین ہوتے ہی ان لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ بانو بیگم نے پیار سے ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”پگلی! تم نے کئی بار مجھے تجوری کھولتے دیکھا ہے مگر ہاں شاید تم نے یہ دھیان سے نہیں دیکھا کہ پہلی چابی یوں گھمانے کے بعد اس سیفٹی لاک کو یوں ہٹایا جاتا ہے۔“

وہ عملاً بتانے لگیں۔ ”پھر اس سیفٹی لاک کو ہٹانے کے بعد یہ دوسری چابی گھمائی جاتی ہے۔ یہ‘ یہ دیکھو سیف کھل گیا۔“

واقعی سیف کھل گیا۔ تجوری کے اندر بڑے بڑے خانوں میں ہیرے جڑے ہوئے زیورات‘ نوٹوں کی گڈیاں اور لاکھوں روپے کی دستاویزات نظر آ رہی تھیں۔ رضوانہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”اللہ! اتنی دولت‘ مجھے تو وحشت سی ہوتی ہے‘ میں تو تجوری بھی نہ کھولوں۔“

بانو بیگم نے زیورات کی گٹھری اندر رکھ کر تجوری بند کی‘ پھر چابیوں کے گچھے کو اپنی کمر میں اڑس لیا۔

ڈائننگ روم میں واپس آ کر باجماعت چائے پینے کے دوران رضوانہ نے بانو بیگم سے کہا۔ ”ممانی جان! میری وہ سہیلی نجمہ ہے نا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ اب مجھے تنہا نہیں جانا چاہئے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اِن کے ساتھ.........“

”ہاں ضرور۔ اب تمہیں مخلص میاں کے ساتھ جانا چاہئے۔ ضرور جاؤ۔“

چائے پینے کے بعد وہ مخلص میاں کے ساتھ چلی گئی۔ بانو بیگم نے دوپہر کے کھانے کا انتظار کیا۔ وہ دونوں نہیں آئے۔ جابر میاں نے نجمہ کے گھر ٹیلیفون کیا۔ نجمہ کے والد نے کہا۔ ”وہ دونوں آئے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد چلے گئے۔“

جابر میاں نے ریسیور رکھ کر کہا۔ ”امی! مخلص تو بالکل گدھا ہے۔ یہ رضوانہ اُسے

کہاں لئے پھر رہی ہے؟"

"اپنی دوسری سہیلیوں کے ہاں گئی ہو گی۔"

ماں کی بات سے تسلی ہو گئی۔ جابر میاں اپنی ایک دوست سے ملنے چلے گئے۔ بانو بیگم نے بیٹے کو کلبوں کا راستہ دکھایا تھا۔ وہ اپنے طور پر کامیاب تھیں۔ وہاں بڑے بڑے افسران سے دوستی ہو جایا کرتی تھی اور عمارتی سامان سپلائی کرنے کے بڑے بڑے ٹھیکے مل جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی اونچے گھرانے کی کوئی لڑکی جابر کی دوست بن جاتی تھی۔ بانو بیگم ہر ایسی لڑکی کو دیکھ کر یہ حساب کرنے بیٹھ جاتیں کہ وہ لڑکی اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو بہو بننے کے بعد کتنی دولت اور جائیداد لے کر آئے گی۔"

ابھی تک کسی لڑکی کا "اونٹ منصوبہ" کسی کروٹ نہیں بیٹھا تھا۔ وہ دیر آید درست آید کے مصداق ایک لمبا ہاتھ مارنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ شام کو جابر غصے میں طنطناتا ہوا آ کر بولا۔ "امی! رضوانہ آج دوپہر تک نہیں آئی۔ تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پَر نکال رہی ہے۔"

"کیا ہو گیا؟ تم نے اُسے کہاں اُڑتے دیکھ لیا ہے؟"

"وہ مخلص کو لے کر فلم دیکھنے گئی ہے۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے کیپری سینما میں دیکھا ہے۔"

بانو بیگم حیرانی کی شدت سے آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔ "مخلص میاں اور فلم! ارے وہ لڑکا تو کوئی فلمی رسالہ بھی کبھی نہیں پڑھتا ہے۔"

"میں خود حیران ہوں امی! مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ انگریزی فلم دیکھنے گیا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ انگریزی فلمیں کیسی ہوتی ہیں۔"

بانو بیگم نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے انہیں اپنا مرحوم شوہر دکھائی دیا۔ شوہر کے ساتھ گزارے ہوئے کتنے ہی واقعات فلمی مناظر کی طرح آنے جانے لگے۔ انہیں یاد آیا کہ وہ کس طرح اپنی اداؤں کی "ہاں" اور "نا" کا چارہ پھینک کر شوہر سے اپنی باتیں منواتی تھیں۔ دنیا کی ہر ساس یہ بھول جاتی ہے کہ آنے والی بہو کے پاس بھی وہی روایتی ہتھیار ہوتے ہیں۔

بانو بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے بیٹے سے کہا۔ "مخلص دیوانہ ہو گیا ہے۔ نیا نیا دولھا بنا ہے۔ تم جاؤ میں اُس کی دیوانگی ختم کر دوں گی۔"

یہ درست ہے۔ نئے گھوڑے کی لگام جس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے' وہ اُسی کے اشاروں پر چلتا ہے مگر اشاروں پر چلنے کا کوئی جواز ہونا چاہئے۔ جواز یہ تھا کہ بانو بیگم نے

ود ہی کہا تھا۔ "رضوانہ سمجھدار اور سعادت مند ہے۔ مخلص میاں تمہیں تو عقل سے اسطہ نہیں ہے۔ کم از کم اُس کی باتیں سمجھا کرو اور اُس کا دل رکھنے کے لئے اُس کی تیں مان جایا کرو۔"

بیگم بانو کے حکم کے مطابق مخلص میاں رضوانہ کا دل رکھنے کے لئے اُس کی بات ن کر کیپری سینما کے تاریک ہال میں پہنچ گئے تھے۔ پہلے تو بیچارے نے بہت انکار کیا تھا مگر پلے اور بعد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے وہ سینما ہال کے سامنے سے گزرتے ی نہیں تھے۔ اگر مجبوراً گزرنا پڑتا تو سینما ہال کی پیشانی پر لگی ہوئی نیم عریاں عورتوں کی سویروں سے نظریں چُرا کر نکل جاتے تھے۔ مگر اب ایک بار سینما کا پوسٹر دیکھا تو تصویروں ں ہر عورت رضوانہ نظر آئی۔ بڑے بڑے پوسٹروں میں کسی کی پنڈلیاں ننگی تھیں' کسی ے بلاؤز کا گریبان اتنا کھلا تھا کہ کھلنے کے لئے کچھ باقی نہ رہا تھا۔ کوئی کسی کے سینے سے لگی ئی تھی اور کوئی کسی کے لبوں پر اُتر رہا تھا۔

یہ تمام تصویریں ایسی تھیں کہ سہاگ رات کی تصویریں سامنے آ گئیں۔ رضوانہ ے ایک ایک بچے نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ جب باہر کی تصویریں ایسی تھیں تو اندر ری فلم کیسی ہو گی؟ دماغ نے سمجھایا۔ امی نے رضوانہ کی بات ماننے کا حکم دیا ہے۔ دل نے کہا۔ فلم میں جو بھی عورت ہو گی وہ اُسے رضوانہ سمجھ کر دیکھیں گے۔

جب فلم شروع ہوئی تو طرح طرح کی حسینائیں طرح طرح کے جلوے دکھانے ہیں۔ ہال کی تاریکیوں میں رضوانہ کا جلوہ بجھ گیا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا یں اور کیا نہ دیکھیں۔ اُنہوں نے اب سے پہلے یہ دنیا کیوں نہیں دیکھی تھی؟ اس لئے ہ یہ گناہ تھا۔ رضوانہ سے وابستگی گناہ نہیں تھی لیکن گڑبڑ یہ ہوتی کہ رضوانہ نے اچھی رح کھلانے پلانے کے باوجود بھوک بڑھا دی تھی۔

فلم کے ابھی چند مناظر گزرے تھے کہ ایک منظر میں ہیرو نے ہزاروں تماشائیوں کی جودگی میں ہیروئن کو آغوش میں سمیٹ کر چوم لیا۔ مخلص میاں تھرا گئے۔ اندھیرے میں ر بڑھا کر سہارا لینا چاہا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

وہ کپکپاتے ہوئے بولے۔ "چلو گھر چلیں گے۔"

"فلم تو ختم ہونے دیجئے۔ جلدی کیا ہے؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

رضوانہ نادان بچی نہیں تھی۔ وہ تو اسی لئے اپنے میاں کو وہاں لائی تھی کہ دیوانگی کے سر پر ہر لمحہ یوں ناچتی رہے کہ سوتیلی ماں کا طلسم ٹوٹ جائے اور انہیں ہر سمت

صرف اپنی شریکِ حیات کے جلوے نظر آئیں۔ وہ اندھیرے میں مسکرانے لگی۔ یہ سارے منصوبے اُس نے شادی سے پہلے ہی تیار کر لئے تھے۔ اب ازدواجی زندگی کے تین دنوں میں وہ کتنی ہی کامیابیاں حاصل کر چکی تھی اور کچھ ہی دنوں میں جابر اور بانو بیگم کے سامنے ایک زبردست دھماکہ کرنے والی تھی۔

جب وہ سینما ہال سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آئے تو مخلص میاں رضوانہ سے لگ کر بیٹھ گئے۔ وہ بھول گئے تھے کہ تمام دن بغیر اجازت گھر سے باہر رہنے پر امی ناراض ہوں گی۔ گھر پہنچتے ہی ہنگامے شروع ہونے والے تھے مگر اُن کے دماغ میں صرف ازدواجی ہنگامے بپا تھے۔ جادو کرنے کے لئے منتر پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ عورت اگر ذہانت خلوص اور محبت سے منصوبے بنائے اور اُن پر عمل کرے تو دیر سویر اُس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی بانو بیگم کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”رضوانہ رُک جاؤ۔“

رضوانہ نے سر گھما کر دیکھا۔ بانو بیگم اور جابر ڈرائنگ روم سے آ رہے تھے۔ جابر نے گھور کر پوچھا۔ ”تم مخلص کو کہاں لے کر گئی تھیں؟“

رضوانہ نے جواب دیا۔ ”جابر! تم ہمارے ہم عمر ہو۔ آئندہ ہم سے جرح کے انداز میں سوال نہ کرنا۔“

بانو بیگم کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ جسے وہ گائے سمجھتی تھیں، وہ پہلی بار سینگ دکھا رہی تھی۔ رضوانہ کے ایک ہی جواب سے بغاوت کی بُو آنے لگی تھی۔ لہٰذا وہ فوراً ہی پینترا بدل کر بولیں۔ ”ٹھیک ہے جابر کو نہیں پوچھنا چاہئے، میں پوچھ رہی ہوں۔ تم مخلص میاں کو فلم دکھانے کیوں لے گئی تھیں۔“

”ممانی جان! میں آپ کی کنیز ہوں۔ اگر معقول جواب دوں گی تو کیا آپ انصاف کریں گی؟“

”تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں ناانصافی کرتی آئی ہوں۔ بولو کیا بولتی ہو؟“

رضوانہ نے کہا۔ ”جابر نے ہمیں کیپری سینما میں دیکھا تھا۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے اُن کی گرل فرینڈ کے ساتھ اُنہیں وہاں سے گزرتے نہیں دیکھا ہے۔ اگر ہم میاں بیوی کا فلم دیکھنا جرم ہے تو جابر پرائی لڑکی کے ساتھ کون سا ثواب کما رہے تھے؟“

بانو بیگم تڑخ کر بولیں۔ ”بکواس مت کرو۔ جابر ٹھیکیدار کی لڑکی کے ساتھ تھا۔“

”میں بھی شادی کے بعد مخلص کی ٹھیکیدار بنا دی گئی ہوں۔ یہ زندگی بھر کا ٹھیکہ

ہے۔ آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

بانو بیگم نے اُسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی! تم کس کے بل پر اچانک ہی بولنے لگی ہو اور مخلص میاں! تم چپ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ میں نے بچپن سے تمہیں پال پوس کر جوان کیا ہے۔ کیا میری ممتا کا یہی صلہ ہے؟“

”مم، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟ رضوانہ امی سے معافی مانگ لو۔“

”میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آج تک تم دونوں بیٹوں نے کبھی ایسی گستاخی نہیں کی جیسی یہ کر رہی ہے۔ میں اسے سزا دوں گی۔“

”ممانی جان! آپ بات کو سمجھنے کے بجائے.........“

”خبردار مجھے ممانی جان نہ کہنا۔ میں مخلص میاں کو حکم دیتی ہوں کہ وہ تمہارے کمرے میں نہیں جائیں گے۔“

مخلص میاں ایک دم سے پریشان ہو گئے۔ یہ سزا رضوانہ کو نہیں، انہیں مل رہی تھی۔ رضوانہ نے احتجاج نہیں کیا۔ سوالیہ نظروں سے مسکراتے ہوئے مخلص میاں کو دیکھا۔ پھر ایک ادائے ناز سے گھوم کر اپنی خواب گاہ میں جانے لگی۔ اُس کے جانے کے بعد بانو بیگم نے مخلص میاں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کمینی، میرے معصوم بچے کو بگاڑنا چاہتی ہے۔ اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گی۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”امی! وہ نادان ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں جا کر اُسے سمجھاتا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔ میں کھانا بھیجتی ہوں۔ کھانے کے بعد اُسی کمرے میں سو جانا۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ کھانے سے انکار کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ دل کٹ رہا تھا۔ سینما ہال سے ہی اُن کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دل اور دماغ نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ رضوانہ سے لگے رہیں گے لیکن ماں کے حکم کے خلاف راستہ بدلنے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ دوسرے کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ ٹہلنے کے دوران فلم کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد انہوں نے سوچا۔ بانو بیگم سو گئی ہوں گی چپکے سے حسن کے دربار میں حاضری دینا چاہئے۔ یہ سوچ کر کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ نہ کھلا۔ یہ عقدہ کھلا کہ باہر سے چٹخنی لگا دی گئی ہے۔ انہوں نے دروازے کو دیکھتے ہوئے زندگی میں پہلی بار بانو بیگم کو مکا دکھایا جبکہ وہ مکا دیکھنے کے لئے موجود نہیں تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد رضوانہ نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک ٹرے میں کھانا لے کر آئی تھی۔ اُس کے چہرے سے اور اداؤں سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ مخلص میاں کو دیکھے بغیر کمرے میں داخل ہو کر میز پر کھانے کی ٹرے رکھتی ہوئی بولی۔ ”آیئے! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

مخلص میاں نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”امی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟“

”دیکھا ہو تو میری جوتی سے۔ آپ اُن سے ڈرتے ہیں۔“

مخلص میاں کہنا چاہتے تھے کہ وہ امی کی شان میں ایسی گستاخی نہ کرے لیکن رضوانہ کی قربت سحر پھونک رہی تھی۔ اُس نے شوہر کو رجھانے کے لئے خوشبو نہیں لگائی تھی۔ میک اَپ نہیں کیا تھا۔ ہاں فلمی پوسٹر کی یاد تازہ کرانے کے لئے کھلے گریبان کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔

اُن کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ تھوک نگل کر بولے۔ ”رضو! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

وہ لقمہ چباتی ہوئی بولی۔ ”امی تمہیں لوری دے کر سلا دیں گی۔“

انہوں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”مجھے طعنے نہ دو۔“

”آپ روٹی کھائیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔“

”نہ جاؤ رضو!“

”نہیں، جہاں ہم نے اپنے پیار کی پہلی رات گزاری ہے، میں اُسی کمرے میں مل سکتی ہوں۔“

”رضو! میری خاطر امی سے جھگڑا نہ کرو۔“

”جھگڑا کس نے شروع کیا؟ اُن کا بیٹا غیر لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے اور آپ اپنی بیوی کے ساتھ فلم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آپ کو میرے کمرے میں جانے سے روک دیا گیا اور آپ مجھے الزام دے رہے ہیں کہ میں اُن سے جھگڑا کر رہی ہوں۔“

”میں الزام نہیں دے رہا ہوں۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ میل محبت سے رہو۔“

”بیوی کے ساتھ میل محبت سے رہا جائے تو وہ قدموں میں گر جاتی ہے۔ سوتیلی ماں کے ساتھ میل محبت سے رہا جائے تو وہ قدموں میں گرا لیتی ہے۔ جب بھی یہ بات آپ کی سمجھ میں آئے۔ میرے پاس آ جایئے گا۔“

وہ ناراضگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر مخلص میاں کے روکنے کے باوجود اُس کمرے سے نکل کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ ذرا دور نگاہوں کے سامنے خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رضوانہ نے بتی بجھا دی تھی۔ کیسا دھڑکا دینے والا اشارہ تھا۔ اُس کے بعد دھیمی دھیمی سی نیلی روشنی دکھائی دی۔ وہ دھیمی دھیمی سی روشنی چھپی چھپی آرزوؤں کی طرح ہمک رہی تھی۔ اُس لمحے یہ گیان حاصل ہوا کہ سوتیلی ماں کے قدموں تلے جنت ہو ہی نہیں سکتی۔ جنت کا دروازہ تو سامنے کھلا ہے۔ وہ کشاں کشاں اُدھر بڑھتے چلے گئے۔

دوسرے دن بانو بیگم اور جابر تشویش میں مبتلا تھے۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ مخلص میاں پر رضوانہ کا جادو چل چکا ہے۔ بانو بیگم نے کہا۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ مخلص میاں شادی کے بعد بھی میرے اشاروں پر چلیں گے۔ میں رضوانہ کو چھوڑنے پر کہوں گی تو وہ اُسے فوراً طلاق دے دیں گے مگر اب ایسے آثار نظر نہیں آتے۔“

”امی! پہلے رضوانہ کا طلسم توڑنا ہو گا۔ اگر مخلص کو کسی طرح اُس سے دور کر دیا جائے تب اُس کی عدم موجودگی میں آپ کی باتیں مخلص پر اثر کریں گی۔“

”ہاں۔ مخلص میاں کو رضوانہ کی طرف سے بدظن کرنا ہو گا۔“

جابر نے دل ہی دل میں سوچا۔ مخلص اگر رضوانہ کا دیوانہ ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے شادی سے پہلے عورت کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ میں اُسے کچھ اور حسین نمونے دکھاؤں گا۔ ہو سکتا ہے اُس کی دیوانگی اپنا راستہ بدل دے۔

ناشتے کی میز پر بانو بیگم نے انجان بن کر کہا۔ ”مخلص میاں! مجھے خوشی ہے کہ تم میرے حکم کے مطابق رضوانہ کے کمرے میں نہیں گئے۔ بیٹے! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ اب تم اپنی بیوی سے مل سکتے ہو۔“

مخلص میاں نے بھی انجان بن کر کہا۔ ”شکریہ امی! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“

رضوانہ سر جھکائے ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔ بانو بیگم نے کہا۔ ”مخلص میاں! تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اب تمہیں اپنے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے لئے کھانے کی بھی فکر کرنی چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ موسم گرما کے لئے مشروبات تیار کرنے کا پلانٹ لگائیں۔ تم اور جابر اپنے اپنے حصے کا پانچ لاکھ روپے اس کاروبار میں لگاؤ۔ تم کم محنت کر کے زیادہ منافع کما سکو گے۔“

”جی بہتر ہے امی.........“

"بہتر نہیں ہے۔" رضوانہ نے کہا۔ "آپ کو کاروبار کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے۔"
بانو بیگم غصہ سے بولیں۔ "میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔ تُو مخلص میاں کو بہکا رہی ہے۔"

"نہیں سمجھا رہی ہوں۔ پہلے یہ کسی کاروباری ادارے میں رہ کر تجربات حاصل کریں گے۔ پھر کاروبار کے لئے سوچا جائے گا۔"

بانو بیگم پھر غصے سے کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر جابر نے میز کے نیچے اپنی ماں کے پاؤں میں پاؤں رکھ کر کہا۔ "ٹھیک ہے امی! مخلص کو پہلے تجربہ حاصل کرنا چاہئے۔ میں آج ہی مخلص کو کنسٹرکشن کمپنی کے ایک دفتر میں ایک اسسٹنٹ کی ملازمت دلوا دوں گا۔"

رضوانہ نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ خود چاہتی تھی کہ مخلص میاں گھر سے باہر کی دنیا بھی دیکھیں اور اس دنیا کی اونچ نیچ کو ذاتی تجربات سے سمجھتے رہیں۔ ناشتے کے بعد جابر مخلص میاں کو اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ راستے میں اُس نے کہا۔ "مخلص! ان چار دنوں میں تم ہم سے بالکل ہی اجنبی بن گئے ہو۔ کیا تم پر ہمارا اب کوئی حق نہیں رہا؟"

"کیوں نہیں۔" تم میرے بھائی ہو اور میں امی کا احترام مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔"

"امی نے تمہیں سگی ماں سے زیادہ محبت دی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کے لئے بہتر مشورے دیتی ہیں اور رضوانہ اُن مشوروں کو ٹھکرا دیتی ہے۔ کیا یہ امی کا احترام ہے؟"

مخلص میاں چپ رہے۔ دراصل اُن کی نظریں بھٹک گئی تھیں۔ ایک سینما گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے بڑے سے پوسٹر میں ایک حسین عورت کا سراپا نظر آ گیا تھا۔ وہ رضوانہ کی طرح بڑی جاندار بڑی پُرکشش تھی۔ بھٹکنا اسی کو کہتے ہیں کہ اپنی عورت کے حوالے سے دوسری عورتوں کو تفصیلاً دیکھنے کے لئے نظریں جم جاتی تھیں۔

سینما ہال گزر گیا تو فٹ پاتھ پر گزرنے والی دو ایک لڑکیوں نے اُن کی توجہ کو خاموشی سے پکارا۔ کار آگے نکل گئی۔ لڑکیاں پیچھے رہ گئیں، پھر بھی وہ ہونق کی طرح پلٹ کر دیکھتے رہے۔ ایسی واضح حماقتوں کو کون نہیں سمجھے گا' جابر نے سمجھ لیا۔ مسکرا کر سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک کوٹھی کے سامنے کار روک دی۔ کار سے اترتے ہوئے بولا۔ "میں کنسٹرکشن کمپنی کے مالک سے فون پر ملاقات کا وقت لینا بھول گیا تھا۔ آؤ یہاں سے فون کر لیں۔"

ملازم نے انہیں دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا۔ انہیں کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ جابر مخلص میاں کو وہاں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں ایک موٹی سی

عورت دبلی ہونے کی خاطر پاپ میوزک پر تھرک رہی تھی۔ جابر نے کہا۔ "ممی! ایک نئے رنگروٹ کے لئے فرسٹ کلاس چھوکری چاہئے۔"

وہ بدستور تھرکتی ہوئی بولی۔ "کیسا چھوکری مانگتا؟"

"خوبصورت پُرکشش' بدن ایسا بھرپور ہو کہ لباس سے بغاوت کرتا ہو۔"

"ہمارے پاس میں ایسا چھوکری ڈولی' شازیہ اور شاردا ہے۔" وہ میوزک کی دھن پر پینترے بدلتی ہوئی بولی۔ "شازیہ ایک دم نوا چھوکری ہے۔ اُس کو گھومنے پھرنے کا واسطے لے جانے سے دو سو روپیہ' کچھ گڑبڑ کرنے سے دو ہزار روپیہ۔ تم ڈن کریں گے؟"

"ڈن۔" جابر نے کہا۔ "وہ جو رنگروٹ تمہارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے میرا بھائی ہے۔ بالکل گدھا ہے۔ ابھی کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔ اس لئے میں ابھی پانچ سو دے رہا ہوں۔ لنچ کے بعد شازیہ تمہیں واپس مل جائے گی۔ پلیز تھوڑی دیر کے لئے اپنا یہ ناچ نہ کرو۔ میری پلاننگ سن لو۔"

ممی رقص کرتے کرتے تھم گئی۔

مخلص میاں ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے' دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھ رہے تھے۔ فی زمانہ شیونگ بلیڈ اور مشینوں کے اشتہارات بھی حسین عورتوں کی تصویروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ ایک انگریز لڑکی مختصر کپڑے پہنے ایک موٹر سائیکل کے پاس کھڑی تھی۔ اشتہار کے نیچے لکھا تھا کہ یہ ایک گیلن میں پینتالیس میل چلتی ہے۔ اس کی وضاحت نہیں تھی کہ وہ تحریر موٹر سائیکل کے لئے تھی یا لڑکی کے لئے۔ بہرحال مخلص میاں کی نظریں اُسی انگریز لڑکی پر جم گئی تھیں۔

پھر انہیں یوں لگا جیسے وہ حسینہ پوچھ رہی ہو۔ "آپ کون ہیں جی؟"

وہ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ تصویر کی حسینہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "جی میرا نام مخلص احمد ہے۔"

"میرا نام شازیہ ہے۔"

تب مخلص میاں کو خیال آیا کہ آواز دروازے کی طرف سے آ رہی ہے۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت اور بھرے بھرے بدن کی لڑکی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مخلص میاں اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتے تھے۔ خیال آیا کہ تصویروں کو دیکھنے سے تصویریں اعتراض نہیں کرتیں' ہو سکتا ہے' یہ زندہ تصویر انہیں تھپڑ مار دے۔ لہٰذا نظریں جھکا لیں۔

وہ قریب آ کر بولی۔ "اچھا سمجھ گئی۔ آپ جابر صاحب کے بھائی ہیں۔ وہ اندر ٹیلیفون پر باتیں کر رہے ہیں۔ بیٹھ جایئے۔"

وہ بیٹھ گئے۔ شازیہ اُسی صوفہ پر اُن کے قریب بیٹھ گئی۔ ایک دم سے اُن کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ شازیہ سے صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ اُس کے بدن سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ بولی۔ "میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ نے کسی فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا ہے؟"

"جی نہیں۔" اُن کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"اللہ آپ اتنے خوبرو اور سمارٹ ہیں کہ فلموں کے ہیرو لگتے ہیں۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

"کیا آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ آنکھ اُٹھا کر کیوں نہیں دیکھتے۔"

وہ جھجکتے ہوئے نظریں اُٹھانے لگے۔

"اللہ آپ تو بڑے شرمیلے ہیں۔ کیا آپ اونچی سوسائٹی کے آداب نہیں جانتے؟"

وہ شازیہ کے حسن و شباب کو اتنے قریب دیکھ کر بولنا بھول گئے تھے۔ وہ بولی۔

"بھئی میں نے آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ بھی میری تعریف کریں۔"

"آں......... آ......... آپ بہت اچھی، نیک خاتون ہیں........."

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ "میں خاتون نہیں، لڑکی ہوں، کنواری ہوں۔ اگر میں خوبصورت ہوں تو مجھے خوبصورت کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا؟"

"جی ہاں، جی نہیں۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔ پوسٹر کے جیسی........."

"پوسٹر؟" شازیہ پہلے تو نہ سمجھ سکی۔ پھر اُس نے دیوار پر انگریز لڑکی کی تصویر دیکھی۔ تب سرہلا کر کہا۔ "اچھا تم چھپے رستم ہو۔ تعریف میں اُس تصویر کی مثال دے کر ظاہر کر دیا کہ میرے حسن کو ہوس کی دوربین سے دیکھ رہے ہو۔"

وہ گھبرا کر بولے۔ "مم، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا........."

"گھبراتے کیوں ہو؟ میں بُرا نہیں مان رہی ہوں۔"

"ایں........." مخلص میاں کو یقین نہیں آیا کہ اتنی دور تک تعریف کرنے سے کوئی لڑکی بُرا نہیں مانتی ہے۔

وہ بولی۔ "آدمی کے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر دل چاہتا ہے

تو زبان کو بھی کھل کر چاہت کا اظہار کرنا چاہئے۔"

"آپ بجا فرماتی ہیں۔"

"مجھے یہ تکلف پسند نہیں ہے۔ میں اچھی لگتی ہوں تو تم کہہ کر مخاطب کرو۔"

"تم، تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"اگر ہم ملتے رہیں گے تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔"

"سچ، آپ ملیں گی۔ میرا مطلب ہے تم ملو گی؟"

اتنے میں جابر ڈرائنگ روم میں آ کر کہنے لگا۔ "بھئی مخلص میاں! کنسٹرکشن کمپنی کا مالک بہت مصروف ہے۔ کل ملاقات ہو گی۔ آج چھٹی سمجھو۔"

شازیہ نے کہا۔ "اگر چھٹی ہے تو پھر سمندر کے کنارے چلیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

مخلص میاں نے جھجکتے ہوئے جابر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جابر نے کہا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر شازیہ! ہمارے مخلص میاں اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ نہیں جا سکیں گے۔"

وہ جھینپ کر بولے۔ "آں، جابر یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"پھر ٹھیک ہے، میں ابھی لباس بدل کر آتی ہوں۔"

شازیہ اٹھلاتی بل کھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مخلص میاں نے کہا۔ "جابر! میں صرف تم سے ڈرتا ہوں۔ اگر تم نے امی یا رضوانہ سے کہہ دیا تو........."

"تم گدھے ہو۔ کیا میں پہلے کبھی تمہارا دشمن تھا؟ ارے میں تو چاہتا ہوں کہ تم مرد بنو۔ بیوی کے غلام نہیں۔"

جابر نے جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "اسے جیب میں رکھو۔ اگر شازیہ ریسٹورنٹ میں جائے گی تو بل تمہیں ادا کرنا چاہئے۔ میں تمہارا رازدار ہوں، سمجھے۔ رضوانہ سے جھوٹ کہہ دینا کہ ٹاپ بلڈرز کے دفتر میں بیٹھے رہے تھے۔"

آدمی کی عادتیں بدلتی ہیں تو اُسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح بدلتا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا، جب مخلص میاں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ بانو بیگم سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ شادی کی پہلی رات رضوانہ نے انہیں ایک راز چھپائے رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اُسی رضوانہ نے شباب کا ایسا نشہ چڑھایا کہ وہ نشہ میں بھٹکتے ہوئے شازیہ تک پہنچ گئے۔ اب جابر جھوٹ کہنا سکھا رہا تھا اور شازیہ کے ساتھ ساحل سمندر پر وقت گزارنے کے لئے جھوٹ بولنا لازمی تھا۔

جابر اُن دونوں کو ساحل سمندر کے ایک کاٹیج میں پہنچا کر بولا۔ "تم لوگ دوپہر کا کھانا یہاں ریسٹورنٹ میں کھا لینا۔ میں شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ کچھ کاروباری مصروفیت ہے۔"

وہ اُن سے رخصت ہو کر کاٹیج سے باہر آیا۔ ساحل پر پیشہ ور فوٹوگرافر گھوم رہے تھے۔ جابر نے ایک فوٹوگرافر سے کہا۔ "میں تمہیں دوگنا معاوضہ دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ ایک نوجوان جوڑے کی تصویریں اُن کی لاعلمی میں اتارو۔ وہ دونوں کاٹیج نمبر چالیس میں ہیں۔"

فوٹوگرافر راضی ہو گیا۔ جابر اُسے دو سو روپے پیشگی دے کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ ارادہ تھا کہ گھر سے اپنا ذاتی کیمرہ لائے گا تاکہ کسی قابل اعتراض موقعے پر مخلص میاں اور شازیہ کو کیمرے کی چاردیواری میں قید کر سکے۔ رضوانہ نے جتنی تیزی سے مخلص میاں کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ جابر بھی اُس مٹھی کو کھولنے کے لئے اتنی ہی تیزی دکھا رہا تھا۔

لیکن گھر تک پہنچتے ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ وہاں ڈرائنگ روم میں رضوانہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا وکیل بیٹھا ہوا تھا۔ بانو بیگم اور رضوانہ کے درمیان گرماگرم بحث جاری تھی۔ بانو بیگم نے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی کہا۔ "ادھر آؤ جابر! یہ حرافہ تمہارا گھر برباد کرنے پر تُلی ہے۔"

وکیل نے کہا۔ "خاتون! آپ میرے سامنے میری مؤکلہ کے لئے نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں۔"

جابر نے کہا۔ "امی آپ خاموش رہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟"

وکیل نے کہا۔ "مخلص میاں نے اپنے نانا سے ملنے والی تمام جائیداد میری مؤکلہ رضوانہ بیگم کے نام لکھ دی ہے۔"

"کیا؟" جابر نے آنکھیں پھاڑ کر رضوانہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر سوال کیا۔ "جائیداد کے تمام کاغذات ہمارے پاس ہیں۔ اُن کاغذات کا مکمل حوالہ دیئے بغیر جائیداد رضوانہ کے نام کیسے منتقل ہو سکتی ہے۔"

رضوانہ نے جواب دیا۔ "وہ تمام کاغذات اور ماموں جان مرحوم کا وصیت نامہ میرے پاس ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"سچ بول رہی ہوں۔ کل صبح میں نے اپنے تیس ہزار کے زیوارت اُس تجوری میں

رکھ کر پانچ لاکھ کی دستاویزات اور وصیت نامہ نکال لیا تھا۔ مجھے وصیت نامہ پڑھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا آپ لوگوں کو شبہ ہو گا۔ اس لئے میں نے اہم کاغذات اپنے لباس میں چھپا کر تجوری کو بند کیا۔ پھر اُسے دوبارہ کھولنے کی ناکام کوششیں ظاہر کرنے لگی تھی۔"

بانو بیگم اور جابر اُسے یوں دانت پیس کر دیکھ رہے تھے جیسے کچا چبا جائیں گے۔ پھر جابر نے کہا۔ "تم بہت زیادہ مکاری دکھا رہی ہو۔ میں رپورٹ درج کراؤں گا کہ تم نے ہماری تجوری پر ڈاکہ ڈالا ہے۔"

وہ بولی۔ "اپنے گھر کی تجوری سے اپنے حقوق حاصل کرنا جرم نہیں ہے۔ ویسے میں عدالت تک یہ کیس لڑنے کو تیار ہوں۔"

وکیل نے کہا۔ "میں یہی جواب طلب کرنے آیا ہوں۔ آپ لوگ یہ فیصلہ گھر میں کرنا چاہتے ہیں یا عدالت میں؟"

"عدالت میں۔" بانو بیگم نے چیخ کر کہا۔ "اور فیصلے سے پہلے میں اس لڑکی کو دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گی۔"

جابر نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "امی! آپ غصے میں ہیں اور غصے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ وکیل صاحب! آپ ہمیں دو دن کا موقع دیں۔ اگر اس مہلت کے دوران فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر آپ اسے عدالت تک لے جائیں۔"

وکیل نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ ایک تحریری بیان دے دیں کہ دو دن کی مہلت چاہتے ہیں اور اس دوران میری مؤکلہ کو اس گھر میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

جابر نے ایک کاغذ پر لکھ دیا کہ دو دن کے اندر گھر میں فیصلہ ہو جائے گا اور رضوانہ کو وہاں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ لکھ کر اُس نے اپنے دستخط کر دیئے۔ بانو بیگم دستخط نہیں کرنا چاہتی تھی مگر جابر نے سمجھا بجھا کر اُن کے بھی دستخط لے لئے۔ پھر ماں کے ساتھ اپنے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد کہا۔ "امی! اگر ہم نے ابھی ٹھنڈے دماغ سے کام نہ لیا تو رضوانہ بازی جیت لے گی۔"

"اے اب جیتنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ وہ کمینی وصیت بھی پڑھ چکی ہے کہ مخلص میاں شادی کے بعد اپنے باپ کی آدھی جائیداد اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔"

"اُسے جیتنے دیجئے۔ ہمارے پاس ہارنے کے باوجود ابھی جیتنے کے لئے بہت کچھ ہے۔"

"کچھ نہیں ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس حرافہ کو قتل کر دوں۔"

"نہیں امی! رضوانہ اور مخلص زندہ رہیں گے مگر مُردوں سے بدتر زندگی گزاریں گے۔ میں نے دو دن کی مہلت لی ہے۔ مجھے ذرا تحمل سے سوچنے دیجئے اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھئے۔"

جابر نے اپنی الماری کھولی۔ وہاں سے ایک کیمرہ نکال کر اپنے شانے سے لٹکا لیا۔ اتنے میں بیڈ روم کے ٹیلیفون پر اشارہ موصول ہوا۔ جابر نے ریسیور اٹھایا۔ رضوانہ ڈرائنگ روم سے بول رہی تھی۔ "ہیلو جابر! میں نہیں چاہتی کہ مخلص تمہارے سائے میں کوئی کاروبار سیکھے۔ مجھے بتاؤ' وہ کہاں ہے؟"

"میں خود نہیں چاہتا کہ مخلص جیسے گدھے کی کوئی ذمے داری قبول کروں۔ میں ابھی جا رہا ہوں اور ایک گھنٹے تک اُسے واپس لے آؤں گا۔"

وہ ریسیور رکھ کر باہر چلا گیا۔

☆======☆======☆

مخلص میاں سمندر کے کنارے بڑی دیر تک شازیہ کے ساتھ کبھی ٹہلتے رہے۔ کبھی ریت پر اُس کے قریب بیٹھتے رہے۔ اس دوران شازیہ نے کئی بار اپنی اداؤں سے انہیں آگے بڑھنے اور کم از کم ہاتھ پکڑنے کے مواقع دیئے مگر وہ ساحل کے کھلے ماحول میں جھجکتے رہے۔

شازیہ نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اُس کا گاہک انتہائی شریف آدمی ہے۔ بازاری عورتوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ وہ بھی زندگی کے کسی موڑ پر بُرائی کے خلاف اچھائی کی قدر کرتی ہیں۔ اگر یہ غلط ہے تو قدرت کا انتظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ایمان کے چاروں طرف کانٹے بکھرے ہوں تو کوئی کانٹے چننے والی پیدا ہو جاتی ہے۔ شازیہ کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ مخلص میاں کی سادگی اور شریفانہ بزدلی پر عاشق ہو گئی۔

وہ اُن کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "آؤ کاٹیج میں چلیں۔ تم یہاں دنیا والوں سے ڈر رہے ہو۔"

کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے شازیہ نے مخلص میاں کے حالاتِ زندگی کو کریدنا شروع کیا۔ ابتدا میں اپنی کچھ گھریلو باتیں چھپاتے رہے لیکن کاٹیج کے اندر جب وہ آہستہ آہستہ گلے کا ہار بننے لگی تو وہ آہستہ آہستہ ساری باتیں بتاتے گئے۔ شازیہ اچانک ہی اُن سے الگ ہو کر بولی۔ "مخلص! یہ زمانہ ایسا ہے کہ سب ہی کو ایمان کی عینک لگا کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ اس طرح سب ہی ایماندار نظر آتے ہیں۔ بے ایمان لوگوں کے چہرے چھپ جاتے ہیں۔"

مخلص میاں اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔ "آہ! میرے ابا جان بڑے ہی صاحب ایمان تھے۔ امی بھی اُن کے نقش قدم پر چلتی تھیں۔ اس لئے ہم فاقے کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں جتنے شریف گھرانے ہیں اور جہاں محدود آمدنی ہے' وہاں پیٹ کی یا دوسری ضروریات کی بھوک ضرور ہوتی ہے۔ اُس کے باوجود ابا جان نے کبھی چور آمدنی کا تصور بھی نہیں کیا۔ وہ دوسروں کو بھی اپنی طرح ایماندار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو شریف اور ایماندار سمجھ کر میرا نکاح اُس سے پڑھا دیا۔ وہ مجھے اس شہر میں لے آیا۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ شرابی اور جواری ہے اور حسین لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے۔ پہلے اُس نے سیدھے سادے انداز میں مجھے اپنی لائن پر لگانے کی کوشش کی اور میں اُس سے لڑتی جھگڑتی اور بھاگ جانے کی دھمکیاں دیتی رہی.........."

شازیہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "آہ! ایک رات اُس نے کوکا کولا میں تھوڑی سی شراب ملا کر پلا دی۔ میں عادی نہیں تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی غیر مرد میرے جسم سے کھیلنا چاہتا ہے۔ میرا سر ایسا چکرا رہا تھا کہ میں زیادہ دیر تک خود کو بچا نہیں سکی۔ دوسرے دن میرے دلال شوہر نے پچھلی رات کی شرمناک تصویریں دکھائیں' میں نے روتے ہوئے کہا۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔ مرجاؤں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہارے لئے مرجانا آسان ہے مگر یہ سوچو جب یہ تصویریں تمہارے ابا جان کے پاس پہنچیں گی تو وہاں تمہارے غیرت مند خاندان کے کتنے لوگ خودکشی کریں گے۔ تمہارے باپ نے فاقے کر کے جو نیک نامی حاصل کی ہے وہ بدنامی کے ایک ہی دھماکے سے نیست و نابود ہو جائے گی۔"

"اُس شیطان نے میرے خاندان کی بدنامی کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ میں پھر اُس کی مخالفت نہ کر سکی۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اپنے والدین تک پہنچنے والی بدنامی کو روکنے کے لئے یہ شرمناک زندگی گزاروں گی مگر کبھی اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔ میں اب تک اِس عہد پر عمل کر رہی ہوں۔"

شازیہ یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوئی۔ پھر مخلص میاں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"خدا کے لئے اتنے ایماندار نہ بنو کہ تمہیں جابر اور اپنی سوتیلی ماں کے شیطانی چہرے نظر نہ آئیں۔ تمہاری بیوی ذہین ہے' وہ جو کچھ کر رہی ہے تمہارے حقوق کی سلامتی کے لئے کر رہی ہے مگر تم اپنی نادانی سے اُس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دو گے۔"

"نن......... نہیں......... میں نے تو کوئی نادانی نہیں کی ہے۔"

"کیا یہ نادانی نہیں ہے کہ تم نے اپنی بیوی کی خفیہ جدوجہد کا فسانہ مجھے سنا ڈالا۔ جابر

نے تمہیں اُلو بنانے کے لئے مجھے کرائے پر حاصل کیا ہے۔ اگر میں جابر کو یہ بتا دوں رضوانہ کی راہ میں کیسی رکاوٹیں میں پیدا ہوں گی تم نہیں جانتے۔"

"میں' میں اب جان گیا ہوں' مجھے عقل آ گئی ہے۔"

"عقل آ گئی ہے تو وعدہ کرو۔ بیوی کے سوا کسی لڑکی کو دوست نہیں بناؤ گے۔"

"آں.......... مگر تم بہت اچھی لگتی ہو۔"

"میں تم سے کبھی کبھی ملتی رہوں گی۔"

"مگر یہاں کاٹیج میں الجھن سی ہوتی ہے۔ ہمارا ایک اور بنگلہ ہے۔ وہ بند پڑا رہتا ہے۔ اُس کی چابیاں امی کے پاس رہتی ہیں۔ میں جابر سے کہوں گا تو وہ میری مدد کرے گا۔"

"اُلو بنانے کے لئے مدد کرے گا۔"

"کچھ بھی ہو' میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا کب؟"

"آج ہی رات کے دس بجے تک میں کسی طرح اُس بنگلے میں پہنچ جاؤں گا۔"

اُس نے شازیہ کو بنگلے کا پتہ بتایا۔ اتنے میں جابر وہاں پہنچ گیا۔ دونوں اُسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ جابر نے کہا۔ "گھر چلو' تمہاری بیوی تمہارے لئے تڑپ رہی ہے۔"

وہ تینوں کاٹیج کے پیچھے کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ شہر کی طرف جاتے وقت مخلص میاں نے شرماتے ہوئے جابر سے دل کی بات بتائی۔ بنگلے کی چابیاں حاصل کرنے کے لئے خوشامدیں کرنے لگے۔ جابر غصے میں بھرا بیٹھا تھا مگر غصے کو کچل رہا تھا۔ دوستی سے بگڑے ہوئے کام بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "وہ چابیاں میں تمہیں دے دوں گا مگر تمہیں گھر سے بنگلے تک نہیں پہنچا سکوں گا۔"

مخلص میاں چپ سوچنے لگے۔ شازیہ نے کہا۔ "جابر! مجھے شاپنگ سینٹر کے سامنے اتار دو۔ کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔"

کار رک گئی۔ شازیہ نے اترتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "میں ٹھیک دس بجے پہنچ جاؤں گی۔ خدا حافظ۔"

وہ فٹ پاتھ پر آ گئی۔ کار آگے بڑھ گئی۔ دور نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد شازیہ تیزی سے چلتی ہوئی ٹیلی فون بوتھ کے اندر پہنچی۔ اُس نے مخلص میاں سے گھر کا فون نمبر معلوم کر لیا تھا۔ ذرا سی دیر میں اُس گھر سے رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ شازیہ نے کہا۔ "ہیلو میں رضوانہ بی بی سے ملنا چاہتی ہوں۔

تم کون ہو؟"

"میں ملازم ہوں' ابھی انہیں بلاتا ہوں۔"

ایک منٹ کے اندر ہی رضوانہ کی آواز سنائی دی۔ شازیہ نے کہا۔ "تم مجھے نہیں جانتیں۔ کیا تم ایک اجنبی لڑکی سے ابھی ملنا پسند کرو گی؟"

"میں کسی اجنبی لڑکی سے کیوں ملوں؟"

"تمہارا فائدہ ہے۔ میں تمہیں ایک بہت بڑے نقصان سے بچانا چاہتی ہوں۔ تمہیں تامل نہیں ہونا چاہئے۔ بھرے پُرے ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقات ہو گی۔"

"کون سا ریسٹورنٹ؟"

"تم صبا ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر مین کے سامنے شازیہ کا نام لینا۔ وہ تمہیں میری میز پر پہنچا دے گا۔"

"میں فوراً ہی نہیں آ سکتی۔ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"تمہارا شوہر اب تمہارے پاس پہنچنے ہی والا ہے۔"

"اوہ تو تم میرے شوہر کی مصروفیات سے اس قدر باخبر ہو؟"

"ہاں جتنی خبریں راز کی طرح میرے سینے میں محفوظ ہیں وہ تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہوں۔"

"پھر تو میں تم سے ضرور ملوں گی۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ شازیہ بوتھ سے نکل کر سامنے صبا ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد رضوانہ اُس کی میز کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ شازیہ نے کہا۔ "میرا نام شازیہ ہے۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "میرا نام رضوانہ ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم میرے شوہر کو کیسے جانتی ہو؟"

شازیہ بتانے لگی کہ جابر نے آج اُسے مخلص میاں کے لئے خریدا تھا اور وہ ایک سوسائٹی گرل کی حیثیت سے کم از کم مخلص میاں کو تباہ کرنا نہیں چاہتی ہے۔ شازیہ نے اپنے خاندانی حالات بھی سنائے' جنہیں سن کر رضوانہ بے حد متاثر ہوئی۔ اُس نے احسان مندی سے کہا۔ "تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں اب مخلص کو کبھی تنہا گھر سے نکلنے نہیں دوں گی۔"

شازیہ نے کہا۔ "بے شک یہ احتیاط لازمی ہے لیکن ایک بار مخلص کو کبھی رنگے ہاتھ پکڑ لو۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ آج رات بنگلے میں آئیں۔ میں بھی وہاں آؤں گی۔ ایسے

میں تم وہاں پہنچ کر مجھے بُرا بھلا کہہ دینا۔ مخلص میاں پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ تمہیں دھوکہ دے کر کبھی گناہ کے راستے پر نہیں چل سکیں گے۔"

رضوانہ اس پلاننگ پر غور کرنے لگی۔ شازیہ نے کہا۔ "سب سے اہم بات یہ ہے کہ جابر بھی اس بات کا قائل ہو جائے کہ تم بہت محتاط ہو اور اُن کے ہر منصوبے کے سامنے دیوار بن جاتی ہو۔ دشمنوں کو اسی طرح احساس کمتری میں مبتلا رکھنا چاہئے۔"

وہ دونوں بڑی دیر تک اس موضوع پر بحث کرتی رہیں۔ آخر اسی نتیجے پر پہنچیں کہ جابر اور بانو بیگم کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہئے۔ یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ لوگ اپنے مفادات کی خاطر مخلص میاں کو غلط راہوں پر نہیں ڈال سکیں گے۔ رضوانہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ جابر بھی وہاں آئے گا؟"

"ہاں۔ مجھے پورا یقین ہے۔ میرے نام نہاد شوہر نے مجھے مجبور اور بے بس بنانے کے لئے میری شرمناک تصویریں اتاریں تھیں۔ جابر بھی مخلص کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لئے ایسی ہی کوئی چال چلنے ضرور آئے گا۔"

"ہوں۔" رضوانہ بولی۔ "جابر نے میرے وکیل کو جو تحریری بیان دیا ہے اُس کے مطابق وہ مجھے اور مخلص کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کسی دوسری طرح مخلص کو مجبور کرے گا کہ وہ جائیداد کا بٹوارہ نہ کرائے۔ بہرحال میں ضرور آؤں گی۔"

وہ دونوں متفق ہو کر وہاں سے اُٹھ گئیں۔

اندھیرا ہونے سے پہلے رضوانہ گھر پہنچ گئی۔ مخلص میاں اپنی امی کے کمرے میں بیٹھے اُن کی نصیحتیں سُن رہے تھے۔ رضوانہ کی آمد کی خبر ملی تو اپنی خواب گاہ میں آ کر بولے۔ "رضو! جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہونا چاہئے۔"

رضوانہ نے بستر پر آرام سے لیٹ کر پوچھا۔ "کیوں نہیں ہونا چاہئے؟"

لیٹنے کے انداز میں بڑی دلکشی تھی۔ جی میں آیا کہ فوراً ہی اُس کے قریب پہنچ جائیں۔ پھر خیال آیا دس بجے کے بعد شازیہ ملنے والی ہے۔ اگر وہ اِدھر اُلجھ گئے تو اُدھر نہیں جا سکیں گے۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولے۔ "امی کی زندگی میں بٹوارہ نہیں ہو گا۔ میں نے پانچ لاکھ کی جائیداد تمہارے نام لکھ دی۔ حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"میں خود کبھی ایسا نہ کرتی مگر ممانی جان اور جابر جس طرح آپ کی شرافت اور سادگی سے کھیلتے آ رہے ہیں اُس کے پیش نظر میرا مستقبل مجھے تاریک نظر آ رہا تھا۔ آپ بُرا نہ مانیں۔ مرد کی ذہانت سے عورت کا مستقبل سنورتا ہے۔ آپ کے پاس ذہانت نہیں ہے اس لئے میں آپ کی جائیداد سے اپنا آپ کا اور اپنی ہونے والی اولاد کا تحفظ کر رہی

ہوں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے امی سے وعدہ کیا ہے کہ بٹوارہ نہیں ہو گا۔"

"وعدہ آپ نے کیا ہے۔ میں نے تو نہیں کیا۔ کیا آپ میرے پاس نہیں آئیں گے۔"

وہ منہ پھیر کر بولے۔ "نہیں، میں نے امی سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک تم میرے حکم پر نہیں چلو گی، میں اس کمرے میں نہیں آؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ کمرے سے بھاگ گئے۔ ڈر لگ رہا تھا کہ بیوی کے حسن و جمال کا شکار ہو جائیں گے۔ رضوانہ کے دل پر چوٹ لگی، بے شک مخلص میاں کو دشمن بہکا رہے تھے مگر مخلص میاں کی اپنی ذاتی کمزوری بھی تھی۔ اُس وقت اُن کے دل و دماغ میں شازیہ کا حسن و شباب تازہ بہ تازہ تھا اور بیوی سیکنڈ ہینڈ بن گئی تھی۔ دراصل وہاں جانے کے لئے وہ بیوی کے کمرے سے دور رہنے کا ایک نامعقول جواز پیش کر چکے تھے اور یہ طریقہ بھی جابر نے ہی انہیں سکھایا ہو گا۔

رضوانہ اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئی۔ مخلص میاں سے بولی۔ "میں خالہ جان کے ہاں جا رہی ہوں۔ جب تک آپ مجھے لینے نہیں آئیں گے میں واپس نہیں آؤں گی۔"

بانو بیگم نے کہا۔ "تمہیں شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہئے۔"

وہ بولی۔ "پھر شوہر صاحب کو بھی میرے پاس رہنا چاہئے۔"

مخلص میاں نے سوچا۔ رضوانہ کے پاس رہنے سے شازیہ کے پاس جانے کا چانس نہیں ملے گا۔ وہ جلدی سے بولے۔ "کوئی بات نہیں امی! اسے جانے دیجئے۔"

اُس کی امی اور جابر بھی یہی چاہتے تھے کہ بلا ٹل جائے۔ لہٰذا وہ ٹل گئی۔

☆======☆======☆

وہ بنگلہ شہر کے اس علاقے میں تھا جہاں کروڑ پتی لوگ رہتے تھے۔ ہزاروں گز کے پلاٹ پر کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یعنی وہاں کے لوگ ایک ہی علاقے میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے ہزاروں گز کی دوری پر رہتے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ سب اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔ رضوانہ دس بجے سے کچھ پہلے وہاں پہنچ گئی۔ اُس نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ پھر وقت گزارنے کے لئے بنگلے کے پیچھے چلی گئی۔

ٹھیک دس بجے بنگلے کے ایک کمرے میں روشنی نظر آئی۔ رضوانہ اُس کمرے کی

کھڑکی کے قریب گئی۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں' اتنا تو سمجھ میں آ گیا کہ شازیہ اور مخلص میاں وہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے کے سامنے آئی۔ اُسی وقت شازیہ کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ جیسے مخلص میاں زیادتی پر اتر آئے ہوں۔ رضوانہ دوڑتی ہوئی مخلص میاں کو آوازیں دیتی ہوئی بنگلے کے پچھلے کمرے تک پہنچی۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ پوری طرح دروازہ کھول کر اندر آئی۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک گئی۔

پلنگ پر شازیہ چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ ایک خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ وہ دم توڑ رہی تھی۔ سر گھما کر رضوانہ کو یوں دیکھ رہی تھی' جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ رضوانہ کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اُس کے باوجود وہ اپنی محسنہ کے قریب آئی۔ اُس پر جھک کر بولی۔ "یہ' یہ کس نے کیا ہے؟"

اُسی وقت روشنی کا ایک جھماکہ ہوا۔ کمرے کے دروازے پر کوئی تھا۔ پلٹ کر بھاگ رہا تھا۔ رضوانہ نے چیخ کر کہا۔ "رک جاؤ' مخلص رک جاؤ۔"

شازیہ اٹکتی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ "جا........ جا........ بر........"

اُس نے دم توڑ دیا۔ تب رضوانہ نے سوچا کہ دروازے سے بھاگنے والے نے فلاش لائٹ سے تصویر اتاری ہے۔ مخلص میاں ایسی مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتے یقیناً وہ جابر تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی دوسرے دروازے سے گزر کر کاریڈور میں پہنچی۔ وہاں سے بنگلے کے برآمدے میں آئی۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا' اُس کی پہنچ سے دور نکل گیا تھا۔ چیخنے چلانے سے وہ خود ایک ناکردہ جرم میں ملوث ہو جاتی۔

وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں واپس آئی۔ شازیہ اُس کی ہمدرد اور محسنہ تھی مگر اُس کی لاش ایک مصیبت بن گئی تھی۔ وہ احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اُس کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام نہیں دے سکتی تھی۔ قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی تھی۔ قاتل فلیش لائٹ کے ذریعے خاموش دھمکی دے گیا تھا کہ وہ خود قانون کے شکنجے میں آ سکتی ہے۔

اُس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ دماغ میں کتنی ہی باتیں طوفانی رفتار سے آ رہی تھیں' جا رہی تھیں۔ یہ مخلص کو پھانسنے کے لئے قتل کیا گیا ہے۔ مخلص کو شاید آنے میں دیر ہو گئی اور اُن کی جگہ میں آ کر پھنس گئی' میں کیا کروں؟ بھاگ جاؤں مگر بھاگ کر کہاں جاؤں؟ دشمنوں کی مرادیں بر آئیں گی۔ مجھے مخلص سے دور کر دینے کا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔

اتنے میں باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگتی ہوئی دوسرے دروازے سے

بنگلے کے پیچھے گئی۔ پتہ نہیں کون آیا تھا۔ وہ چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ بنگلے کے پیچھے سے گھوم کر اُس نے ایک دیوار کی آڑ سے دیکھا۔ احاطے کے باہر ایک ٹیکسی واپس جا رہی تھی۔ برآمدے کی روشنی میں مخلص میاں نظر آئے۔ وہ شازیہ سے عشق فرمانے کے لئے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔

رضوانہ اُن کی طرف بھاگتی ہوئی گئی۔ وہ رضوانہ کو پہچانتے ہی ٹھٹک گئے۔ پھر ایک دم سے بدک کر بھاگتے ہوئے کہنے لگے۔ "نہیں نہیں' میں یہاں کسی سے ملنے نہیں آیا' مجھے جابر نے بلایا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ بنگلے میں کون عورت ہے........"

"رک جایئے۔" وہ دھیمی آواز میں چیختی ہوئی اُن کے پیچھے بھاگنے لگی۔ "مخلص! میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ رک جایئے۔ خدا کے لئے میری بات سن لیجئے۔"

آدھی رات ہو رہی تھی۔ راستہ سنسان تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اُس وقت وہاں سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزر رہی تھی۔ مخلص میاں کچھ اس ندامت سے بھاگے جا رہے تھے کہ بیوی کے سامنے اُن کی گناہگاری کا راز کھل گیا ہے۔ وہ شاید آخری سانس تک بھاگتے ہی چلے جاتے مگر ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ بڑی سخت چوٹیں آئیں۔ وہ فوراً ہی اُٹھ نہ سکے۔ سڑک کے کنارے تھوڑی دیر تک اوندھے پڑے رہے۔ رضوانہ اُن کے سرہانے آ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ ہانپتی ہوئی بولی۔ "آپ کو خدا کا واسطہ اب نہ بھاگیں۔ میں اور نہیں دوڑ سکوں گی۔ آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ کبھی تو عقل سے کام لیجئے۔ آخر آپ کس سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں؟"

وہ کراہتے ہوئے اُٹھنے لگے۔ "میں تم سے شرمندہ ہوں۔ رضو! مگر بے قصور ہوں۔ نہیں آج دن کے وقت شازیہ نے شربت میں کیا گھول کر پلا دیا تھا۔ میں ہوش سے بیگانہ ہو کر اِدھر چلا آیا۔ وہ کوئی تعویذ گنڈا کرتی ہے۔"

رضوانہ نے مصلحت کے پیش نظر انہیں ندامت سے بچانے کے لئے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ آپ میرے سوا کسی عورت کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ آپ پر سچ مچ جادو کیا گیا تھا۔ اب وہ نہیں کر سکے گی۔ وہ مر گئی ہے۔"

"ایں مر گئی؟"

"ہاں' یہاں سے اٹھئے۔" اُس نے سہارا دے کر اُٹھایا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ آہستگی سے بولی۔ "جابر نے آپ کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لئے شازیہ کو قتل کر دیا ہے۔"

"ایں' قتل .... نہیں' نہیں۔" وہ خوف سے کانپنے لگے۔ "مجھے پھانسی دلا کر

جابر کو کیا ملے گا؟"

"آپ کے حصے کی جائیداد ملے گی۔ دیکھئے شازیہ باطن میں ایک شریف عورت تھی۔ اُس نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ دس بجے بنگلے میں آنے والے ہیں مگر آپ کے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"راستے میں ٹیکسی خراب ہو گئی تھی۔ دوسری ٹیکسی دیر سے ملی۔" مخلص میاں بولے۔

"اللہ تعالیٰ آپ پر مہربان ہے۔ جابر شازیہ کو قتل کرنے کے بعد اُس لاش کے ساتھ آپ کی تصویر اتارنے کے لئے چھپا ہوا تھا مگر آپ سے پہلے میں پہنچ گئی۔ وہ میری تصویر اُتار کر بھاگ گیا ہے۔"

"میں امی سے شکایت کروں گا۔"

"اللہ توبہ' میں قتل کے الزام میں ملوث ہو رہی ہوں۔ جو لوگ الزام لگانے والے ہیں آپ اُن کے ہی سامنے فریاد کرنا اور انصاف مانگنا چاہتے ہیں۔ آپ کو کب عقل آئے گی۔"

"مجھے عقل ہے۔ تم مجھے بیوقوف کہہ رہی ہو۔ کیا ہم امی کو بزرگ مان کر یہ جھگڑا ختم نہیں کر سکتے۔"

"میں سہاگ رات سے سمجھاتی آ رہی ہوں کہ امی بزرگ بن کر دولت پر قابض ہو گئی ہیں۔ اس دولت پر صرف ہمارا اور ہمارے ہونے والے بچوں کا حق ہے۔"

"رضو! پتہ نہیں عقل مندی کسے کہتے ہیں۔ میری سمجھ کے مطابق عقلمندی وہ تھی کہ میں دولت سے بے نیاز ہو کر سکون سے زندگی گزار رہا تھا۔ تم حوا زادی ہو۔ تم نے شجرِ ممنوعہ کی طرف لا کر مجھے سکون کی جنت سے نکال دیا۔ اولاد اور مستقبل کے حوالے سے دولت کی تقسیم سکھا دی۔ یہ دنیاداری تو ہو سکتی ہے' دانائی نہیں ہو سکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟"

وہ دونوں سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ رضوانہ سر جھکا کر بولی۔ "ہمارے اسلام میں سادھو سنت بن کر گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ اگر دنیا میں رہ کر دنیا سے کنارہ کش ہونا سکھایا جاتا تو میں اولاد اور مستقبل کا حوالہ نہ دیتی۔ ہمارے مذہب میں اپنی ضرورت کے لئے محنت کرنا اور اپنے حقوق کے لئے جہاد کرنا فرض ہے۔ یہ فرض میں نے آپ کو سکھایا لیکن ممانی جان نے آپ کو سکون حاصل کرنے کے لئے دولت سے بے نیاز ہو کر تارک الدنیا بننے کی جو تعلیم دی ہے' ابھی تک اُس کا اثر

آپ کے ذہن میں ہے۔ آپ اپنی شریک حیات کی مصیبتوں کو بھی سمجھنے کے قابل نہ رہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنے دوپٹے کے آنچل کو منہ پر رکھ کر ماتمی آواز کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ مخلص میاں نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ نہیں تو میں بھی رونے لگوں گا۔ دیکھو میں تمہیں قتل کے الزام سے بچا لوں گا۔ چپ ہو جاؤ۔"

اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے بچائیں گے؟"

"میں جابر سے بولوں گا کہ میرے حصے کی جائیداد لے لو' میری رضو کو گرفتار نہ کراؤ۔"

"وہ ماں بیٹے تو یہی چاہتے ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"رضو! میں عقلمند نہ سہی مگر میری بات مان لو۔ مفلسی کی زندگی اچھی ہوتی ہے۔ کوئی شازیہ مجھے تم سے چھیننے نہیں آئے گی۔ کوئی جابر تمہیں مجھ سے چھین کر پھانسی کے تختے تک نہیں پہنچائے گا۔ ہم یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اپنے حقوق کے لئے لڑتی رہوں گی۔"

"تم بہت ضدی ہو' پتہ نہیں ابھی گھر جا کر کیسے ہنگامے برپا کرو گی۔ تم کچھ بھی کرو' جابر تمہیں ضرور گرفتار کرائے گا۔"

"آپ میری صرف ایک بات مان لیں۔ گھر جا کر جابر اور ممانی جان کو یہ نہ بتائیں کہ مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"کیا تم ابھی گھر نہیں جاؤ گی؟"

"نہیں' میں چھپی رہوں گی۔ جابر مجھے بلیک میل کرنے کے لئے کل صبح تک میرا انتظار کرے گا۔ پھر دو چار روز تک مجھے تلاش کرے گا۔ اس وقت تک مجھے اچھی طرح سوچنے سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"مگر جابر جانتا ہے کہ میں بنگلے تک گیا ہوں۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ راستے میں ٹیکسی خراب ہو گئی تھی۔ آپ دوسری ٹیکسی کی تلاش میں تھوڑی دور پیدل گئے۔ چند بدمعاشوں نے آپ کو گھیر کر جیب کی رقم نکال لی۔ پھر آپ کو مار پیٹ کر بھاگ گئے۔ ثبوت کے طور پر آپ کے جسم پر چوٹیں لگی ہیں۔ آپ ابھی گر پڑے تھے نا؟"

"ہاں' بہت چوٹیں آئی ہیں۔ تم کتنی اچھی اچھی تدبیریں سوچ لیتی ہو۔"

"میری تدبیر پر عمل کریں گے نا؟"

"تمہاری سلامتی کے لئے ضرور کروں گا۔"

"آپ کی جیب میں جتنی رقم ہے۔ مجھے دے دیجئے۔"

"آج امی نے پہلی بار مجھے دو ہزار روپے دیئے تھے۔ یہ لو........."

رضوانہ نے وہ روپے اپنے پرس میں رکھ لئے۔ مخلص میاں نے پوچھا۔ "تم کہا جاکر چھپو گی؟"

اُس نے بہانہ کیا۔ "ابھی میں خود نہیں جانتی۔ اگر کچھ عرصے تک میری خبر نہ ملے آپ بظاہر پریشانی دکھائیں۔ مگر دل میں اطمینان رکھیں کہ میں نادان بچی نہیں ہوں۔ انشاء اللہ جہاں بھی ہوں گی' بخیریت رہوں گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک چوراہے تک پہنچ گئے۔ وہاں ٹیکسیاں اور رکشے نظر رہے تھے' رضوانہ نے پانچ روپے دے کر کہا۔

"آپ رکشے میں بیٹھ کر پانچ روپے میں گھر کے قریب پہنچ جائیں گے۔ تھوڑی دور گھر تک پیدل جائیں۔ پھر ممانی جان کو یہ دکھ بھری داستان سنائیں کہ کس طرح بدمعاشوں نے آپ کو لوٹ لیا۔ آپ خالی جیب بنگلے تک نہیں جاسکتے تھے۔ اس لئے پیدل واپس گئے۔"

رضوانہ نے اچھی طرح سمجھا بجھا کر انہیں ایک رکشے میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔ دوسرے رکشے میں وہ کہیں چلی گئی۔

☆======☆======☆

بانو بیگم پریشان تھیں۔ انسان جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں' دونوں ماں بیٹے کا منصوبہ کچھ اور تھا۔ ہو گیا کچھ اور .... جابر رات کے تین بجے گھر واپس آیا۔ بانو بیگم بیٹے کی خیریت کی دعائیں مانگتی ہوئی بار بار دروازے پر آرہی تھیں۔ بیٹے کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو گیا ہے نا؟"

"ہاں۔" وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "سب کچھ ٹھکانے لگا دیا ہے۔ آپ یہ باتیں بھول جائیں۔"

"کیسے بھول جاؤں؟ کیا شازیہ کو وہ ممی اور اُس کا دلال شوہر وغیرہ تلاش نہیں کریں گے؟"

"کریں گے مگر وہ ہماری طرف نہیں آئیں گے۔ کیونکہ میں نے آج رات کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ کسی دوسرے گاہک کا حوالہ دے کر اپنے گھر سے نکلی تھی۔"

وہ بیٹے کی خواب گاہ میں پہنچ کر بولیں۔ "یہ کیا ہو گیا؟ بیٹے تمہیں قتل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر یہ بھید کھل گیا تو یہ ساری دولت اور جائیداد کسی کام نہیں آئے گی۔"

"امی! آپ اپنی زبان بند رکھیں گی اور پریشان ہونا چھوڑ دیں گی تو بھید کبھی نہیں کھلے گا۔ یہ بتائیں رضوانہ واپس آگئی ہے؟"

"نہیں' اُس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں ہے۔"

"مخلص بھی بنگلے میں نہیں آیا؟"

"بیٹا! اس گدھے کو تو چند بدمعاشوں نے پکڑ کر پیٹا اور اس کی جیب سے دو ہزار روپے نکال کر لے گئے۔ وہ خالی جیب بنگلے تک نہیں جا سکتا تھا۔ میرے پاس آکر اپنا دکھڑا سنانے لگا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ رضوانہ سے اس کا سامنا نہیں ہوا ہے اور وہ شازیہ کے قتل کے متعلق کچھ نہیں جانتا ہے۔"

"ہاں وہ بالکل بے خبر ہے۔ میں نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا۔ ہم جسے اپنے اشاروں پر چلانے کے لئے اتنی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں وہ آرام سے سو رہا ہے اور ہم جاگ رہے ہیں۔"

"آپ جاکر سو جایئے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ میں مخلص کو ساتھ لے کر رضوانہ کی سہیلیوں کے ہاں جاؤں گا۔ اسے تلاش کروں گا۔ امی! وہ ہماری توقع سے بہت زیادہ چالاک ثابت ہو رہی ہے۔"

"بیٹے! تم تو ذرا بھی نہیں سوئے۔ ایسے تو تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ جہنم میں جانے دو اس حرام زادی کو۔ تم آرام کرو۔"

وہ بانو بیگم کا ہاتھ تھام کر ان کی خواب گاہ میں لے گیا۔ "میں آرام کروں گا۔ آپ سو جائیں۔"

وہ ان کی خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے اپنی خوابگاہ کے باتھ روم میں آیا۔ وہاں تیز پاور کے بلب کے سامنے فلم نیگیٹو خشک کرنے کے لئے رکھ گیا تھا۔ وہ نیگیٹو سے پرنٹ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ مصروفیت کے دوران اس کا دماغ اس سے پوچھ رہا تھا۔ "اس تصویر سے کیسے بلیک میل کرو گے؟ رضوانہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔ وہ چالاک عورت یقیناً روپوش رہے گی۔"

جابر جھنجلا کر سوچنے لگا۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ مخلص کی شادی ہو۔ کیوں کہ شادی کے بعد بچے ہوں گے۔ تو ابا جان کی وصیت کے مطابق بھی اور قانوناً بھی جائیداد کی تقسیم

لازمی ہو جائے گی۔ مگر رشتے داروں نے امی کو مجبور کر دیا کہ وہ مخلص کی شادی کر دیں۔ پھر ہم نے سوچا۔ رضوانہ جیسی گائے مخلص کے لئے مناسب رہے گی۔ مگر اس اُلو کے پٹھے کی تقدیر ایسی تھی کہ وہ گائے شیرنی بن گئی۔ اس کے بعد میں نے شازیہ پر بھروسہ کیا لیکن جب میں سمندر کے ساحل پر دوبارہ گیا تو شازیہ کاٹیج کے اندر ایک شریف زادی کے روپ میں باتیں کر رہی تھی۔ میرے خلاف مخلص کو بھڑکا رہی تھی۔ تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رات کو بنگلے میں ایک قتل ہو گا۔ دوسرا قاتل کہلائے گا اور قتل کے الزام سے بچنے کے لئے میرے اور امی کے قدموں میں لوٹے گا۔ رضوانہ اپنے سہاگ کی سلامتی کے لئے پانچ لاکھ کی جائیداد واپس کرے گی۔ جائیداد کے بٹوارے سے باز آئے گی۔ پھر مخلص کو قتل کے الزام سے بچانے کے لئے ہم آخری شرط یہ رکھیں گے کہ رضوانہ کبھی بچے پیدا نہ کرے۔ اس خاندان میں صرف میری اولادیں ہوں گی۔ دولت میری نسل کی طرف بڑھے گی۔ ہم مخلص اور رضوانہ کو تمام عمر بٹھا کر کھلائیں گے..........."

وہ پرنٹ تیار کرنے کے بعد اسے دیکھنے لگا۔ تصویر میں رضوانہ شازیہ پر جھکی ہوئی تھی اور شازیہ کے سینے میں پیوست خنجر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ "وہ اُلو کا پٹھا مقدر کا سکندر ہے۔ اس تصویر میں اسے ہونا چاہئے تھا۔ اس کی جگہ رضوانہ آ گئی۔ یعنی پانسہ ہی پلٹ گیا۔ رضوانہ پر وہ دکھ بھاری ہوتا' جب اس کا سہاگ' اس کا مجازی خدا قتل کے الزام میں پھنسنے والا ہوتا۔ وہ مخلص کی خاطر ہمارے قدموں کی خاک بن جاتی۔ مگر اب خود پر آئی ہوئی مصیبت کو تو وہ بڑی مکاری سے جھیل لے گی۔

جابر الجھے ہوئے ذہن سے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس پر تقدیر مہربان ہو اس پر تدبیر کے حملے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اب اس نے دوسری چال چلی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے مخلص میاں کو نیند سے بیدار کیا اور ان کے سامنے تصویریں رکھ کر کہا۔ "ابھی ایک شخص یہ تصویر دے گیا ہے اور یہ دھمکی دے گیا ہے کہ اگر دس لاکھ روپے ادا نہ کئے گئے تو رضوانہ کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا جائے گا۔"

مخلص میاں پہلے ہی رضوانہ کی زبانی تصویر اور بلیک میلنگ کے متعلق سن چکے تھے۔ یہ سمجھ گئے تھے کہ جابر یہ چال چل رہا ہے۔ مگر وہ تو بچپن سے امن پسندی سیکھتے آئے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے سوچا کہ رضوانہ تو ضدی ہے۔ اپنے لئے مصیبت بڑھا رہی ہے۔ اگر وہ دس لاکھ کے عوض جھگڑا ختم کر سکتے ہیں۔ رضوانہ کو واپس بلا سکتے ہیں تو پھر اُسے واپس آنا چاہئے۔ پچھلی رات تنہا بستر پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ شازیہ بھی

نہیں ملی تھی۔ بیوی بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی اور آج رات سے پہلے اسے بلا کر بستر کے کانٹے چنے جا سکتے ہیں۔

وہ اتنی بڑی رقم ادا کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔ جابر نے کہا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ بعد میں لوگ باتیں بنائیں۔ ہمیں الزام دیں کہ ہم نے دس لاکھ ہضم کر لئے۔ تم اپنے طور پر پکے کاغذ پر یہ لکھ دو کہ تم نے ایک کاروبار کرنے کے لئے امی سے یہ رقم حاصل کی ہے۔"

اتنے میں ملازم نے آ کر جابر سے کہا۔ "صاحب! کوئی لڑکی آپ کو فون پر پوچھ رہی ہے۔"

جابر اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر بولا۔ "ہیلو' میں جابر ہوں۔"

"میں رضوانہ ہوں۔"

جابر کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے مخلص میاں کو پھر اس کے پنجے سے چھڑانے کے لئے وہ آ گئی ہو۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ تم مجھے بلیک میل کر سکو گے؟"

"کیا تم مجھے بلیک میلر سمجھ رہی ہو۔ میں تم لوگوں کی بھلائی کے لئے اور اپنے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لئے خود کسی بلیک میلر کا شکار ہو رہا ہوں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اس بلیک میلر نے تمہاری ایک تصویر بھیجی ہے اور بہت بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہے۔"

"سب بکواس ہے۔ کسی کی جان سے کھیلنے کا معقول جواز ہونا چاہئے۔ مجھ پر الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا۔"

"بلیک میلر کے پاس تمہارے خلاف معقول جواز وہ تصویریں ہیں' جو ساحل سمندر پر مخلص اور شازیہ کی اتاری گئی تھیں۔ تم نے اس عورت کو اپنے شوہر کے راستے سے ہٹانے کے لئے قتل کر دیا۔"

"شکریہ! میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ تم کس نکتے کو اہمیت دے رہے ہو۔"

یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ جابر ہیلو' ہیلو پکارتا ہی رہ گیا۔ پھر وہ پریشان ہو کر ریسیور رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "وہ اس نکتے کو سمجھنے کے بعد کیا کرے گی؟ وہ کون سی چال چلنے والی ہے' یہ تو معلوم ہونا چاہئے۔"

وہ جھنجلا گیا۔ رضوانہ نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ بلیک میلر بن کر اسے کو دہلا دینے والی دھمکیاں دے سکتا۔ اس نے یکلخت ریسیور رکھ کر اُسے جھنجلاہٹ

میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

رضوانہ نے اپنی روپوشی کے ذریعے جابر اور بانو بیگم کو الجھا تو دیا تھا۔ مگر خود بھی پریشان ہو رہی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ لوگ مخلص میاں کو بے وقوف بنا کر اس کے حصے کی جائیداد آہستہ آہستہ حاصل کرتے جائیں گے۔

اس نے اپنے وکیل کے ہاں پناہ لی تھی۔ وکیل احمد علی نے اُسے بیٹی بنا کر رکھا تھا اور اس کی دل جوئی کرتا رہتا تھا۔ اس نے دوسرے دن بتایا تھا کہ اخبارات میں شازیہ کے قتل کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ تیسرے دن اخبارات نے بتایا کہ سی بیچ کے قریب ایک نوجوان عورت کی لاش پائی گئی ہے۔ پانچویں دن شازیہ کا نام اور اس کی مختصر ہسٹری شائع ہو گئی۔ پولیس قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔

وکیل احمد علی نے کہا۔ "بیٹی! جابر اور بانو بیگم تمہیں نقصان بھی پہنچانا چاہتے ہیں اور اپنے خاندان کے وقار کو بحال رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ اسی لئے شازیہ کی لاش اس بنگلے سے دور لے جا کر پھینک دی گئی۔ وہ لوگ تمہارے حوالے سے بھی عدالت تک جانا نہیں چاہتے۔ ہاں اگر تم اسی طرح سرکشی دکھاتی رہیں اور انہیں مخلص میاں کے حصے کی دولت نہ ملی تو شاید وہ تمہاری تصویر پولیس والوں تک پہنچا دیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ ان کے سامنے اپنا شوہر اپنا مستقبل سب کچھ ہار جاؤں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیا مشورہ دوں۔ یہ دولت کے پجاریوں کا دور ہے۔ پتہ نہیں' اس دور میں شریف لوگ کیسے جی رہے ہیں؟"

رضوانہ سوچنے لگی۔ "لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں عورت ہو کر ان کے فولادی ارادوں کو کاٹتی رہی۔ مگر انہیں بالکل ہی کاٹ کر پھینک دینے کے لئے مجھے کسی فولادی مدد گار کا سہارا لینا پڑے گا لیکن کون میری مدد کرے گا۔ میرے آس پاس تو سب ہی مطلب کے بندے ہیں.........."

سوچنے کے دوران اچانک اسے شیرو دادا کی یاد آئی۔ وہ اس کے والد کا ایک بچپن کا ساتھی تھا۔ اس کے والد شریفانہ زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔ شیرو دادا ابھی زندہ تھا اور اپنے مرحوم دوست کی بیٹی کو پہچان سکتا تھا۔

رات کی تاریکی پھیلتے ہی رضوانہ شیرو دادا کے گھر پہنچ گئی۔ وہ تقریباً دس بارہ سال کے بعد اس گھر میں آئی تھی۔ شیرو دادا اپنی بیٹھک میں اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھا

شراب پی رہا تھا۔ ایک نوجوان حسین عورت کو اس نے گھور کر دیکھا۔ "کون ہو تم؟"

"میں آپ کے مرحوم دوست کی بیٹی رضوانہ ہوں۔ آپ کو باپ کی جگہ سمجھ کر آئی ہوں۔"

دادا نے شراب کی بوتل اور گلاس میز کے نیچے رکھ دیئے۔ اپنے حواریوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر بولا۔ "آئندہ پچھلے دروازے سے آیا کرنا۔ تمہاری چچی اپنے میکے گئی ہے۔ تم ایک مدت کے بعد آئی ہو۔ بتاؤ میں اپنے دوست کی روح کو کیسے خوش کروں؟"

رضوانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "انکل! میں دشمنوں میں گھر گئی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ کون بدنصیب لوگ ہیں؟"

رضوانہ شروع سے اپنا دکھڑا سنانے لگی۔

اس داستان گوئی کے دوسرے دن جابر اپنے معمول کے مطابق اپنی ماں سے رخصت ہو کر باہر گیا لیکن معمول کے مطابق لنچ کے لئے واپس نہیں آیا۔ بانو بیگم بیٹے کے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہیں۔ شام کو اس کا فون آیا وہ سہمی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔

"امی! ذرا حوصلہ رکھ کر میری بات سنئے۔ مجھے چند نامعلوم لوگوں نے یہاں قید کر دیا ہے۔ اگر آپ چیخ پکار کریں گی یا پولیس والوں کو اطلاع دیں گی تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔"

بانو بیگم کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹنے والا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریسیور کو تھام کر بولیں۔ "بیٹے! یہ .... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"امی! آپ یقین نہیں کریں گی تو میری لاش آپ کو ملے گی۔"

"نن نہیں' ایسا نہ کہو .... یہ' کون لوگ تمہاری جان کے دشمن بن گئے ہیں؟ کیا رضوانہ؟"

"پتہ نہیں امی! یہ کیا چکر ہے۔ اگر اس عورت کا ہاتھ ہوتا تو اس کے مفاد کی باتیں کی جاتیں۔ مجھے قید کرنے والے میرے آس پاس موجود ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ آپ پہلے گھر کے ملازم کو آج چھٹی دے دیں۔ اس کے بعد آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ ریکس سینما میں فلم دیکھنے چلی جائیں۔ وہاں آپ کی نگرانی کی جائے گی۔ تاکہ آپ وہاں سے پوری فلم دیکھ کر واپس آئیں۔"

"یہ کیا مذاق ہے بیٹے! تمہاری جان پر بنی ہے اور میں فلم دیکھنے جاؤں؟"

"امی! میری جان اسی صورت میں بچ سکتی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ گھر

سے نکلتے وقت دروازوں کو مقفل نہ کریں۔ تجوری بھی کھلی رہنی چاہئے۔ گھر کی کوئی چیز آپ کے ساتھ باہر نہ جائے حتیٰ کہ پرس بھی آپ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فلم دیکھنے کے لئے صرف سو روپے کا نوٹ گھر سے لے جا سکتی ہیں۔ امی ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ بڑی اذیتیں دی ہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اس پر فوراً عمل کریں۔ نہیں تو یہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"میرے بچے! میں ابھی عمل کرتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، فلم دیکھنے کے بعد تم مجھے مل جاؤ گے نا؟"

"ہاں۔ ان کے حکم کی تعمیل ہوتی رہے گی تو یہ لوگ مجھے آزاد کر دیں گے۔"

اتنا کہنے کے بعد ریسیور رکھ دیا گیا۔ بانو بیگم کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ پورا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار دولت مٹی کا ڈھیر معلوم ہوئی۔ صرف اولاد کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔ وہ قاتل تھا، کوئی اُسے قتل کر دے، یہ گوارہ نہ تھا۔ اپنے لہو کا درد سبھی کو ہوتا ہے۔ بانو بیگم کو بھی ہو رہا تھا۔

انہوں نے فوراً ملازم کو بلا کر چھٹی دے دی۔ اس بدحواسی میں بھی دماغ میں دولت کا یہ حساب تھا کہ انہوں نے حال ہی میں نقد رقم اور زیورات بینک میں منتقل کر دیئے تھے۔ تھوڑی سی رقم اور چند ہزار کے زیورات تجوری میں تھے۔ وہ اپنے بچے کے صدقے میں چھوڑے جا سکتے تھے۔ انہوں نے مخلص میاں کو بلا کر کہا۔ "جاؤ، جوتے پہن کر آؤ، ہم فلم دیکھنے جائیں گے۔"

وہ حیران ہو کر بولے۔ "فلم، آپ کے ساتھ.........!"

"بحث مت کرو۔ جو کہتی ہوں وہ کرو۔"

وہ بھاگ کر جوتے پہننے چلے گئے۔ بانو بیگم کے دل نے کہا۔ "آہ! کاش وہ لوگ اس گدھے کو مارنے کے لئے پکڑ کر لے جاتے۔ اس کے لئے کون رونے والا ہے۔ میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔"

ایسے عبرتناک موقع پر بھی وہ اپنے بیٹے کے مقابلے میں پرائے بیٹے کی زندگی کو ہیچ سمجھ رہی تھیں۔ دماغ میں یہ حساب کتاب موجود تھا کہ جابر زندہ سلامت واپس آ جائے گا تو وہ تجوری کی تھوڑی بہت رقم کا ہرجانہ مخلص میاں کی دولت سے وصول کر لیں گی۔

اچانک انہیں خیال آیا کہ جابر کے کمرے میں وہ تصویریں ہیں، جن کے ذریعے آئندہ مخلص میاں اور رضوانہ کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اوپری منزل کی طرف جانے لگیں۔ مگر فوراً ہی نیچے آنا پڑا۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ انہوں نے جلدی سے ریسیور

اٹھا کر ہیلو کیا۔ دوسری طرف سے جابر نے کہا۔ "امی! ابھی تک کوٹھی سے باہر نہیں آئیں، یہ لوگ صرف دو منٹ کا وقت دے رہے ہیں۔ اُس کے بعد مجھے مار ڈالیں گے۔"

"میں جا رہی ہوں۔ بیٹے میں جا رہی ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر مخلص میاں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کوٹھی سے باہر نکل گئیں۔ باہر آ کر رکنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بیٹے کی جان بچانے کے لئے سوتیلے بیٹے کے ساتھ فلم دیکھنا ضروری تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ریکس سینما کی طرف چلی گئیں۔

آدھے گھنٹے بعد رضوانہ اس کوٹھی میں داخل ہوئی۔ پہلے اس نے تجوری کھول کر دیکھی۔ وہاں کی نقدی اور زیورات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جابر کے کمرے میں جا کر تلاشی لینے لگی۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے بعد باتھ روم کے کیبنٹ میں مطلوبہ تصویریں اور نیگٹو مل گئے۔ اس نے وہاں ماچس کی تیلی سلگا کر انہیں جلا ڈالا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آ کر فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔ "انکل! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میں نے تمام نیگٹو اور تصویریں جلا ڈالی ہیں۔ میں آج بہت خوش ہوں انکل! بہت خوش ہوں۔"

شیرو دادا کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی! اب واپس آ جاؤ۔ دو ایک دن بعد واپس اس گھر میں جانا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے اس بڑھاپے میں بدمعاشی چھوڑ دی ہے۔ ایک دوسرے بدمعاش کے ذریعے یہ کام کرایا ہے۔ تمہارا کام ہو چکا۔ اب وہ بدمعاش بانو بیگم سے اپنا محنتانہ وصول کرے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں وکیل انکل کے پاس واپس جا رہی ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر باہر چلی گئی۔

بانو بیگم کو جبراً پوری فلم دیکھنے کے لئے سینما ہال کی تاریکی میں بیٹھے رہنا پڑا۔ دل میں دہشت تھی کہ بدمعاشوں کے حکم کے خلاف کوئی کام ہو گیا تو وہ جابر کو مار ڈالیں گے۔ سینما ہال سے واپسی میں ان کا خیال تھا کہ گھر پہنچتے ہی بیٹے کی صورت نظر آئے گی لیکن جس طرح وہ گھر خالی چھوڑ کر گئی تھیں اسی طرح خالی پایا۔ تجوری کی نقدی اور زیورات غائب تھے۔ وہ جابر کے کمرے میں گئیں۔ باتھ روم کے کیبنٹ کو کھول کر دیکھا۔ تصویریں اور نیگٹو بھی نہیں تھے۔ تب سمجھ میں آ گیا کہ رضوانہ بدمعاشوں سے مل کر انہیں نیچا دکھا رہی ہے۔

اس وقت انہیں غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ بیٹے کی واپسی اہم تھی۔ غصے اور جھنجھلاہٹ دکھانے سے دشمن کو اور مزہ آتا ہے اور وہ رضوانہ کے لئے اس تماشے کو مزیدار نہیں

بنانا چاہتی تھیں۔ مخلص میاں نے کہا۔ "امی! بھوک لگ رہی ہے۔"

"بھوک لگی ہے تو کیا مجھے کھاؤ گے۔ وہ حرامزادی ہمیں کھا تو رہی ہے۔ جاؤ کچن میں جا کر کھا لو۔"

"میں آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"میری بھوک مر چکی ہے۔ میرا دل مر چکا ہے۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ جابر کہاں ہے؟ اتنی رات ہو گئی وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟ تم کیسے بھائی ہو؟"

اس کا جواب سننے سے پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے بھاگ کر ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو کون ہے ہیلو............"

"کیا تم بانو بیگم ہو؟"

"ہاں تم کون ہو' میرا بچہ کہاں ہے؟"

"بڑھیا! ہوش میں رہ کر باتیں کرو۔ پہلے معلوم کرو کہ کس سے باتیں کر رہی ہو۔ بغیر سمجھے بوجھے بیٹے کو پوچھو گی تو یہ بات دوسروں کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ ویسے تم بہت مکار ہو۔ گھر سے نکلنے سے پہلے تم نے بڑی رقم کہیں چھپا دی۔ صرف دس پندرہ ہزار روپے کے زیورات تجوری میں چھوڑ گئیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح تمہارا بیٹا تمہیں واپس مل جائے گا؟"

"مم .... میں نے کوئی رقم نہیں چھپائی' تمہیں کتنا چاہئے بولو' میں دوں گی۔ میرا بیٹا............"

دوسری طرف سے ڈانٹ کر کہا گیا۔ "بار بار بیٹے کا ذکر نہ کرو۔ مجھے ایک لاکھ روپیہ چاہئے۔"

"ایک لاکھ؟" بانو بیگم کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ تھوک نگلتی ہوئی بولیں۔ "دوں گی' ضرور دوں گی مگر اتنی بڑی رقم گھر میں نہیں ہے کل صبح بینک سے حاصل کروں گی۔"

"تو پھر کل صبح بات کریں گے۔ تم بینک سے پورے ایک لاکھ نکال کر تیار رکھنا۔"

"تم جو کہو گے' کروں گی۔ مگر میرے بیٹے سے بات کرا دو۔"

"نہیں' تمہاری مکاریوں نے ہمیں سمجھا دیا ہے کہ تم اشاروں میں بیٹے سے ایسے معاملات طے کر لو گی جن سے ہمیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فون پر زیادہ نہ بولو۔ کل دن کے گیارہ بجے فون کروں گا۔"

اتنا کہنے کے بعد ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔ بانو بیگم کا دل ڈوبنے لگا۔ بیٹے کی واپسی کل تک کے لئے ٹل گئی تھی۔ کتنی بار احمقانہ خیال پیدا ہوا کہ چپ چاپ پولیس والوں سے

رابطہ قائم کرے مگر یہ خیال ہی رہا۔ وہ یہ دیکھ چکی تھیں کہ بلیک میل کرنے والا گھر سے سینما گھر تک اس کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ اگر انہوں نے ذرا بھی چالاکی دکھائی تو بیٹا جان سے جائے گا۔

وہ ساری رات جاگتی رہیں۔ کبھی ٹہلنے لگتی تھیں' کبھی بیٹھ جاتی تھیں۔ مخلص میاں اپنا پیٹ بھرنے کے بعد سو گئے تھے۔ ہماری آج کی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو لالچ اور مصیبتوں کو اپنے گھر کا پتہ نہیں بتاتے۔ دوسروں کو اپنی خوشیاں تک دے دیتے ہیں۔ دوسروں سے کچھ مانگتے تک نہیں۔ آرام سے کھانے کے وقت کھاتے ہیں اور سونے کے وقت سو جاتے ہیں۔

بانو بیگم کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر جھلا رہی تھیں کہ مخلص میاں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ رضوانہ بھی چین کی نیند سو رہی ہو گی۔ ان دونوں پر جوابی حملہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ رات بھر سوچنے سے کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی تدبیر دماغ میں آ ہی جاتی ہے۔ ان کے دماغ میں بات آئی کہ جب بیٹا واپس مل جائے گا تو وہ بھی رضوانہ کو ایک سبق سکھانے کے لئے مخلص میاں کو اغوا کرائیں گی۔

بہرحال صبح ہو گئی۔ وہ بینک جانے کے لئے تیار ہوئیں۔ مخلص میاں نے معصومیت سے ناشتہ کرنے کے لئے کہا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئیں' کل سے فاقے کر رہی تھیں۔ ساری رات کی جاگی ہوئی تھیں۔ ایسے میں پاگل پن کا دورہ پڑ رہا تھا۔ انہوں نے مخلص میاں کی پٹائی کر دی۔ "نکل جاؤ گھر سے' ذلیل کمینے کل سے کھا رہے ہو' سو رہے ہو' نکل جاؤ یہاں سے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم باہر دھوپ میں بھٹکتے رہو۔"

وہ اسے دھکے دے کر باہر نکالنے لگی۔ ایسے وقت خیال آیا کہ مخلص میاں کو سچ مچ آج گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ پتہ نہیں وہ بلیک میلر یا اس کا کوئی آدمی کب رقم لینے آئے۔ یہ ادائیگی مخلص میاں کے سامنے ہو گی تو وہ اپنی سبکی محسوس کریں گی۔

یہ سوچ کر انہوں نے کہا۔ "نہ تم کمانے کی فکر کرتے ہو اور نہ غیرت سے سوچتے ہو کہ بیوی جانے کس کی گود میں پڑی ہو گی۔ جاؤ رضوانہ کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ جب تک وہ نہ ملے تم بھی واپس نہ آنا............"

وہ بیچارے فرمانبردار تھے۔ ماں کے حکم پر بیوی کو ڈھونڈنے نکل گئے۔

☆======☆======☆

شام کو شیرو دادا اپنے گھر سے نکلا۔ ٹھیک سات بجے اُسے بانو بیگم سے ایک لاکھ

روپے ملنے والے تھے۔ شیرو دادا نے یہ بات رضوانہ کو نہیں بتائی تھی۔ جسے بیٹی کہا تھا اسے یہی کہہ سکتا تھا کہ اس نے بدمعاشی چھوڑ دی ہے۔ بدمعاش صرف اپنے گھر اور اپنے رشتوں کو چھوڑ کر باقی سارے زمانے کے لئے بدمعاش ہوتا ہے۔ دادا کا ضمیر مطمئن تھا کہ اپنی بیٹی کا کام کر چکا ہے۔ اب اپنا کام نمٹانا تھا۔

گھر سے نکلتے ہی پولیس کے دو آدمی پہنچ گئے۔ تھانے سے بلاوا آیا تھا' اسے مجبور سپاہیوں کے ساتھ جانا پڑا۔ اس نے اپنے حواریوں سے کہہ دیا تھا کہ سات بجے اسے مطلوبہ رقم مل جائے گی۔ وہ آٹھ بجے تک فون پر اطلاع دے گا کہ جابر کو رہا کر دیا جائے۔ چونکہ بڑھیا بہت مکار ہے۔ دادا کو پھانسنے کے لئے جال بھی بچھا سکتی ہے لہٰذا آٹھ بجے تک دادا کی کوئی خبر نہ ملے تو جابر کو ختم کر دیا جائے۔

جب وہ تھانے پہنچا تو تھانیدار نے کہا۔ "پچھلے دنوں بینک میں جو ڈکیتی ہوئی تھی اس بینک کا دربان ایک ڈاکو کو چہرہ دیکھ کر پہچان سکتا ہے۔ تمہارے جیسے بدنام لوگوں کو اسی سلسلہ میں یہاں بلایا گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد شناختی پریڈ ہو گی۔ وہ دربان اصل ڈاکو کو پہچانے گا۔"

شیرو دادا کا اس ڈکیتی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اُسے اطمینان تھا۔ مگر یہ بے چینی پیدا ہو گئی کہ پولیس والوں کا ایک گھنٹے کا کام ایک دن اور ایک سال میں پورا نہیں ہوتا۔ اگر دیر ہو گئی تو رقم ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے تھانیدار سے کہا۔ "جناب! ایک گھنٹے بعد شناختی پریڈ ہو گی۔ آپ مجھے آدھے گھنٹے کی چھٹی دے دیں' میں ابھی واپس آ جاؤں گا۔"

تھانیدار نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیوں یہاں سے جا کر اپنے خلاف کسی ثبوت کو ختم کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ گھر میں میری بیوی بیمار........"

وہ گرج کر بولا۔ "بکواس مت کرو۔ جاؤ حوالات میں جا کر بیٹھو۔"

دو سپاہیوں نے اسے وہاں سے لے جا کر آہنی دروازے کے پیچھے قید کر دیا۔

دوسری طرف سے مخلص میاں صبح سے شہر میں بھٹک رہے تھے۔ شام تک اپنے تمام رشتے داروں کے ہاں جا کر دیکھ لیا۔ رضوانہ کہیں نظر نہیں آئی۔ ان کا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔ ویسے بانو بیگم بھی یہ سوچ نہیں سکتی تھیں کہ اس کے وکیل نے اُسے بیٹی بنا کر اپنے ہاں پناہ دی ہو گی۔

وہ بے چارے اپنی بیوی کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

واپس گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ امی پٹائی کریں گی۔ وہ ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جو سر شام ہی ویران ہو جاتا تھا۔ چور اٹھائی گیرے کسی موٹی آسامی کی تاک میں رہتے تھے۔ ایسے ہی اٹھائی گیروں نے مخلص میاں کو گھیر لیا۔ ان سے کہا۔ "جیب میں جتنی رقم ہے نکال دو۔"

مخلص میاں نے ایک بار رضوانہ کے کہنے پر جھوٹ کہا تھا کہ بدمعاشوں نے انہیں مار پیٹ کر ان کی جیب سے دو ہزار روپے نکال لئے ہیں۔ اب وہ جھوٹ سچ ہو رہا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی جیب سے بائیس سو روپے آٹھ آنے نکال کر ایک اٹھائی گیرے کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

"ابے بڑی رقم چھپاتا ہے؟" ایک نے ان کی پیٹھ پر زور کی دھپ لگائی۔ مار سے گھبرا کر اچانک ہی بھاگنے لگے۔ یہ بھول گئے کہ چور پولیس والوں سے بھی آگے بھاگتے ہیں۔ وہ تھوڑی دور جا کر پھر ان کے گھیرے میں آ گئے۔ چاروں طرف سے ان پر ہاتھوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ لوگ مارنے کے دوران ان کی تلاشی بھی لے رہے تھے۔ ایک نے جھلا کر کہا۔ "یہ سالا جھوٹ موٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کے پاس تو اب کچھ نہیں ہے۔"

جھلانے والے نے ان کے منہ پر ایک گھونسہ مارا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کچرے کے ڈرم سے ٹکرائے۔ اپنا توازن نہ سنبھال سکے۔ وہاں سے الٹ کر ڈرم کے اندر پہنچ گئے۔ چوروں کو اب ان سے کیا لینا تھا۔ وہ لوگ وہاں سے بھاگتے چلے گئے۔

☆======☆======☆

فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ بانو بیگم نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو' ہیلو' میں جابر کی ماں ہوں۔"

"مکار بڑھیا۔" دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "نو بجنے والے ہیں۔ ہمیں ایک لاکھ روپے نہیں ملے۔ تیرا بیٹا بھی تجھے نہیں ملے گا۔"

وہ چیخ کر بولیں۔ "نہیں' میں نے رقم پہنچا دی ہے۔"

اب جابر کی آواز سنائی دی۔ "امی! آپ نے چالاکی دکھا کر بہت برا کیا' جو رقم لینے گیا تھا آپ نے اسے حوالات میں پہنچا دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

کسی دوسرے نے کہا۔ "چالاک لومڑی! میں خود اسے دور سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ حوالات میں ہے۔ ہم کچھ پوچھنے کے لئے تھانے جائیں گے تو ہمیں بھی اندر کر دیا جائے

گا۔ لے اب اپنے بیٹے کے لئے چلنے والی گولی کی آواز سن۔"

جابر کی آواز سنائی دی۔ وہ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اسی وقت ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ بانو بیگم چیخنے لگیں۔ ایک ہاتھ سے اپنا سینہ کوٹنے لگیں۔ فون پر جابر کو پکارنے لگیں۔ مگر فون پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ریسیور ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور اپنے کپڑے پھاڑنے لگیں۔ پھر جنونی انداز میں دوڑتی ہوئی سامنے کی دیوار سے اپنا سر ٹکرا دیا۔ ایک بار دو بار ٹکرانے کے بعد سر چکرایا تو وہ کرسی پر گر پڑیں۔ سر سے بہتا ہوا لہو چہرے پر پھیل رہا تھا۔ ان کے دیدے پھیل گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا سے کیا ہو گیا؟

انہوں نے بلیک میلر کی ہدایت کے مطابق ایک لاکھ روپے کے نوٹوں کا بنڈل بنا کر اخباری کاغذ میں لپیٹ کر مقرر کی ہوئی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ پھر وہاں سے چلی آئی تھیں۔ سخت تاکید کی گئی تھی کہ جہاں رقم پہنچائی جائے گی وہاں وہ کہیں چھپ کر کسی کو تاڑنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ اسی لئے وہ فوراً گھر واپس آگئی تھیں۔

اتنے میں مخلص میاں کی آواز سنائی دی۔ "امی! امی! آپ کہاں ہیں؟ آپ نے کہا تھا کہ میں کمانے کی فکر نہیں کرتا ہوں۔ یہ دیکھئے روپے ہی روپے ہیں۔ پتہ نہیں کتنے ہیں۔"

بانو بیگم کے پھیلے ہوئے دیدے اور پھیل گئے۔ مخلص میاں اخباری کاغذ کا بنڈل کھول کر بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں اپنی ماں کے قدموں میں ڈال رہے تھے۔

بانو بیگم نے وحشت اور جنون سے چیخنا چاہا مگر یکلخت ہی دل کی دھڑکن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

☆====== ختم شد ======☆